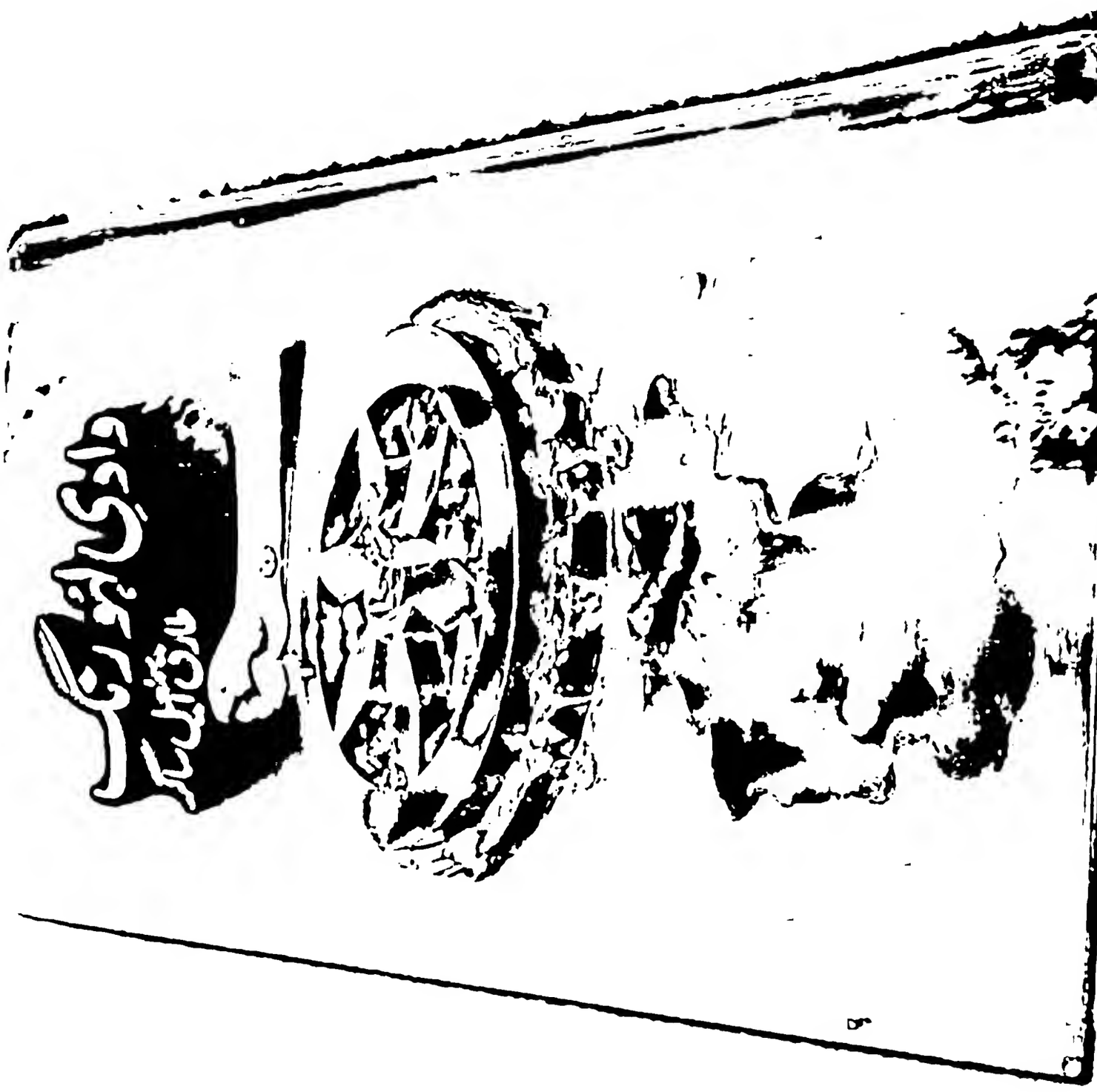

ترتیب

دیباچہ	9
خفیہ مشن	11
ماضی کے جھروکوں سے	19
پہلا معرکہ	29
شیرو	39
زہراں	53
سجاول خان	85
یلغار	101
موت کی شاہراہ	115
تجدید عہد	153
سلگتی آہیں	181
لہو کا چراغ	195
شہادت کی منزل	239
انجانی منزل کا مسافر	279
شیرو ڈکیت	315
اللہ کا سپاہی	337
جب دشمن نے للکارا	345
آپریشن نیپال	351
آخری حصار	357

پیش لفظ

"وادی نور ریگ" کی حکایت خونچکاں کو بے نقاب کرنے کے لیے——
میں نے جب بھی قلم سنبھالا——!
ضمیر نے دست سوال بن کر شیشہ دل پر ایسی ضرب لگائی کہ میں لرز کر رہ گیا——!
ذہن سلگتے ہوئے سوالات کی آماجگاہ بن جاتا—— کوئی نادیدہ طاقت مجھ سے پوچھتی تھی——!
——کیا تم اپنے آئینہ دل میں کشمیر کے مکمل خدوخال دیکھ سکتے ہو؟
——تمہاری فگار انگلیوں میں اتنی سکت ہے کہ کشمیر کے سینے میں سلگتی کہانیاں صفحہ قرطاس پر بکھیر سکو؟
——اس کے درختوں کی ہریالیوں میں سرسراتی ہواؤں کے نوحے تمہاری سماعت کے اختیار میں ہیں؟ اور کیا تم
——مقتلوں اور نارساؤں کی آہوں اور آنسوؤں کو یکجا کر کے اپنے لیے نشان منزل تلاش کر لو گے؟
ان سوالات کے جوابات کھوجنے کے لیے جب بھی میں تاریخ کا سینہ ٹٹولتا۔ یہاں مجھے مصلحتوں اور وسوسوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔
میں ہار کر قلم رکھ دیتا——!
لیکن میری فطرت میں چھپا سپاہی مجھے کسی پل چین نہ لینے دیتا۔
وقت کی لہروں پر ہلکورے لیتا میرا ذہن تیرہ صدیاں پیچھے لوٹتا اور مجھے اٹلانٹک کے ساحلوں پر لے جاتا—— جہاں حضرت عقبہ بن نافع کا لشکر رکتا ہے—— اور وہ

انقلاب کی سرخی سوہنوں کو ہوا میں اچھال کر کہتے ہیں:

"یورپ کہہ کی تھا
اگر میرے راستے میں یہ سرخی سوہنیں نہ آجاتیں تو خدا کی وحدانیت کا پرچم میں
یورپ کے میدانوں میں لہرا کر دم لیتا۔"

طارق بن زیاد کے وہ سوار پہلے تھے جن کا امیر لشکر اپنے جہاز جلا کر اسپین کو اپنے گھوڑوں کے سموں سے روندتا ہوا فرانس کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا——!

میرے ذہنی افق پر خیرالدین بارباروسہ کا عزم کوندنے لگا جس نے سمندروں کی طغیانیوں کو زیر کر کے یورپ اور افریقہ کے ساحلوں کو کھنگال ڈالا تھا۔

اور آخر تاریخ کا سرغنہ کرتا میرا تخیل مجھے اس برصغیر میں گھسیٹ لاتا جہاں محمد بن قاسم نے ایک مسلمان زادی کی پکار کا مول چکایا تھا——!

اور جہاں سلطان محمود غزنوی پہاڑوں سے نکل کر سومنات کے غرور کو روندتا ہوا ہندوستان کے کلیجے میں اتر گیا تھا——!

ان سرپھرے لوگوں کے سامنے "ہر ہر مہادیو" اور "بجرنگ بلی" کے نعرے دم توڑتے دکھائی دیتے تھے——!

"ڈولی لو رنگ" وہی کہانی ہے۔
اپنے خون جگر سے لکھی یہ کہانی اس لیے آپ تک لے آیا ہوں کہ اب بھی اس خاکستر میں کچھ چنگاریاں سلگتی دکھائی پڑتی ہیں——!
اللہ! کوئی بھڑکتی ہوئی چنگاری شعلے کا روپ دھار لے اور ان آنکھوں کو شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو—— کی تعبیر دیکھنے کو مل جائے۔

طارق اسمٰعیل ساگر

۲۰ ستمبر ۸۴

خفیہ مشن

پندرہ مئی ۱۹۶۵ء کی ایک شام:

جیپ انہوں نے گاؤں سے تقریباً ایک فرلانگ دور ہی روک دی تھی۔

——سورج کا آخری کونہ ان کے مشرق میں بھی اس سرکنڈے کے درختوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا جو ایک طرح اس گاؤں کی حد بھی تھی—— انہوں نے دس میل کچا راستہ طے کیا تھا۔ کیپٹن ہیڈکوارٹر سے ان کی روانگی اتنی اچانک تھی کہ صوبے دار حکم داد پکا کر رہ گیا تھا۔ کیپٹن صاحب بغیر اطلاع اچانک آئے اور انہوں نے کوئی تمہید باندھے بغیر اسے جیپ تیار کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

انہوں نے ڈرائیور کو بھی ساتھ لینا مناسب نہ سمجھا اور اس وقت تو صوبے دار حکم داد حیران ہی رہ گیا جب کیپٹن نے اسے سول کپڑے پہننے کے لیے کہا۔

"ہم لوگ آرمی کی جیپ بھی استعمال نہیں کریں گے۔" انہوں نے کمرے کے باہر کھڑے کھڑے کہا اور قبل اس کے کہ صوبے دار حکم داد ان سے سوالات کا سلسلہ شروع کرے، وہ اندر داخل ہو گئے تھے۔

صوبے دار نے رینجرز کی جیپ کسی نہ کسی طرح حاصل کر لی تھی۔ اب یہاں وہ پرائیویٹ جیپ حاصل کرنے سے تو رہا۔ احتیاطاً اس نے ٹینکی پوری بھروالی تھی کیونکہ ابھی تک اسے اگلی منزل کا علم نہیں تھا۔

صوبے دار حکم داد پچھلے دو سال سے اسی سرحدی علاقے میں مختلف مقامات پر انٹیلی جنس ڈیوٹی کر رہا تھا۔ وہ ایف۔ آئی۔ یو سے وابستہ تھا اور اس علاقے کے چپے چپے پر اس کی نظر تھی۔ یہاں کے مقامی بدمعاش، اسمگلر، چور، خطرناک اور بے ضرر ہر طرح کے لوگوں سے اسے آگہی تھی—— اس کی سروس کا زیادہ تر حصہ انٹیلی جنس ڈیوٹی ہی کی نذر ہوا تھا۔ صوبے دار حکم داد کی جہاندیدہ نظروں نے پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے پیش آنے والی تبدیلیوں کا بغور جائزہ لیا تھا اور اس کے تجربے نے اسے بتا دیا تھا کہ اب کچھ کر گزرنے کا

وقت آگیا ہے۔ اگلی چند دنوں کے دورے سے واپس آیا تو کینٹ ہیڈ کوارٹر میں ایک پیغام
تن تاج جب "ہیڈ کوارٹر سے اس کی خصوصی پوسٹ کے ایک افسر انعام مشن پر
اس کا منتظر تھا۔۔۔ جنرل ہیڈ کوارٹرز سے اس کی طلبی کا مطلب کیا ہے۔ یہ اچانک
آ رہے ہیں۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ اچانک
ی۔ایچ۔کیو دنوں کو کیا سوجھی؟ اشد ضرورت بھی کوئی پیشگی اطلاع اسے نہیں ملی تھی اور ہر
کیپٹن صاحب ی۔ایچ۔کیو سے آنے والے "وہ بھی بیحد کم پراسرار ثابت نہیں ہوئے تھے۔ اگر ان
کا شناختی کارڈ ان کے پاس نہ ہوتا تو صوبے دار حکم داد شاید انہیں گرفتار کر لیتا۔۔۔ ان کی
قد بیحد ایسی ہی تھی۔

☆○☆

جیپ کے اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے وہ خاصا چوکس ان کی آمد کا منتظر تھا۔ اس کی
تو ہی زندگی کیپٹنوں اور میجروں سے ملتے ملاتے ہی گزری تھی، لیکن اس چھریرے بدن کے
سانولے رنگ والے نوجوان کیپٹن میں اسے کوئی ایسی بات ضرور دکھائی دی تھی جس کی
وضاحت وہ کر نہ پایا۔ جب بھی اس نے ذہن پر زور دیا وہاں سے ایک ہی جواب ملا: "بے
کوئی خاص بات اس شخص میں!" اور بس۔

"خدا جانے یہ مجھے اندھیرے میں رکھ کر کہاں لے جائیں گے؟" اس نے سوچا۔

کیپٹن اسے جیپ ہی میں انتظار کرنے کا کہہ کر وائرلیس روم میں جا گھسے۔ انتظار کی
اوقت سے بچنے کے لیے اس نے کئی بار چاہا کہ سگریٹ سلگا لے، لیکن ہر دفعہ اس کا ہاتھ
جیب کے نزدیک پہنچ کر واپس آ جاتا۔ حالانکہ وہ سول کپڑوں میں تھا اور یوں بھی اس کے
فرائض کی نوعیت ایسی تھی کہ اگر وہ اپنے افسر کے سامنے سگریٹ سلگا بھی لیتا تو کوئی ایسی
معیوب بات نہ ہوتی، لیکن نہ جانے کیوں وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہ کر سکا۔ اس وقت بھی
جب وہ بمشکل اپنا ہاتھ جیب کے اندر لے گیا تھا، اچانک اس کی نظر سامنے دروازے پر پڑی
جہاں سے کیپٹن صاحب ایک اور کیپٹن کے ساتھ گپ شپ کرتے برآمد ہوئے تھے۔ بجلی کی
سی پھرتی سے اس کا ہاتھ واپس اپنی جگہ پر آ گیا اور وہ چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔

"کتنی دیر سے اس علاقے میں ہو؟" کیپٹن نے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہی اس
اوردانی کا سٹیئرنگ دے دیا۔

"سر! پچھلے دو سال سے اسی علاقے کے گرداگرد گھوم پھر رہا ہوں۔" اس نے اپنی آواز
اتنی اونچی پر سکون بنائے رکھی۔

"ہوں!" ایک لمبی "ہوں" کیپٹن کے منہ سے خارج ہوئی۔ "ہم لورکوٹ کی طرف جا
رہے ہیں۔ مجھے شیرو سے ملنا ہے۔" انہوں نے دونوں باتیں ایک ساتھ ہی کہہ ڈالیں۔

"شیرو سے؟" صوبے دار کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔۔۔ وہ لورکوٹ اور شیرو کے نام
پر یوں بدکا تھا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔

"کیوں کیا بات ہے؟" اس کی اس حرکت کو کیپٹن صاحب نے نوٹ کیا تھا۔

"وہ تو سر....." وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر بے چین ہو اٹھا۔

"کیا ہے وہ؟" کیپٹن نے پہلی مرتبہ اس کی طرف گردن گھما کر دیکھا تھا۔

"وہ ہمارے کام کا آدمی نہیں ہے جناب۔" بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

"وہ ہمارے کام کا آدمی نہیں ہے جناب۔" بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

"وٹ نانسنس! تو آپ نے ملاقات سے پہلے فیصلہ بھی کر لیا۔" کیپٹن کے لہجے میں چھپے طنز
کو صوبے دار حکم داد محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔

"جناب والا! میں نے دو تین مرتبہ کوشش کی کہ اسے کسی بھی طرح راہ راست پر
لاؤں، لیکن وہ نرمی یا سختی کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتا
ہے جناب۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہم اسے آج تک رنگے ہاتھوں پکڑ نہیں سکے۔ بڑی
مشکل سے پچھلے مہینے ہم نے خصوصی ناکے لگا کر اس کا مال پکڑ لیا جو وہ جنوں سے ہانک کر لا
رہا تھا۔۔۔ دو چار سونی سنگڑی گائیں، لیکن وہ۔۔۔ ہر بار کی طرح نکل گیا۔"

صوبے دار بولتا بولتا خود ہی چپ ہو گیا۔ اس نے دیکھا۔۔۔ کیپٹن اس کی باتوں پر کان
ہی نہیں دھر رہے۔ وہ تو جیپ کی ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں غرق
ہیں۔

"آج کل راستوں کی کیا پوزیشن ہے؟" انہوں نے اچانک بالکل الگ سی بات پوچھ لی۔

"دھلتے چاند کی راتیں ہیں جناب۔ اس کے باوجود کسی ایجنٹ نے پچھلے دس پندرہ دنوں
سے اس طرف سے "لانچ" کرنے کی ہمت نہیں کی۔"

"کیوں؟" کیپٹن نے بظاہر حیرت سے پوچھا۔

"کیا عرض کروں سر! یہ تو بہت اچھا علاقہ تھا۔ ہمارے لوگ اس طرف سے تالیاں بجاتے
ہوئے سرحد عبور کر جاتے تھے، لیکن برسات کی وجہ سے دوسری طرف چونکہ نالے اور
ندیاں طغیانی پر ہیں، اس لیے تمام موشی چور کمبخت اس طرف آن مرے ہیں۔ شیرو ہی کو
لیجیے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ کبھی بھول کر بھی اس طرف کا رخ

کس کا جہاز ہے وہ پہچانتی ہی نہیں تو جب امریکہ تک کی بات سے اختلاف ہی کیا ہو سکتا ہے۔

"ہاں ہے تو خوبصورت۔"

"لیکن کیا یہ خوبصورتی کسی کے کام آ سکتی ہے؟ کیا فائدہ ایسی خوبصورتی کا جو کسی کے کام نہ آ سکے۔"

"ہم کو یہ فوقیت دینی چاہئے یا نہیں؟" کپتان صاحب نے ہی یہ سوال کیا تھا۔

"جنگ ہو رہی ہے۔ ہمیں اپنی فوقیت ثابت کرنی ہے۔" صوبے دار نے کہا۔ "ہم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ سکتے۔"

"لیکن ہم یہ فوقیت کیسے ثابت کریں گے؟" کپتان صاحب نے بحث کو آگے بڑھایا۔ "ہم کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے مقابلے پر کون سا جہاز ہے۔ ہم کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے مقابلے پر کتنے جہاز ہیں۔ ہم کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے مقابلے پر کتنے آدمی ہیں۔ ہم کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے مقابلے پر کتنی توپیں ہیں۔ ہم کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے مقابلے پر کتنی بندوقیں ہیں۔ ہم کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے مقابلے پر کتنی گولیاں ہیں۔ ہم کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے مقابلے پر کتنی توپیں ہیں۔ ہم کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے مقابلے پر کتنی بندوقیں ہیں۔ ہم کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے مقابلے پر کتنی گولیاں ہیں۔"

☆○☆

ذرا دیر کے بعد کپتان صاحب نے یہاں یہاں میں اس سے اس علاقے کے بچے بچے سے حقیقی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ مختلف راستے، رہنما اور انڈین بارڈر سیکورٹی فورس کے ٹھکانوں کی پوزیشن، سرحد کے آر پار چوکیاں کرنے والوں کے راستے اور سرحد کے دو مختلف حصوں پر حمل و حرکت کے لیے مختلف تھے۔ لیکن اصلی جنس کی خوش قسمتی کی وجہ سے ابھی تک ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے تھے۔

اصل میں صوبے دار تم دو کی کارگزاری ہی تھی کہ اس نے ایسے کتنے راستے ابھی تک چھپا کے رکھے تھے۔ وہ حقیقت تو چاہتا تھا کہ جن راستوں سے ہزاروں پیشہ افراد کا آنا جانا شروع ہو جائے ان سے کسی ایک کو سرحد پار کروانا کتنا خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

صوبے دار صاحب کی گاڑی کھڑی کر کے جب وہ لوگ نیچے اترے تو کپتان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ "جتنی ضرورت آج اس ملک کو شیرو جیسے بہادروں کی ہے اتنی آج سے پہلے شاید کبھی نہیں تھی۔" کپتان کے لہجے نے صوبے دار کو حیران کر دیا۔

یہ بڑی بات تھی جو اس کی سمجھ میں آ گئی۔

☆○☆

[illegible] سے نیچے اتر گئی تھی۔ [illegible] سے ہٹ کر [illegible] کی طرف چل دیئے۔

کپتان کی حس بھی [illegible] سے ہی تھی۔ [illegible] اس کے [illegible] سے کندھوں کی طرف [illegible] اور اسی میں اس کی [illegible] سے [illegible] ہو رہی تھیں۔ [illegible] کندھوں نے آپ ہی آپ [illegible] "شیرو" میں [illegible] سے [illegible] نے اس کی بات سنی۔ "شیرو" کا لفظ [illegible] اس نے [illegible] کو [illegible] کر دیا۔

ایک عجیب اضطراب سا [illegible] نے [illegible] کی [illegible] بند کر کے بھاگ رہا تھا۔ [illegible] سے [illegible] نے [illegible] کے [illegible] بظاہر ان سب سے الگ تھلگ اور بیگانہ نظر آ رہا تھا۔ یہ شیرو تھا۔

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا صاحب کہ [illegible] پر [illegible] ہے۔ جیسے لوگ ہیں یہ۔ میرے باپ کو [illegible] نے [illegible] وہ اپنی [illegible] کی [illegible] میں [illegible] کرتا تھا لیکن اس روز ——" اس نوجوان نے [illegible] کرتے اپنی [illegible] "شباب" میں چھپا لیا۔

"کتنے آدمی تھے وہ؟" شیرو نے اس کی بات پر [illegible] سے اپنے [illegible] "مریض" (جیسا کہ اس نے [illegible] کی طرف دیکھا۔

"دو ہی نظر آئے تھے مجھے صاحب۔"

شیرو کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی رہ گئی تھیں۔ مریض کو اس کی آنکھیں اپنے بہت میں دھنستی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا تھا۔

"تو نے پہچانا کسی کو؟" شیرو نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر تھوڑا سکون لیا تو اسے کچھ سکون نصیب ہوا۔

"ایک تو وہی سیکورٹی والا صوبے دار ہے صاحب جو پرسوں آیا تھا اور دوسرا اجنبی ہے۔ اس علاقے میں اس سے پہلے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"کوئی ہتھیار؟"

"نہیں صاحب۔ بظاہر تو کچھ نظر نہیں آیا۔"

"ٹھیک ہے جاؤ۔ جا شاباش۔" شیرو کی بات سنتے ہی وہ لوٹ گیا۔

HBC

اڈے والے برے سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق تو اسے
تک شیرو کو یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ یوں اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے اس کی
منتظر تو کیا، واقف بھی نہیں تھے۔ اس کے اچانک قریبی رشتے دار آ رہے تھے۔
تھوڑی دیر بعد ایک اور جیپ اڈے کے احاطے میں داخل ہوتے ہوئے
اشارہ کیا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر اتر پڑا۔ شیرو نے اسے بھی گلے لگایا۔
کہا۔ "اس نے اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں سے کہا۔
"پستول والے نوجوان نے کہا تھا۔
خان کے بڑے بیٹوں کی بات میں مداخلت نہیں کیا کرتے۔" شیرو نے اسے بڑی شفقت
سے گلے سے لگا لیا اور خلی ہو گیا۔

کمرے میں صوبے دار، تم دلو پہلے داخل ہوا۔ کیپٹن باہر کھڑا رہا۔ اس کی متلاشی نظریں
وہاں موجود کسی بھی شخص کا جائزہ لے رہی تھیں۔
"آؤ جی صوبے دار صاحب۔ میں تمہاری بلائیں لوں۔" شیرو نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ اس کی
طرف بڑھایا۔ صوبے دار نے بھی خوامخواہ اس سے ہاتھ ملایا۔ اگر کیپٹن بیچ راستے میں اسے
روکنے کی ہوتی تو وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کے بجائے پوری قوت سے شیرو کے منہ
پر گھونسہ رسید کرتا۔ تم دلو بے بسی سے صرف ہونٹ چبا کر رہ گیا۔
"گرفتار کرنے آئے ہو؟" شیرو نے اگلا سوال داغا۔
"نہیں شیرو۔ ہم تمہیں گرفتار کرنے نہیں آئے۔" اس کے سوال کا جواب صوبے دار
کے بجائے کیپٹن نے دیا جو صوبے دار کے بعد اندر داخل ہوا تھا۔
کیپٹن پر نظر پڑتے ہی شیرو یوں بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا جیسے طاقت ور اسپرنگ نے اسے
فضا میں اچھال دیا ہو۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر کسی میکانکی
عمل کے تحت اس کے بازو پھیل گئے۔
"شرفو!" اس کے حلق سے نکلنے والی آواز کسی کربناک چیخ سے مشابہ تھی۔
شیرو، کیپٹن اشرف خان بانہیں پھیلا کر اس سے لپٹ گیا۔
دونوں نے اپنے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے ایک دوسرے سے زیادہ ضبط کا
مظاہرہ کیا تھا، پھر بھی دونوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

شیرو نے کیپٹن اشرف خان کو الگ کیا اور بات کرنا چاہا، لیکن اس کے منہ سے ہونے لگے
سے بمشکل "اشرف خان" نکلا اور دوبارہ اس نے کیپٹن کو اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ صوبے دار
حیرت سے باری باری دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس ماجرے سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ
رہ سکا۔
صوبے دار نے محسوس کیا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا سننا چاہتے ہیں،
لیکن کہہ نہیں پاتے۔ شیرو کے وہ ساتھی جو چند منٹ پہلے یہاں سے بچ گئے تھے اب واپس
آ گئے تھے اور بھی "مہمانوں" کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے دودھ کے
گلاس رکھے ہوئے تھے، لیکن صوبے دار تجربہ کار واقعی طور پر محسوس کر سکتا تھا کہ دونوں اس
دسترخوان پر موجود ہی نہیں ہیں ——— وہ کسی اور ہی عالم کے مکین بنے ہوئے تھے۔
یوں بھی وہ کسی طور شیرو کے دل میں نہ جھانک سکتا تھا بس کی نظریں اشرف خان کے
چہرے پر گڑی تھیں اور جس کا ذہن پونچھ کے کوچہ و بازار میں بھٹک رہا تھا۔
———اس پونچھ میں جہاں نہ کوئی کیپٹن اشرف رہتا تھا اور نہ ہی شیرو ذکیت۔ وہاں تو
دو جگری دوست قیام پذیر تھے۔
ایک جو نادر خان کا بیٹا تھا ——— شرفو کہلاتا اور دوسرا شیرو ——— دونوں یک جان و دو
قالب تھے۔
پھر ——— ایک روز اس کا ساتھی اس سے بچھڑ گیا اور آج پھر اچانک وہ اس کے سامنے
آن کھڑا ہوا تھا۔
وہ کیسے یہاں آیا؟ وہ کیوں یہاں پہنچا؟
یہی کچھ سوچتا وہ ماضی کے ان اوراق میں گم ہو گیا جہاں جہاں اس کا اور شرفو کا ہم
ساتھ ساتھ آتا تھا ———!
اور آخر اس کی انگلیاں ٹٹولتے ٹٹولتے اس صفحہ تک آ پہنچیں جس کا عنوان ۱۹۴۷ء سے
شروع ہوتا تھا۔
یہاں آ کر وہ رک گیا اور بکھرے ہوئے نقوش یکجا کرنے لگا۔

ماضی کے جھروکوں سے

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی ایک شام

پاکستان کے قیام کو آج ۱۳ دن ہوئے تھے۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو انگریز نے دو مملکتوں کے قیام کا جو اعلان کیا تھا' اسے عملی جامہ پہنا دیا گیا تھا۔ دولت مشترکہ کی دو آزاد اور خودمختار مملکتیں دنیا کے نقشے پر ابھری تھیں' لیکن ابھی تک دونوں میں سے کوئی مملکت بھی اپنی ملنداری رائج نہیں کر سکی تھی ـــــ الجھن و نفاق کا یہ عالم کہ جنگل کے قانون کا سا سماں تھا۔

۴۰ کروڑ آبادی اور ۱۷۷۷۴۳۸ مربع میل رقبے پر پھیلے ہندوستان کی ۵۶۸ ریاستیں' دونوں میں سے کسی ایک مملکت کے ساتھ الحاق کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔ کچھ نے فیصلہ کر لیا تھا اور کچھ ابھی سوچ رہی تھیں۔ بعض ریاستوں کا جغرافیائی محل وقوع ایسا تھا کہ ان کے فیصلے محض رسمی حیثیت رکھتے تھے۔ انہی میں سے ریاست جموں و کشمیر بھی تھی جس کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پچھتر فیصد مسلمان تھے' لیکن جس کی قسمت کا فیصلہ بدقسمتی سے ایک ہندو ڈوگرہ مہاراجے کو کرنا تھا جو ابھی تک کومگو کے عالم میں تھا۔

اس ریاست کو صرف اسی لیے اہمیت حاصل نہیں تھی کہ یہاں سے جو دریا پھوٹتے تھے' وہ پاکستان سے گزرتے تھے بلکہ اس کی زیادہ اہمیت اس لیے تھی کہ ریاست جموں و کشمیر پاکستان اور بھارت دونوں سے ملحق تھی جب کہ شمال میں اس کے اور روس کے درمیان افغانستان کا علاقہ تھا اور اس کی سرحد چین سے بھی مشترک تھی۔

برصغیر کے مسلمانوں کے کبھی وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس ریاست کا الحاق کوئی نزاعی مسئلہ بن جائے گا کیوں کہ یہاں کی پچھتر فیصد آبادی مسلمان تھی اور بھارت کے ساتھ اس کا کوئی زمینی اور دریائی راستہ بھی نہیں تھا۔۔۔ اس طرح اقتصادی طور پر اس کا بھارت سے کوئی رابطہ ہی نہیں رہ جاتا تھا۔

اس حقیقت کا احساس ان انگریز بازی گروں کو بھی تھا۔۔۔ اس لیے ریڈکلف ایوارڈ

HBC

☆○☆

HBC

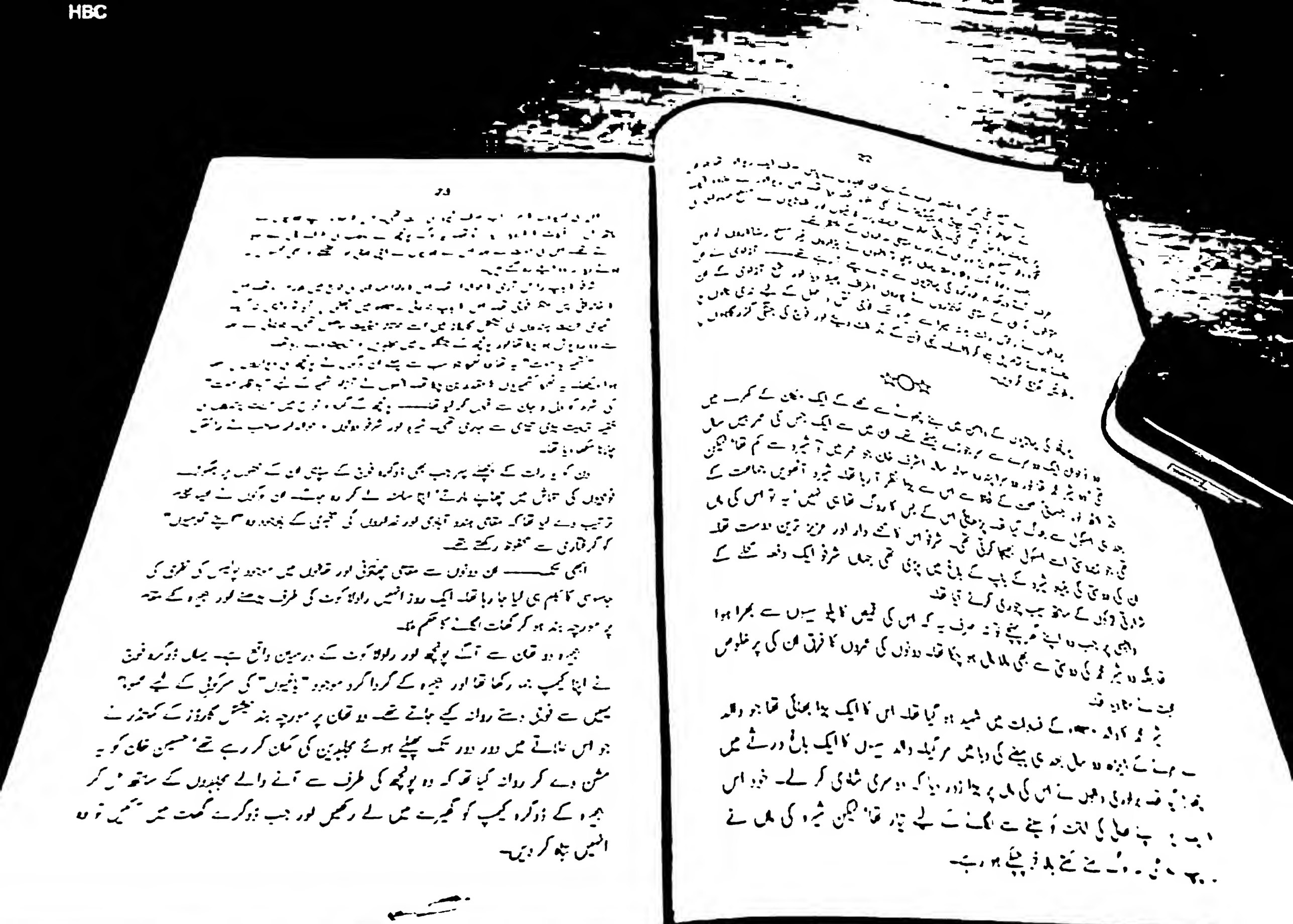

HBC

[illegible] میں پہاڑوں کے ساتھ [illegible]
[illegible] کی طرف سے [illegible]
[illegible] کی طرف بھیجنے کی اطلاع
[illegible] سے [illegible]
[illegible] سے جن پہاڑوں کو [illegible] تھا وہ کبھی کے [illegible]
[illegible] میں [illegible] اس نے سوچا جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے
[illegible] دونوں [illegible] ساتھیوں کی طرف دیکھا
[illegible] طرف [illegible] ساتھی نے اب کہا کہ
[illegible] کے [illegible] ایک ساتھی نے [illegible] کوئی اور راستے نہیں۔" کمانڈر
[illegible] کی [illegible] ختم کر سکتے ہیں۔ [illegible] کوئی
[illegible] دی [illegible] فائر کر کے کوئی مصیبت مول لینے کی پوزیشن میں نہیں
[illegible] ہیں۔ [illegible] اگر کوئی لشکر ان کے تعاقب میں ہے تو انہیں راستے ہی میں
[illegible] ہیں۔ [illegible] پر [illegible] اگر [illegible]
[illegible] کا [illegible] بھی [illegible] نے [illegible]"
[illegible] کا [illegible] سنتے ہی [illegible] کے [illegible] میں [illegible] ہو گیا

☆○☆

[illegible] مسلسل سفر کر رہے تھے۔

[illegible] اور [illegible] سے مسلسل سفر کر رہے تھے۔

[illegible] روانگی کے وقت شیر محمد کی ماں کا [illegible] حال ہوا تھا۔ اس کا احساس دونوں کو تھا۔ اس
[illegible] ہے [illegible] نے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن جس طرح دل پر پتھر رکھ کر اس نے اپنے بیٹے کو
[illegible] وہ [illegible] ہی جانتی تھی۔ اسی طرح ایک روز اس کا شوہر بھی رات کے
[illegible] [illegible] [illegible] بھر بھی واپس نہیں آیا۔ اس کا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اپنے
[illegible] میں [illegible] کی [illegible] کرے جس کے شعلوں نے اس کے خاوند کو نگل لیا تھا۔
[illegible] نے [illegible] کی [illegible] کی [illegible] کرے۔ جس کے شعلوں نے اس کے خاوند کو نگل لیا تھا۔
لیکن اس وقت کے وقت اپنے خاوند سے کیا ہوا قول ابھی تک یاد تھا۔ بالکل ایسے ہی
[illegible] کی بات ہے۔

[illegible] کے [illegible] خدا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ "میں جس
[illegible] پر [illegible] وہاں سے واپسی کے امکانات بہت کم ہیں۔ معلوم نہیں یہ لوگ میری
[illegible] کی [illegible] کے [illegible] آئیں گے یا نہیں؟ لیکن یہ مقصد اتنا عظیم ہے کہ اس [illegible] سے
[illegible] [illegible] [illegible] ہو گئی۔ [illegible] ابھی [illegible] وہاں ایک وقت آنے والا ہے جب میرے

[illegible] اور [illegible] کے بھی [illegible] [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible]
کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[

HBC

"میں کہتا ہوں کہ اشرف خان سے پہلے جاکر شیر محمد کو قتل کرو۔"

"لیکن ہمیں کس طرح پتا چلے گا کہ اشرف خان کون ہے اور شیر محمد کون؟"

"جو آگے ہے تم اسی کو قتل کرو۔" ایک شرفو کے منہ سے نکلا۔ "اور دیکھو! ابھی اس نے اپنی بات مکمل کی ہی تھی کہ ایک شرفو کے منہ سے نکلا۔ "اور دیکھو! اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا، فائر بازی کی آواز سے پہلے کہ سامنے سے آتے ہوئے دیکھ لے اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا تھا۔ شرفو نے اگلی سے اشارہ کیا تھا۔ انہیں اپنے دائیں بائیں سے ایک ایک وفادار ساتھی کو آوازیں سنائی دیں۔ ان کے دائیں اور بائیں اور آگے پیچھے درجن بھر پٹھانوں کا گھیرا مکمل ہو چکا تھا۔ پانچ چھ مجاہدوں نے ہو کر ہاتھ پر کپڑا باندھے اس گھیرے کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ انہیں گھیر رکھا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی رائفل یا پستول نہیں تھا۔ وہ سب ہی کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔

"کون ہو تم؟" ان میں سے ایک کی گرجدار آواز سنائی دی۔

"میں حوالدار بلور خان کا بیٹا ہوں اور یہ میرا ساتھی شیر محمد۔ ہم لوگ پونچھ سے بھیرہ جا رہے ہیں۔ ایک حسین خان کی کمان میں پہنچا ہے۔" شرفو نے غرداروں کو پہچان لیا تھا۔ حوالدار بلور خان کا نام سنتے ہی ان کے عقب سے ایک مجاہد آگے آیا۔ اس نے چاند کی روشنی میں جھک کر اشرف خان کا چہرہ دیکھا۔

"یہ تو حوالدار صاحب کا بیٹا ہے۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ سب دھیمے پڑ گئے۔

☆○☆

علی الصبح کیپٹن حسین خان، شیر محمد اور تین دیگر مجاہدوں کے ساتھ پونچھ کے مدارپور والے پل کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے جھولنے والا یہ پل توڑ کر اس طرف سے ڈوگرہ فوج کی ممکنہ پیش قدمی روکنے کے لیے پیش بندی کرنی تھی۔

ابھی یہ لوگ بھیرہ سے باہر نکلے ہی تھے کہ قریبی دیہات سے کچھ ہندو اور دو تین مسلمان دوڑتے ہوئے ان کی طرف آئے۔ انہوں نے آتے ہی شور بپا کر دیا۔

"بابو! میں ڈوگرہ فوج کا پورا ایک ریجمنٹ اترا ہے۔ اس نے وہاں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔" کیپٹن حسین خان ان کی چال میں آ گیا۔ اس نے مدارپور کی طرف جانے کی بجائے وٹ ٹاہلی سے جانب جانا اور اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔

یہ لوگ جانتے تھے کہ ڈوگرہ فوج کے وہاں سے اترنے کی اطلاع ان کے ذریعے ہی ڈوگرہ فوج تک پہنچی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں اطلاع دی گئی ہے کہ مجاہدین نے وہاں پہنچ کر پل توڑ دیا ہے اور اب وہ واپس جا رہے ہیں۔ اس لیے ڈوگرہ فوج کے وہاں پہنچنے تک مجاہدین کوئی کارروائی نہ کریں۔

☆○☆

اب ان کے لیے صرف ایک ہی خطرہ تھا۔ وہ تھی وہاں کی ایک ایئر فیلڈ جہاں سے ڈوگرہ فوج کے ہوائی جہاز اڑ سکتے تھے۔ بھیرہ فوج کو دست بدست لڑائی کی پوزیشن میں لانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ لوگ پیدل مارچ کرتی ہوئی فوج پر تو گھات لگا سکتے تھے لیکن فوجی ترتیب سے آگے بڑھتی ہوئی ڈوگرہ فوج پر لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کے ساتھ حملہ کرنا قطعاً ناممکن تھا۔

پہلا معرکہ

۳۰ اگست ۱۹۴۷ء کے تاریخی لمحات:

ڈوگرہ فوج کی ایک کمپنی جہیرہ سے راولاکوٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

——اور اسی طرح کی ایک دوسری کمپنی کے باغ سے راولاکوٹ کی طرف بڑھنے کی بھی اطلاعات ملیں۔ ان دونوں کمپنیوں کا ملاپ راولاکوٹ پر ہونا تھا جہاں کشمیری مجاہدین جذبۂ جہاد سے سرشار ہاتھوں میں کھاڑیاں اور لاٹھیاں پکڑے آزادی کشمیر کے نعرے بلند کر رہے تھے۔

ان کے گردوگرد پھیلی پہاڑیاں پچھلی ڈیڑھ صدی سے ان کے سربفلک ارادوں اور کوہ شکن ولولوں کی گواہی دیتی آ رہی تھیں' لیکن—— آج ان پر جو سرشاری کی کیفیت طاری تھی' چشم فلک نے اس سے پہلے اس کا نظارہ کب کیا تھا۔

دن کے تقریباً چار بجے کا عمل تھا جب ان لوگوں کو ڈوگرہ فوج کی پلٹن اس طرف آتی دکھائی دی' لیکن توقعات کے بالکل برعکس وہ لوگ مارچ کرتے ہوئے نہیں بلکہ جنگی حالت میں فارمیشن بنا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ سیکشنز سڑک کے دائیں بائیں پہاڑیوں پر پھیل کر پوزیشنیں سنبھال چکی تھیں اور ان کی قائم کردہ پکٹوں کے زیر سایہ باقی جوان ایڈوانس کر رہے تھے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اوپر کی "پکٹوں" کا ایڈوانس ہو رہا تھا اور نیچے سے باقی ماندہ پیدل نفری ان کے زیر سایہ گزر رہی تھی۔ یہ صورت حال خاصی پریشان کن تھی۔ اس کمپنی پر حملہ کرنے کے لیے پہلے "پکٹوں" کو تباہ کرنا ضروری تھا۔ جب کہ مجاہدین کے پاس نہ تو کوئی مشین گن اور نہ اسٹین گن' وہ بے چارے تو لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے گھات لگائے بیٹھے تھے۔

حسین خان دونوں آنکھوں پر ہتھیلیوں کا کٹورا بنائے بڑی بے بسی سے ایڈوانس کرتی فوج کا نظارہ کر رہا تھا۔ اسے صرف ایک فکر پریشان کیے ہوئے تھی "اگر آج کامیاب گھات

HBC

حسین خان اور شیر محمد ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ بچپن کی دوستی

[illegible] سے اس سکول میں پڑھ رہے تھے۔

دونوں کے والدین میں ایک اور چیز بھی مشترک تھی۔ دونوں سکھوں کے

[illegible] کے ملازموں سے لڑائی جھگڑے میں دونوں کے والد

[illegible] ہاتھوں سے ایک ہی سکھ کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ایک

[illegible] کے شانہ بشانہ لڑتے ہوئے شہید ہوا تھا۔ اگر وہ سکھوں سے

[illegible] کے ساتھ ہوتا تو اس کا شمار بھی ان عظیم محبِ وطن

[illegible] ہوتا جنہوں نے اپنے خون سے آزادی کی شمعیں روشن کی تھیں۔

حسین خان کو اگر فکر تھی تو اس بات کی کہ شیر محمد کی زندگی کا پہلا جنگجو معرکہ جب

اس کی نشانہ بازی پر اسے مکمل اعتماد تھا۔ لیکن اپنی آبائی فوجی زندگی میں کوہ و

میدانوں کی بیحد چڑھا دینے والا حسین خان سوچ رہا تھا کہ اس نے شیر محمد کو اپنے ساتھ

آنے کی اجازت دے کر اچھا نہیں کیا۔ مقابلے پر قبائلوں کا کوئی منتشر گروہ نہیں بلکہ منظم اور

کشمیر کی تربیت یافتہ فوج تھی۔

حسین خان ایک عجیب سی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس نے یہ فیصلہ بادل نخواستہ ہی

کیا تھا۔ اگر وہ اسے اجازت نہ دیتا تو کچھ بعید نہیں تھا کہ شیر محمد بھی اس طرف روانہ ہو

جاتا۔ حسین خان اس کے مرحوم والد کا دوست تھا۔ اس نے شیر محمد کے والد کا تکمیل پرتو اس

کے بیٹے میں دیکھ لیا تھا۔ اسی طرح ایک روز وہ دونوں ڈوگرہ فوج سے نبٹتے نکرا گئے تھے۔

اس کا دوست سب سے آگے ہونے کی وجہ سے فوراً ہی مرتبہ شہادت سے سرفراز ہو گیا تھا

جب کہ حسین خان کسی نہ کسی طرح بچ کر آ گیا تھا۔

آج اس کے مرحوم دوست کا بیٹا اسی طرح جان ہتھیلی پر رکھے اس کے سامنے موت

کے سفر پر روانہ ہوا تھا، لیکن حسین خان نے دل ہی دل میں قسم کھائی کہ وہ آج اپنے مرحوم

دوست کے بیٹے کو خود سے آگے نہ نکلنے دے گا۔ ایک مخصوص جگہ پہنچ کر اس نے شیر محمد

کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

"میں دائیں طرف سے چکر کاٹ کر سامنے والی پکٹ پر پیچھے سے حملہ کروں گا۔ تم

دوسری پکٹ والوں کو نشانے پر رکھنا۔" اس کا جواب سنے بغیر حسین خان نے "اللہ بیلی" کہا

اور تیزی سے دائیں طرف رینگ گیا۔

[illegible] ہی تھا۔ حسین خان کی [illegible] کر گیا۔

[illegible] اس کے [illegible] سے گزر کر [illegible] اس اور [illegible] اس

[illegible] اسے [illegible] اس نے [illegible] سے [illegible] بھی [illegible]

[illegible] ڈوگرہ فوج کا ایک [illegible] ان کے ساتھ ہی مجاہدین آزادی کے فلک شگاف نعروں سے [illegible]

[illegible] اس کے [illegible] اس [illegible] وہ جنگی فارمیشن میں آگے بڑھ رہے

تھے۔ لیکن ابھی تک انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ حملہ آور کس مقام پر حملہ کرنے والے

ہیں۔ مجاہدین نے پیدل فوج پر بڑے بڑے پتھر لڑھکانے شروع کر دیئے جو انہوں نے پہلے

ہی سے تیار کر رکھے تھے۔ ان کے ولولہ انگیز نعروں اور پتھروں کی بوچھاڑ نے ایک مرتبہ تو

ڈوگرہ فوج کے قدم اکھاڑ دیئے۔

ہر اول دستے کے پیدل جوان جو آگے آگے چل رہے تھے، پہلے ہی حملے میں ڈھیر ہو

گئے۔ لیکن دن کی روشنی ہونے کی وجہ سے "پکٹوں" نے مجاہدین کی پوزیشن نوٹ کر لی

تھی ـــــ انہوں نے اپنی مشین گنوں کا رخ اس طرف موڑ دیا۔

مجاہدین کے ہاتھ فوراً رک گئے اور وہ اس ناگہانی آفت کے لیے پہلے سے تیار کردہ

محفوظ آڑوں میں جا چھپے ـــــ انہوں نے پچھلے دو دنوں میں بڑے بڑے پتھروں کو اس

ترتیب سے اپنے گرداگرد پھیلا رکھا تھا کہ انہیں ایک طرح سے بنکروں کی حیثیت حاصل ہو

گئی تھی۔ وہ لوگ ان بنکروں میں سر دیئے دشمن کی فائرنگ سے کافی حد تک محفوظ تو ہو

گئے ـــــ مگر بے بسی سے دشمن کی اندھا دھند فائرنگ کے دھماکے سن رہے تھے۔

☆○☆

HBO

"کیا بات ہے؟" اس نے شرفو کے کندھے پر سے تانگے کی سمت جھک کر سرگوشی جیسا۔

"شش!" اشرف خان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے لے آیا۔

"کیا بات ہے؟" شیرو نے دبی دبی زبان میں اس سے ہاتھ چھڑواتے ہوئے پوچھا۔

"تانگے فوجی ہیں۔ میں نے انہیں سامنے درختوں کی اوٹ میں پوزیشن لیتے ہوئے دیکھا ہے۔" شرفو نے تیز سرگوشی کی۔

"فوجی کی اولاد ہو تا۔ ہمیں تو بے ہمارے گندرے بھی فوجی نظر آتے ہیں۔" شیرو نے اس کا مذاق اڑایا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

HBC

لکڑیوں کی آڑ میں بیٹھ کر وہ نوجوانوں کو اس سمت اپنی واپس لوٹنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے پاس رائفلیں نہیں اور شکاری بندوقیں تھیں جو ہمارے ہتھیاروں سے کم تھیں لیکن ان لوگوں کے لیے کافی تھیں۔

وہ سمجھ گیا کہ مقابلہ فضول ہے۔ جلد یا بدیر وہ لوگ اسے گھیر کر گرفتار کر لیں گے یا مار ڈالیں گے۔ وہ اس بستی سے ان لوگوں کا بچہ بچہ واقف تھا۔ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو تشدد پر آمادہ کر لیتے تھے۔ لیکن ایک کام وہ ضرور کر سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو تشدد پر آمادہ کر لیتے تھے۔ انہیں رکھے۔ اس طرح اس کے دوست کو بھاگنے کا موقع مل جائے گا۔ وہ یہی چاہتا تھا۔

اسے علم تھا کہ یہاں سے صرف چار پانچ میل دور مسعود محمد چھاؤنی میں پہنچ گئے ہیں۔۔۔۔ اور اگر کسی طرح اس کا دوست وہاں تک پہنچ جاتا تو وہ صورتحال بہت تبدیل کر دیتے تھے۔

اسی خیال کے پیش نظر اس نے انداز سے سامنے کی سمت چار فائر داغے اور لیٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کا فائدہ شرفو کو فوراً پہنچا۔ دوگروں نے تو دشمن کے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ لوگ مسلح ہوں گے۔ ان کی اطلاعات کے مطابق تو پورے پونچھ شہر میں ایک بھی مجاہد کے پاس رائفل یا پستول نہیں تھا' جب سامنے سے گولیاں آئیں تو وہ رکنے پر مجبور ہو گئے۔

انہیں احساس تھا کہ پہاڑیوں کا فائدہ دونوں فریقوں کو یکساں حاصل ہے۔ شیرو کے تو میں ہونے کی وجہ سے جب تک وہ اسے گھیر کر گرفتار کرتے' وہ ان کے دو تین ساتھیوں کو چاٹ جاتا۔ میجر رام سنگھ نے بڑی سختی سے انہیں ہدایت کی تھی "وہ تخریب کاروں کو زندہ گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کریں۔"

میجر رام سنگھ کو مہاراجہ نے خاص طور سے اس علاقے میں تازہ دم فوج اور بے شمار اسلحے کے ساتھ سدھنوں کی سرکوبی کو بھیجا تھا۔

——— مقامی غداروں کا ایک ٹولہ گھر کے بھیدیوں کی شکل میں پہلے ہی یہاں موجود تھا جو سرکاری حکام کو خبریں پہنچا رہا تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے ان کا کام خاصا آسان ہو گیا تھا۔ ورنہ حریت پسندوں کا مقامی نظام جاسوسی اتنا بھرپور اور مکمل تھا کہ ان میں سے کسی کو گرفتار کرنا مہاراجہ کے تنخواہ دار سپاہیوں کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔

☆○☆

شیر محمد کے پاس بمشکل پچیس تیس راؤنڈ باقی بچے تھے جو اس نے پوزیشن بدل بدل کر اس طرح فائر کیے کہ دشمن تعداد کے دھوکے کا شکار ہو جائے۔ وہ کبھی باقاعدہ فوجی تو رہا نہیں تھا' لیکن حوالدار کی محض چند ماہ کی جان توڑ محنت نے اس میں ایک گوریلے کی سی

اس نے شرفو کو وہیں رہنے کو کہا اور خود بندوق کی نال پر رومال باندھ کر ہلانے لگا۔ اسی بہانے وہ ذرا نمایاں ہو جاتا کہ گولی چلے۔ سامنے کا پتھر گرا پڑا تھا۔ لیکن ۔۔۔۔ اسی بہانے وہ ذرا نمایاں ہو جاتا کہ گولی چلے۔ اس کے ہاتھوں سے تنا ہوا رومال کے گھر کے پاس کو پہنچ کر وہ غصے کے عالم میں چیخا۔

وہ وہیں ٹھہر گیا۔ وہ بوکھلا کر ہی وہ کیلد اسے ہوش اس وقت آیا جب پہاڑوں

ہمیشہ دیسک "سامنے" پیچھے کی آواز سے گونج اٹھیں۔

ایک لمحے کے لیے شیرو کے سامنے ماں کی یہ چھاتیاں لہرائیں جو جانے کتنے ارمان ان سے

بھائی کے لیے دودھ کی آخری بوند تک نچوڑ لیتی تھیں۔

لمحے کے لیے اس نے بھی سوچا پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر دوست شرفو پر پڑی۔ وہ

"شرفو!" اس نے بلند آواز سے پکارا۔ "تم واپس جاؤ۔ میں یہیں رکتا ہوں۔"

فون کی طرف سے بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ حالات نارمل ہوتے ہی لوٹ آئے گا۔

میں انہیں روکتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے چاہا کہ آگے بڑھ جائے' لیکن شرفو نے اس کو

"نہیں شیرو! نہیں۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے قریباً شیرو کو اپنی

طرف دھکیلتے

شیر محمد نے جھنجھلا کر اسے خود سے الگ کیا۔ "طاقت ور ہونا مجھ سے' اسی لیے اپنا

حکم مجھ پر نافذ رہنے ہو۔" میٹرک کے طالب علم نے چاہا کہ جذباتی فضا پیدا کر کے شیرو کو

اس ارادے سے باز رکھے۔

شیرو نے ایک لمحے کو رک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے عقب میں گولی چلنے کی آواز

نے دونوں کو چونکا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے دوست کے ماتھے کا بوسہ لیا "اللہ بیلی"

کہہ کر اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔

اشرف خان ان کے پیچھے "شیرو شیرو" ہی چلاتا رہ گیا اور اس کا جگری یار' اس کا بڑا

بھائی اسے ایک لمبے عرصے کے لیے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا اور وہ بے بسی سے ہاتھ ملتا رہ گیا۔

——— اسے ایک ساتھ کئی رائفلیں فائر ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر یکے بعد دیگرے

اس نے چار پانچ فائر پستول کے بھی سنے۔ بادل نخواستہ وہ اپنے دوست سے الگ ہو کر پلٹنے

پر مجبور ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا دوست کبھی اکیلا واپس نہیں جائے گا۔ اس نے

شیرو

شیرو کو ہوش آیا تو وہ قیدیوں کی مویشیوں کی طرح ٹھونسی ہوئی ایک لمبی گاڑی میں تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔

شیرو کو اپنے ماضی کی کوئی بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے دماغ پر زور ڈالا۔ اس نے کوشش کی کہ اسے کچھ یاد آ جائے۔ لیکن جیسے ہی اس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا چاہا ایک کراہ اس کے ہونٹوں سے پھسل گئی اور وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ پہیوں میں گھومنے والی ٹھوکروں نے اس کا جسم دکھتا ہوا پھوڑا بنا دیا تھا۔

آخر کسی نہ کسی طرح وہ دیوار کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے تھوک نگلا۔ ابھی تک کوئی سنتری وہاں نہیں آیا تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ بمشکل اس نے تھوک نگلا اور اسی سوچ میں تھا کہ کسی کو آواز دے کر پانی طلب کرے یا خاموش رہے کہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔۔۔۔ اس کی آنکھیں دیوار کی سلاخوں پر جم گئیں۔

آنے والا کوئی مسلمان سپاہی تھا۔ اس نے شیرو کو ہوش میں آتے دیکھا تو سلاخوں والے دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑی عجیب سی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ شیرو اندازہ نہ کر سکا کہ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے ہمدردی ہے یا نفرت۔ اسے شیرو پر رحم آ رہا ہے یا غصہ۔ بس وہ چپ چاپ ٹکٹکی باندھے اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

اس کا دل چاہا کہ اس سے پانی مانگ لے، لیکن اس کی غیرت نے دشمن کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے احتراز برتا۔ کوارد نے جب دیکھا کہ وہ کچھ بولتا ہی نہیں تو اس

...ہوا تو شیرو کو اپنی آواز اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ ...ہوا تو اس کو ...

...شیرو کو اپنا وجود ...معلوم ہوا۔ سلاخ کی ...

...ایک اور سلح ...ہاتھوں ...

...اس نے ...ایک طرف ...کہ شیرو ...

...لیکن ...

...جانے والی ...

...اس کی ...

...شیرو کی ...

...شیرو نے ...

...ہونے ...

...پڑا۔

اس کی اس حالت پر اس کے ساتھیوں نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔ سلح حوالدار کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے دیوانہ وار جھپٹ کر اپنی واحد اضافی اور سنگین سیدھی کر کے شیرو کے پیٹ میں مارنا چاہی کہ اچانک ایک گونجدار آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

اس کا کمانڈنگ افسر ایک طرف سے اچانک نمودار ہوا تھا۔ وہ ان سب کو گھور گھور کر کہا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "اسے چوکی لے چلو۔" اس نے اپنے جوانوں کو ہونٹ چباتے ہوئے حکم دیا اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف لوٹ گیا۔

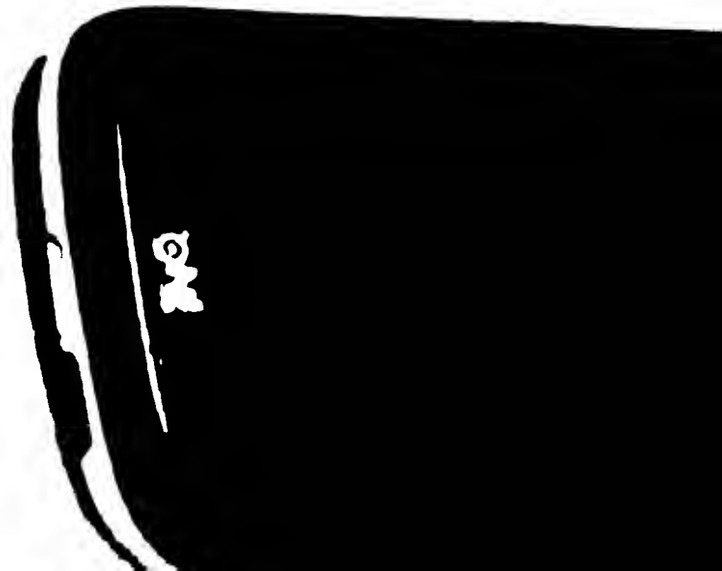

HBC

سے وہ واپس آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرے ہوئے دو پیتل کے لوٹے تھے۔ اس کی واپسی پر سنتری کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پانی کے لوٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ شیرو نے اس کے قریب آ کر ایک لوٹا اس کی طرف بڑھایا۔ سنتری نے لوٹا لے کر منہ سے لگا لیا۔ پانی کے چند گھونٹ حلق سے اترے تو اس کی بے چینی کچھ کم ہوئی۔ اس نے لوٹا منہ سے ہٹا کر شیرو کی طرف دیکھا۔ شیرو نے دوسرا لوٹا اس کی طرف بڑھا دیا۔ سنتری نے لوٹا لے کر اپنے منہ سے لگا لیا۔ اس کے اس عمل پر سنتری کو دکھ سا ہوا۔ اگر پانی میں زہر ملا ہوا تو؟ شیرو نے اسے جواب دینے کے لیے وقت ہی نہیں دیا۔ کسی بے رحم سے جلاد کی طرح اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔ اس مرتبہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اگر پانی نہ ہوتے تو ——"

——— اسے فوراً شدید پیاس کی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سنتری کوئی بات کہے بغیر وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ اس کی واپسی بڑھ گئی۔ دو تین منٹ بعد ہی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ میں پیتل کا لوٹا پکڑا ہوا تھا جو پانی سے بھرا تھا۔ اس نے شیرو کو زنجیر کھولنے کا اشارہ کیا اور لوٹا دروازے کی سلاخوں سے لگا دیا۔ شیرو اپنے جسم سے بندھا ہوا تھا۔ جسم سے دور کی چیز اٹھ نہیں سکتی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے منہ کو لوٹے سے لگا لیا۔ اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتا ہوا دروازے کے نزدیک ہو گیا۔ سنتری نیچے بیٹھ کر دھار کی شکل میں پانی گرا رہا تھا۔ شیرو نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر بمشکل دو گھونٹ پانی حاصل کیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا گلا بند ہو چکا تھا اور اب دو گھونٹ پانی اندر جانے سے کچھ نہیں ہوا۔ ایک بات کہ اس کا حلق دکھنے لگا تھا۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اسے کچھ سکون ملا۔

"بھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ کم از کم اپنی اکیلی ماں کا ہی خیال کیا ہوتا۔" سنتری نے پانی ضائع ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

شیرو نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس نے شیرو کو کوئی گالی دی ہو۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اور چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو سنتری نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ اسے افسوس سا ہوا کہ اس نے شیر محمد سدھن سے ایسی بات کیوں کہہ دی۔

"تمہارا جنم کسی میری ماں جیسی کشمیر کی ماں کے بطن سے ہوا ہوتا تب تم ایسی بات کبھی نہ کہتے۔" شیرو کے جواب نے سنتری کو اپنی جگہ منجمد کر کے رکھ دیا۔

سے وہ واپس آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرے ہوئے دو پیتل کے لوٹے تھے۔ اس کی واپسی پر سنتری کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پانی کے لوٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ شیرو نے اس کے قریب آ کر ایک لوٹا اس کی طرف بڑھایا۔ سنتری نے لوٹا لے کر منہ سے لگا لیا۔ اس کے اس عمل پر سنتری کو دکھ سا ہوا۔ اگر پانی میں زہر ملا ہوا تو؟ شیرو نے اسے جواب دینے کے لیے وقت ہی نہیں دیا۔ کسی بے رحم سے جلاد کی طرح اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔ اس مرتبہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اگر پانی نہ ہوتے تو ——"

——— اسے فوراً شدید پیاس کی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سنتری کوئی بات کہے بغیر وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ اس کی واپسی بڑھ گئی۔ دو تین منٹ بعد ہی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ میں پیتل کا لوٹا پکڑا ہوا تھا جو پانی سے بھرا تھا۔ اس نے شیرو کو زنجیر کھولنے کا اشارہ کیا اور لوٹا دروازے کی سلاخوں سے لگا دیا۔ شیرو اپنے جسم سے بندھا ہوا تھا۔ جسم سے دور کی چیز اٹھ نہیں سکتی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے منہ کو لوٹے سے لگا لیا۔ اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتا ہوا دروازے کے نزدیک ہو گیا۔ سنتری نیچے بیٹھ کر دھار کی شکل میں پانی گرا رہا تھا۔ شیرو نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر بمشکل دو گھونٹ پانی حاصل کیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا گلا بند ہو چکا تھا اور اب دو گھونٹ پانی اندر جانے سے کچھ نہیں ہوا۔ ایک بات کہ اس کا حلق دکھنے لگا تھا۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اسے کچھ سکون ملا۔

"بھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ کم از کم اپنی اکیلی ماں کا ہی خیال کیا ہوتا۔" سنتری نے پانی ضائع ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

شیرو نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس نے شیرو کو کوئی گالی دی ہو۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اور چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو سنتری نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ اسے افسوس سا ہوا کہ اس نے شیر محمد سدھن سے ایسی بات کیوں کہہ دی۔

"تمہارا جنم کسی میری ماں جیسی کشمیر کی ماں کے بطن سے ہوا ہوتا تب تم ایسی بات کبھی نہ کہتے۔" شیرو کے جواب نے سنتری کو اپنی جگہ منجمد کر کے رکھ دیا۔

سے وہ واپس آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرے ہوئے دو پیتل کے لوٹے تھے۔ اس کی واپسی پر سنتری کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پانی کے لوٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ شیرو نے اس کے قریب آ کر ایک لوٹا اس کی طرف بڑھایا۔ سنتری نے لوٹا لے کر منہ سے لگا لیا۔ اس کے اس عمل پر سنتری کو دکھ سا ہوا۔ اگر پانی میں زہر ملا ہوا تو؟ شیرو نے اسے جواب دینے کے لیے وقت ہی نہیں دیا۔ کسی بے رحم سے جلاد کی طرح اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔ اس مرتبہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اگر پانی نہ ہوتے تو ——"

——— اسے فوراً شدید پیاس کی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سنتری کوئی بات کہے بغیر وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ اس کی واپسی بڑھ گئی۔ دو تین منٹ بعد ہی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ میں پیتل کا لوٹا پکڑا ہوا تھا جو پانی سے بھرا تھا۔ اس نے شیرو کو زنجیر کھولنے کا اشارہ کیا اور لوٹا دروازے کی سلاخوں سے لگا دیا۔ شیرو اپنے جسم سے بندھا ہوا تھا۔ جسم سے دور کی چیز اٹھ نہیں سکتی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے منہ کو لوٹے سے لگا لیا۔ اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتا ہوا دروازے کے نزدیک ہو گیا۔ سنتری نیچے بیٹھ کر دھار کی شکل میں پانی گرا رہا تھا۔ شیرو نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر بمشکل دو گھونٹ پانی حاصل کیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا گلا بند ہو چکا تھا اور اب دو گھونٹ پانی اندر جانے سے کچھ نہیں ہوا۔ ایک بات کہ اس کا حلق دکھنے لگا تھا۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اسے کچھ سکون ملا۔

"بھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ کم از کم اپنی اکیلی ماں کا ہی خیال کیا ہوتا۔" سنتری نے پانی ضائع ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

شیرو نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس نے شیرو کو کوئی گالی دی ہو۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اور چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو سنتری نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ اسے افسوس سا ہوا کہ اس نے شیر محمد سدھن سے ایسی بات کیوں کہہ دی۔

"تمہارا جنم کسی میری ماں جیسی کشمیر کی ماں کے بطن سے ہوا ہوتا تب تم ایسی بات کبھی نہ کہتے۔" شیرو کے جواب نے سنتری کو اپنی جگہ منجمد کر کے رکھ دیا۔

سے وہ واپس آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرے ہوئے دو پیتل کے لوٹے تھے۔ اس کی واپسی پر سنتری کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پانی کے لوٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ شیرو نے اس کے قریب آ کر ایک لوٹا اس کی طرف بڑھایا۔ سنتری نے لوٹا لے کر منہ سے لگا لیا۔ اس کے اس عمل پر سنتری کو دکھ سا ہوا۔ اگر پانی میں زہر ملا ہوا تو؟ شیرو نے اسے جواب دینے کے لیے وقت ہی نہیں دیا۔ کسی بے رحم سے جلاد کی طرح اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔ اس مرتبہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اگر پانی نہ ہوتے تو ——"

——— اسے فوراً شدید پیاس کی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سنتری کوئی بات کہے بغیر وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ اس کی واپسی بڑھ گئی۔ دو تین منٹ بعد ہی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ میں پیتل کا لوٹا پکڑا ہوا تھا جو پانی سے بھرا تھا۔ اس نے شیرو کو زنجیر کھولنے کا اشارہ کیا اور لوٹا دروازے کی سلاخوں سے لگا دیا۔ شیرو اپنے جسم سے بندھا ہوا تھا۔ جسم سے دور کی چیز اٹھ نہیں سکتی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے منہ کو لوٹے سے لگا لیا۔ اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتا ہوا دروازے کے نزدیک ہو گیا۔ سنتری نیچے بیٹھ کر دھار کی شکل میں پانی گرا رہا تھا۔ شیرو نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر بمشکل دو گھونٹ پانی حاصل کیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا گلا بند ہو چکا تھا اور اب دو گھونٹ پانی اندر جانے سے کچھ نہیں ہوا۔ ایک بات کہ اس کا حلق دکھنے لگا تھا۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اسے کچھ سکون ملا۔

"بھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ کم از کم اپنی اکیلی ماں کا ہی خیال کیا ہوتا۔" سنتری نے پانی ضائع ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

شیرو نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس نے شیرو کو کوئی گالی دی ہو۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اور چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو سنتری نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ اسے افسوس سا ہوا کہ اس نے شیر محمد سدھن سے ایسی بات کیوں کہہ دی۔

"تمہارا جنم کسی میری ماں جیسی کشمیر کی ماں کے بطن سے ہوا ہوتا تب تم ایسی بات کبھی نہ کہتے۔" شیرو کے جواب نے سنتری کو اپنی جگہ منجمد کر کے رکھ دیا۔

سے وہ واپس آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرے ہوئے دو پیتل کے لوٹے تھے۔ اس کی واپسی پر سنتری کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پانی کے لوٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ شیرو نے اس کے قریب آ کر ایک لوٹا اس کی طرف بڑھایا۔ سنتری نے لوٹا لے کر منہ سے لگا لیا۔ اس کے اس عمل پر سنتری کو دکھ سا ہوا۔ اگر پانی میں زہر ملا ہوا تو؟ شیرو نے اسے جواب دینے کے لیے وقت ہی نہیں دیا۔ کسی بے رحم سے جلاد کی طرح اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔ اس مرتبہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اگر پانی نہ ہوتے تو ——"

——— اسے فوراً شدید پیاس کی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سنتری کوئی بات کہے بغیر وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ اس کی واپسی بڑھ گئی۔ دو تین منٹ بعد ہی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ میں پیتل کا لوٹا پکڑا ہوا تھا جو پانی سے بھرا تھا۔ اس نے شیرو کو زنجیر کھولنے کا اشارہ کیا اور لوٹا دروازے کی سلاخوں سے لگا دیا۔ شیرو اپنے جسم سے بندھا ہوا تھا۔ جسم سے دور کی چیز اٹھ نہیں سکتی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے منہ کو لوٹے سے لگا لیا۔ اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتا ہوا دروازے کے نزدیک ہو گیا۔ سنتری نیچے بیٹھ کر دھار کی شکل میں پانی گرا رہا تھا۔ شیرو نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر بمشکل دو گھونٹ پانی حاصل کیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا گلا بند ہو چکا تھا اور اب دو گھونٹ پانی اندر جانے سے کچھ نہیں ہوا۔ ایک بات کہ اس کا حلق دکھنے لگا تھا۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اسے کچھ سکون ملا۔

"بھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ کم از کم اپنی اکیلی ماں کا ہی خیال کیا ہوتا۔" سنتری نے پانی ضائع ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

شیرو نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس نے شیرو کو کوئی گالی دی ہو۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اور چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو سنتری نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ اسے افسوس سا ہوا کہ اس نے شیر محمد سدھن سے ایسی بات کیوں کہہ دی۔

"تمہارا جنم کسی میری ماں جیسی کشمیر کی ماں کے بطن سے ہوا ہوتا تب تم ایسی بات کبھی نہ کہتے۔" شیرو کے جواب نے سنتری کو اپنی جگہ منجمد کر کے رکھ دیا۔

سے وہ واپس آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرے ہوئے دو پیتل کے لوٹے تھے۔ اس کی واپسی پر سنتری کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پانی کے لوٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ شیرو نے اس کے قریب آ کر ایک لوٹا اس کی طرف بڑھایا۔ سنتری نے لوٹا لے کر منہ سے لگا لیا۔ اس کے اس عمل پر سنتری کو دکھ سا ہوا۔ اگر پانی میں زہر ملا ہوا تو؟ شیرو نے اسے جواب دینے کے لیے وقت ہی نہیں دیا۔ کسی بے رحم سے جلاد کی طرح اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔ اس مرتبہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اگر پانی نہ ہوتے تو ——"

——— اسے فوراً شدید پیاس کی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سنتری کوئی بات کہے بغیر وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ اس کی واپسی بڑھ گئی۔ دو تین منٹ بعد ہی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ میں پیتل کا لوٹا پکڑا ہوا تھا جو پانی سے بھرا تھا۔ اس نے شیرو کو زنجیر کھولنے کا اشارہ کیا اور لوٹا دروازے کی سلاخوں سے لگا دیا۔ شیرو اپنے جسم سے بندھا ہوا تھا۔ جسم سے دور کی چیز اٹھ نہیں سکتی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے منہ کو لوٹے سے لگا لیا۔ اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتا ہوا دروازے کے نزدیک ہو گیا۔ سنتری نیچے بیٹھ کر دھار کی شکل میں پانی گرا رہا تھا۔ شیرو نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر بمشکل دو گھونٹ پانی حاصل کیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا گلا بند ہو چکا تھا اور اب دو گھونٹ پانی اندر جانے سے کچھ نہیں ہوا۔ ایک بات کہ اس کا حلق دکھنے لگا تھا۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اسے کچھ سکون ملا۔

"بھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ کم از کم اپنی اکیلی ماں کا ہی خیال کیا ہوتا۔" سنتری نے پانی ضائع ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

شیرو نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس نے شیرو کو کوئی گالی دی ہو۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اور چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو سنتری نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ اسے افسوس سا ہوا کہ اس نے شیر محمد سدھن سے ایسی بات کیوں کہہ دی۔

"تمہارا جنم کسی میری ماں جیسی کشمیر کی ماں کے بطن سے ہوا ہوتا تب تم ایسی بات کبھی نہ کہتے۔" شیرو کے جواب نے سنتری کو اپنی جگہ منجمد کر کے رکھ دیا۔

مقابلہ کر رہا تھا اگر رام سنگھ شیرو کو دو گالیاں دیتا تو انسپکٹر میر اسے دس گالیاں دیتا۔ اگر رام سنگھ اسے ایک ٹھوکر مارتا تو وہ اسے چار ٹھوکریں رسید کرتا۔

رات سے وہ بھوکا پیاسا یہ اذیت برداشت کر رہا تھا۔ جلد ہی وہ ادھ موا ہو کر گر پڑا اس پر بے ہوشی طاری تھی۔

"لے جاؤ اسے۔ کہیں کمبخت مر ہی نہ جائے۔ اس سے ہمیں بہت کچھ اگلوانا ہے۔" اس نے اپنی سنتریوں کو حکم دیا جو اسے بیہوش

اسے کھٹا کھٹ۔ میں شام کے بعد آؤں گا۔" اس نے اپنی سنتریوں کو حکم دیا جو اسے بیہوش لائے تھے اور وہ لوگ شیرو کو ڈنڈا ڈولی کرتے واپس لے گئے۔

"بڑا ذہین معلوم ہوتا ہے کمبخت۔" انسپکٹر میر نے اپنی پگڑی سر پر جماتے ہوئے میجر رام سنگھ سے کہا۔

جواب میں رام سنگھ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "میر صاحب! یہ طوطے کی طرح ٹیں ٹیں کرے گا۔ میرے ذہن میں ایک علاج آیا ہے اس کا۔ میرے آدمی کام کر رہے ہیں جیسے ہی مجھے مطلوبہ اطلاع مل گئی' پھر دیکھنا میرے ہاتھ۔ ایسے مجاہدین تو میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔" اس نے خاصے طنز سے کہا۔

شیرو کو ہوش آیا تو وہی سنتری اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا رواں رواں فریادی تھا' لیکن اس نے اب اس اذیت کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اب اسے صرف ایک ہی فکر پریشان کر رہی تھی کہ اس کی ماں اور اس کا دوست شرفو کس حال میں ہیں؟

اسے ہوش میں آتے دیکھ کر وہی سنتری ایک طرف چل دیا۔ اس کی واپسی دو آدمیوں کے ساتھ ہوئی جو اس کے لیے کھانا اور قہوہ لیے چلے آ رہے تھے۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ لے جاؤ۔ غداروں! بے شرمو!" اس نے آنے والوں کو دیکھتے ہی جوش غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا۔

"یہاں رکھ دو اور چلے جاؤ۔" اسی سنتری نے آنے والوں سے کہا۔

وہ لوگ سامان خور و نوش وہیں رکھ کر چلے گئے۔ اب وہاں سنتری اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ سنتری نے اسے اپنی طرف مخاطب کیا اور شیرو نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

"میرا نام جلال ہے بیٹا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں شیرو کو مخاطب کیا۔ "اگر میری زبان پر اعتبار کر سکتے ہو تو جان لو کہ میں تمہارا ساتھی ہوں۔"

شیرو نے اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس نے کوئی بڑی عجیب سی بات کہہ

دی۔

"ٹھیک ہے تمہاری زبان پر اعتبار کرنے میں تمہاری تمام چیزی باتوں میں آ کر اپنے کسی ٹھکانے کا انکشاف کر دوں اور تمہیں مہاراج کی خدمت کرنے کا ایک سنہری موقع مل جائے۔" شیرو نے بڑے طنزیہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"تم اس وقت جو بھی چاہتے کہہ لو بیٹا مگر ایک بات یاد رکھو۔ وقت بہت کم ہے۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے سے اس کی وفاداری کا ثبوت ہی مانگتے رہے تو ممکن ہے رام سنگھ اپنے گھناؤنے منصوبے پر عمل کر گزرے۔ فی الوقت صرف کھانا کھا لو تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ باقی باتیں شام کو ہوں گی۔ میری ڈیوٹی اب ختم ہونے والی ہے۔ کسی نہ کسی طرح آج کا کشٹ بھی کاٹ لو' کل قدرت یقیناً کوئی بہتر سبب پیدا کر دے گی۔" شیرو نے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ سجاول نے اس کی توجہ اس سمت آتے قدموں کی آواز کی طرف منتقل کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسے گالیاں دے دے کر کھانا کھانے کا حکم دینے لگا۔

☆○☆

میجر رام سنگھ بڑی بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ بالآخر وہ آ ہی گیا۔ ایک کشمیری پنڈت اس کے سامنے ہاتھ جوڑے اسے نمسکار کر رہا تھا۔

"ہاں لالہ جی؟" میجر رام نے بے چینی سے پوچھا۔

"مہاراج جی! اس کا تو کوئی نام و نشان نظر نہیں آتا۔" پنڈت ٹھکسیایا۔

"کیا مطلب؟" رام سنگھ کو اچانک جھٹکا لگا۔

"میں نے ایک ایک گھر پر اپنے مخبر لگا رکھے ہیں مائی باپ لیکن وہ بڑھیا تو یوں غائب ہوئی جیسے اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔"

"پنڈت مہاویر پرشاد!" میجر رام سنگھ نے اسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ "نہ تو میں دودھ پیتا بچہ ہوں نہ تم۔ دماغ کو حاضر رکھ کر بات کرو پنڈت جی۔ پونچھ کوئی لاکھوں کی آبادی کا شہر نہیں کہ یہاں سے کسی کے غائب ہونے کا پتہ نہ چلے۔ مجھے شیرو کی ماں آج شام تک ہر صورت میں چاہیے ورنہ....." اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"میں اپنی مقدور بھر کوشش کر رہا ہوں مائی باپ۔ آپ دھیرج رکھئے۔ جائے گی کہاں؟" پنڈت نے بڑی مکاری سے دانت نکالے' لیکن اس کا چہرہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ جب رام

سنگھ نے اچانک اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہاری باتیں نہیں' شیرو کی ماں چاہیے۔ اسے کہیں سے بھی پیدا کرو' کہیں سے بھی۔ دفع ہو جاؤ۔"

"جاتا ہوں مہاراج' جاتا ہوں۔ دورگائی' ہے دورگائی۔"

اور پنڈت مہاویر پرشاد باہر نکل آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مقتل کے اندھے میجر کو کیسے سمجھائے کہ شیرو کی گرفتاری کے فوراً بعد ہی اس کی ماں گھر سے غائب ہو گئی تھی۔ شاید اس نے اپنے انجام کا اندازہ لگا لیا ہو گا یا اسے حسین خان کے آدمیوں نے یہاں سے کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیا ہو۔

پنڈت مہاویر پرشاد کے باہر جاتے ہی میجر رام سنگھ نے میز پر رکھی گھنٹی پر ہاتھ مارا اور ایک سنتری اندر داخل ہوا۔

"لے آؤ اسے۔" اس نے سنتری کے ایڑیاں بجاتے ہی حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنے شیر محمد اس کے سامنے موجود تھا۔ میجر رام سنگھ اس کی ماں کو تڑپ کا پتہ بتانا چاہتا تھا' لیکن اس کی پراسرار خشمگینی نے اس کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اب وہ اپنی تمام ناکامیوں کا بدلہ اسی سے لینا چاہتا تھا۔

اس کے اشارے پر ایک سپاہی نے ہتھکڑی کا دوسرا سرا وہاں دیوار ہی میں گڑی ایک مضبوط سلاخ میں پھنسا کر تالا لگا دیا۔

"حسین خان کہاں ہے؟" اس نے بید ہاتھ میں پکڑے اسے سرد آنکھوں سے گھورا۔

"تمہارے سامنے کھڑا ہے۔" شیر محمد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم لوگ اس طرح نہیں ماننے والے۔" رام سنگھ نے اپنے دانت پیسے۔

"یہاں کا ہر آزادی پسند حسین خان ہے۔ تم کس حسین خان کی بات کر رہے ہو؟" شیرو نے اس کا تمسخر اڑایا۔ اس کو اپنی بات کا جواب بازو پر پڑنے والے زوردار بید کی شکل میں ملا جو سنسناتا ہوا اس کے گوشت میں اتر گیا تھا۔

"کہاں ہے حسین خان——؟" رام سنگھ جوش غیظ و غضب میں چلاتے ہوئے اس پر برسنے لگا۔

[illegible] غضب شیرو کو اپنی ہڈیوں میں گھستی محسوس ہو رہی تھی' لیکن اس نے اذیت [illegible] جائے فریاد کناں ہونے کے رام سنگھ کو گالیاں دینے لگا۔ اس کی ہر [illegible] اضافہ کر رہی تھی۔ وہ اس کو مارتے مارتے اب بے بس

[illegible] کی طرح ہانپنے لگا تھا۔ اس کے بازو شل ہو گئے تھے۔ شیرو کے [illegible] چیخنے لگ رہے تھے۔ اس کے قریباً سارے جسم سے خون بہہ [illegible] کپڑوں کی تہہ رام سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔

رام سنگھ بس ہو کر ایک آرام کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ [illegible] وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

"بس بزدل!" شیرو کی آواز میں رتی بھر کمزوری نہیں تھی۔

جواب میں رام سنگھ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے گھنٹی پر ہاتھ مارا اور اندر آنے والے سنتری کو کچھ اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے دو لانبی بردار سنتری وہاں موجود تھے۔

"مارو اسے!" رام سنگھ نے ہانپتے ہانپتے اس کی طرف اشارہ کیا۔

جواب میں شیر محمد کا زوردار قہقہہ اسے پاگل ہی تو کر گیا۔ اس نے چاہا کہ وہ بھی اٹھ کر لاٹھی بردار اسے روئی کی طرح دھنک رہے تھے—— آدھ گھنٹے تک اذیت برداشت کرنے کے بعد وہ بالآخر بے ہوش ہو گیا۔

اس کے بے ہوش جسم کو پاؤں کی ٹھوکریں مار کر میجر رام سنگھ نے حکم دیا: "اسے اس کی کوٹھڑی میں پھینک آؤ۔" اس نے بڑے بڑے مجرموں کے کس بل نکال دیئے تھے۔ کشمیر بھر کے انٹروگیشن سینٹرز میں وہ قصائی کے نام سے پہچانا جاتا تھا' لیکن اس ۲۰ سال کے نوجوان کشمیری نے اسے ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔

شام کے بعد پنڈت مہاویر پرشاد پھر اس کے سامنے حاضر ہوا۔ پنڈت پچھلے دس سال سے سرکاری مخبر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا اور قبل اس کے کہ میجر رام سنگھ اس سے کچھ دریافت کرے' نہایت مکاری سے ایک آنکھ دباتے ہوئے اس نے رام سنگھ کو مخاطب کیا۔ "مہاراج بڑھیا تو نہیں ملی' ایک اور شے ہاتھ آئی ہے۔ مائی باپ شیرو تو کیا اس کے باپ کی قبر سے اس کی ہڈیاں بھی بولنے لگیں گی۔"

"کیا؟ کون ہے وہ؟" رام سنگھ نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلا۔

"زہراں!" پنڈت نے بڑی بے شرمی سے آنکھ اور ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"لیکن اس کا تو....." رام سنگھ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ پنڈت مہاویر پرشاد کی رگ رگ سے واقف تھا۔

☆○☆

تقسیم ہند سے چند ہفتے پہلے جب قائداعظمؒ دلی میں قیام فرما تھے' ایک وفد نے ان سے ملاقات کی۔ اس وفد میں موجود بیشتر لوگ مسلم لیگ سے متعلق تھے' لیکن ان میں ایک مسلمان فوجی افسر بھی شامل تھا جو "آرمڈ فورسز پارٹیشن سب کمیٹی" کا ممبر ہونے کی وجہ سے کچھ خدشات کی تہہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے قائداعظمؒ کو بتایا کہ مہاراجہ کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے گریز برت رہا ہے۔ اس نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ آزادی ہند کی تحریک کا ہیرو شیخ محمد عبداللہ جو تصور پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے' دراصل مہاراجہ کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔

قائداعظمؒ نے اس مستقبل کے جرنیل (طارق) کو تشفی دی اور فرمایا کہ دو افراد کا فیصلہ کبھی ساری قوم کا فیصلہ نہیں کہلاتا۔ نظریہ پاکستان کشمیری مسلمانوں کے دل میں بھی گھر کر چکا ہے۔ شیخ عبداللہ کی مخالفت کے باوجود کشمیری غیور مسلمان پاکستان سے الحاق کے حق میں ووٹ ڈالیں گے۔

لیکن ستمبر ۱۹۴۷ء ہی میں مری پہنچنے والے کشمیری مہاجرین کی تباہ حالی چلا چلا کر اس جرنیل کے خدشات کی تصدیق کر رہی تھی۔ ان لوگوں کی زبانی علم ہوا کہ مہاراجہ کی ستم رانیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ اس کی فوج اور مسلح غیر مسلموں نے کشمیری مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ وہ لوگ بے دریغ قتل عام اور لوٹ مار میں لگے ہوئے ہیں تاکہ مسلمان گھبرا کر ریاست سے بھاگ جائیں اور انہیں اپنے گھناؤنے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے۔

یہ بڑی سنگین اور روح فرسا خبر تھی۔ حکومت اس سے آنکھیں بند نہیں کر سکتی تھی۔ نہ صرف کشمیری مسلمانوں بلکہ نوزائیدہ مملکت پاکستان کے تحفظ کا تقاضا بھی یہی تھا کہ کشمیر کو بھارت کی جھولی میں نہ گرنے دیا جائے۔ ہر ذی شعور یہ محسوس کر سکتا تھا کہ اگر بھارتی افواج نے کشمیر کی سرحدوں پر ڈیرے ڈال دیئے تو راولپنڈی سے لاہور تک ۱۸۰ میل لمبی سرحد ان کے براہ راست حملوں کی زد میں آ کر بالکل غیر محفوظ ہو جائے گی۔ اس رابطہ لائن کے دفاع کے لیے فوج کا ایک بڑا حصہ مختص ہو جاتا اور لاہور فرنٹ کمزور پڑ جاتا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ ہماری رابطہ لائن توڑ کر لاہور' سیالکوٹ' جہلم اور گجرات کو پاکستانی افواج سے کاٹ دینا چنداں مشکل نہ رہتا۔

مری سے وہ سرحد صرف ۴۰ میل دور تھے' لیکن کشمیر میں بھارتی فوج کے آ جانے سے وہ سرحد بھی پہنچ میں آ جاتی۔ امن اور جنگ دونوں صورتوں میں یہ حالات ہمارے سر

کے خطرے کی تلوار بن کر لٹک رہے تھے۔

ہزاری دراصل کا دارومدار بھی ان دریاؤں پر تھا جو کشمیر سے نکلتے تھے۔ مرکزی ہیڈورکس سرحد سے صرف ایک میل اندر اور منگلا ہیڈورکس کشمیر میں واقع تھے۔ دوسری طرف خود کشمیر کی اقتصادیات بھی پاکستان سے وابستہ تھی۔ کوہالہ' مظفرآباد کی تجارتی شاہراہ کشمیر کی واحد شاہراہ تھی جو سارا سال کھلی رہتی تھی اور یہ مظفرآباد سے کوہالہ کے راستے پاکستان میں داخل ہوتی تھی۔ ویرواہ اور پتیل کی لکڑی جو ریاست کی آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ تھی' دریائے جہلم کے راستے پاکستان میں داخل ہوتی تھی۔

یہ ثبوت تھے اس بات کے کہ کشمیر کا پاکستان سے الحاق صرف "خواہش" نہیں بلکہ ایک لازمی ضرورت اور پاکستان کی سالمیت کا بھرپور تقاضا بھی ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت پاکستان سے الحاق کی حامی تھی۔ ان پاکستان دوست کشمیریوں کو جب جبراً بے گھر اور بے وطن کیا جانے لگا اور کشمیر سے بھارت کے "جبری الحاق" کی راہیں استوار ہونے لگیں تو درد مند پاکستانیوں کے دل دہل گئے۔

☆○☆

کشمیر میں جنگ آزادی اور مہاراجہ سے نجات کا جو شعلہ بھڑکا تھا' اس کی تپش کو قائم رکھنا ازحد ضروری تھا۔ وقت کا تقاضا تھا کہ پاکستانی افواج آگے بڑھیں اور اپنا جائز اور یقینی حق حاصل کر کے رہیں' لیکن قباحت یہ تھی کہ پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف انگریز تھا اور کلیدی اہمیت کے افسران بھی انگریز ہی تھے' جن سے کسی مدد کی توقع دیوانے کا خواب تھی۔

اس سلسلے میں پاکستانی افواج کے جو محب وطن افسران جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک کی حفاظت اور کشمیر کی آزادی کے لیے تل گئے تھے' ان کی کمانڈ اسی "فورسز پارٹیشن کمیٹی" کے ممبر کے حصے میں آئی' جس نے تقسیم ملک سے پہلے ہی قائداعظمؒ کو اس خدشے سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ تھے سابق میجر جنرل اکبر خان جو بعد میں طارق بن زیادؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کشمیر کی جنگ آزادی میں جنرل طارق کے نام سے مشہور ہوئے۔

مسلم لیگ کے سرکردہ رکن اور قائداعظمؒ کے معتمد ساتھی میاں افتخار الدین مرحوم کو قائداعظمؒ نے کشمیری رہنماؤں سے مل کر جنگ آزادی سے پیدا شدہ صورت حال اور اس کو ہی جانے والی ممکنہ امداد کے لیے جائزہ لینے سری نگر روانہ فرمایا تھا۔ میاں افتخار الدین نے وہیں جنرل طارق سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی عملی قدم اٹھائیں۔ جن پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح تھی بلکہ کہہ بھی دی گئی۔

HBC

کے وقت وہ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ جو بھی کارروائی ہو گی' غیر سرکاری سطح پر ہو گی۔ پاکستانی فوج یا اس کے افسران کے اس میں عملاً حصہ لینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

☆○☆

یہی تھے وہ غیر واضح' ناقابل اور مبہم حقائق جن کی روشنی میں طارق بن زیادؒ کے سپاہی جنرل طارق (میجر جنرل اکبر خان) مسلم کانفرنس کشمیر کے لیڈر سردار ابراہیم سے ملنے جا رہے تھے جو کشمیری حریت پسندوں کے لیے امداد حاصل کرنے پاکستان آئے ہوئے تھے۔

جنرل طارق کو حریت پسندوں نے بتایا کہ فی الوقت پانچ سو رائفلیں مل جائیں تو وہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے پہلے سے جاری شدہ تحریک آزادی کشمیر کو خاصی تقویت پہنچا سکتے ہیں۔ انہی کی زبانی جنرل طارق کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ حریت پسند جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپے بے چینی سے کسی مدد کے منتظر ہیں۔ وہ تمام سابقہ ایئر آرمی کے تربیت یافتہ فوجی ہیں اور ان کے حرکت میں آتے ہی جنگ آزادی کا نقشہ پلٹ جائے گا۔

جنرل طارق کے خیال کے مطابق انہوں نے بہت کم رائفلیں مانگی تھیں۔ کشمیر میں بغاوت کو سنبھالا دینے کے لیے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں اسلحہ درکار تھا' لیکن سوال اس بات کا نہیں تھا کہ اسلحے کی کتنی مقدار درکار ہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ لوگ کتنا اسلحہ حاصل کر سکتے ہیں۔

جنرل صاحب ان دنوں جنرل ہیڈکوارٹر میں جنگی اسلحہ اور سازو سامان کے ڈائریکٹر تھے اور اس ناطے سے یہ بات ان کے علم میں تھی کہ پاکستانی فوج کے پاس کتنا اسلحہ ہے؟ ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں پاکستانی فوج کے حصے کا ایمونیشن ابھی تک انڈیا میں پڑا تھا۔ اگر یہ سارا اسلحہ پاکستان میں بھی ہوتا تو وہ اسے کشمیر میں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس مقصد کے لیے کمانڈر انچیف کو اعتماد میں لینا ضروری تھا اور انگریز کمانڈر انچیف کے کانوں تک اگر ایسی کوئی اڑتی ہوئی خبر بھی پہنچ جاتی تو کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی بگڑ کر رہ جاتا کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ پاکستان آرمی کو کچھ نہ کرنے دیتا بلکہ اپنے خصوصی روابط کے پیش نظر بھارت کے کمانڈر انچیف کو بھی جو انگریز تھا' مطلع کر کے پہلے سے پیش بندی کی ہدایت کر دیتا۔

تو پھر کیا کیا جائے----؟

اسلحہ کہاں سے اور کیسے حاصل ہو-----؟

اس سلسلے میں قدرت نے دو راستے خود بخود پیدا کر دیئے۔ جنرل ہیڈکوارٹر میں پولیس کے چار ہزار رائفلوں کی منظوری ہو چکی تھی' لیکن ابھی تک پولیس نے اس کی ڈیمانڈ نہیں

کی تھی۔ جنرل طارق کا پلان یہ تھا کہ وہ یہ چار ہزار پولیس کو جاری کروا کے پھر پولیس سے حاصل کر لیں۔

دوسری طرف آرڈ ینینس ڈپو کے کرنل اکرم غلزاوہ آگے بڑھے۔ ان کی نظر میں ایمونیشن کا ایک ایسا سٹاک موجود تھا جسے ضائع کرنے اور سمندر میں پھینک دینے کے احکامات جاری ہو چکے تھے۔ کرنل غلزاوہ نے وعدہ کیا کہ وہ فائلوں میں یہ اسلحہ سمندر میں پھینک دیں گے۔ کارروائی مکمل ہوتے ہی یہ اسلحہ بھی مجاہدین کو دے دیا جائے گا۔"

مری کے ایک ریسٹ ہاؤس کو یہ تاریخی شرف حاصل ہے کہ وہاں بیٹھ کر وہ منصوبہ تیار کیا گیا جو آزاد کشمیر کی فتح پر منتج ہوا۔ اس روز شام کے بعد جنرل طارق اور دوسرے حریت پسند اپنے محدود ذرائع اور وسائل کی کمیابی کے باوجود ایک منصوبہ ترتیب دے چکے تھے۔

☆○☆

مہاراجہ کی فوج نو ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جن میں دو ہزار مسلمان تھے۔ اس منصوبے کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی کہ یہ دو ہزار مسلمان سپاہی کشمیر میں بغاوت پھیلتے ہی مہاراجہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے ہتھیاروں سمیت مجاہدین سے آملیں گے۔ کم از کم ان سے یہ امید ضرور تھی کہ وہ اس "بغاوت کی سرکوبی" کے دوران خود کو بے اثر بنائے رکھیں گے اور ضرورت پڑنے پر اپنے بھائیوں سے آن ملیں گے۔

بہرحال ان کے نکل آنے سے مہاراجہ کی فوج کی نفری سات ہزار رہ جاتی اور کشمیر جیسے پہاڑی علاقے کی حفاظت کے لیے یہ نفری نہ ہونے کے برابر تھی۔ سب سے بڑا خطرہ بھارتی مداخلت کا تھا کیوں کہ مہاراجہ ریاست کو خطرے میں دیکھتے ہی بھارت سے مدد طلب کر سکتا تھا۔

یہ اجلاس اس صورت حال پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کہ ممکنہ بھارتی مداخلت کو کیسے روکا جائے۔ اس سلسلے میں بحث و تمحیص کے بعد بالآخر طے پایا کہ ان تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی جائے جہاں سے غیر ملکی فوجوں کو داخل ہونا تھا۔

ایک راستہ تو کٹھوعہ سے جموں تک کا تھا جہاں گوریلا دستہ اچھی بھلی فوج کے لیے بھی دشواریاں پیدا کر سکتا تھا۔ یہ صورت حال بھی صرف ڈیڑھ دو ماہ تک رہتی' اس کے بعد برفوں سے یہ راستہ کیچڑ اور پانی کی وجہ سے تقریباً" بند ہو جاتا ہے۔ پھر دسمبر کے مہینے میں درہ بانہال پر شدید برف باری سے یہ راستہ بالکل بند ہو جاتا تھا۔

اس راستے کو مستقل روکے رکھنے کے انتظامات تو تھے لیکن ایک دو ہی گاڑ
راستہ روکا رہتا تو مجاہدین کو تیاری اور ضرب لگانے کا خاصا وقت مل جاتا۔

دوسرا اور اہم طریقہ فضائی حملے تھے۔ کشمیر میں ان دنوں صرف ایک سری نگر ہوائی
اڈہ ایسا تھا جہاں فوج اتاری جا سکتی تھی۔ لیکن یہ اڈہ شہر سے دور تھا اور چوبیس گھنٹے فوج کی
فوری حفاظت کے انتظامات بہت ہی کم رہ جاتے تھے۔ جنرل طارق کا خیال تھا کہ اگر دو
مسلح آدمی بھی ہوائی اڈے کے گرد اگرد پھیل جائیں تو دو سو دشمن فوج کے نہ صرف جہازوں کو
اترتے وقت زبردست نقصان پہنچائیں گے بلکہ دشمن فوج کو اترتے وقت ہی اتنا نقصان پہنچا
دیں گے کہ اس کے لیے شہر میں داخل ہونا ناممکن ہو جائے گا۔

اس اجلاس نے حتمی طور پر حاصل ہونے والی چار ہزاروں رائفلوں کو اس طرح تقسیم
کیا کہ ایک ہزار تو جموں کشتواڑ روڈ بند کرنے کے لیے دو سو سری نگر ہوائی اڈے کے لیے۔
باقی آٹھ سو ہزار دو سو رائفلیں پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ والے علاقوں میں بانٹ دی
جائیں گی۔ اسی سلسلے میں ایک اور پابند بھی زیر بحث آیا جس کی رو سے ساتھ اندرین تشکیل
کرنے کے لوگوں کو جو پاکستان میں موجود تھے ایک فوجی افسر کی کمان میں پنجاب کے سرحدی
علاقوں سے کشمیر میں داخل کیا جائے اور دوسرا گروپ میجر خورشید انور کی کمان میں کشمیر کی
طرف سے داخل ہو جائے۔

☆○☆

شیر دل نے اچانک چونک کر بات ہی ایسی تھی۔ خلجت تھی یا مسلسل بیداری کہ
اسے مدہوشی یا شاید نیند نے آ لیا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کیے لیٹا ہوا تھا جب اس کے سینے
اور دیوار کے درمیان کنکر میں لپٹا کاغذ کا ٹکڑا آن گرا۔ چونکا کر اس نے آنکھ کھولی اور
دھندلکے میں اس وہ کاغذ کا پرزہ اسی طرح اٹھا کر مٹھی میں بند کر لیا۔

پہلے اس نے اپنی دھڑکنوں کو نارمل کیا پھر کوٹھری کے دروازے میں لگی سلاخوں سے
باہر دیکھا۔ اندھیرا اور دور دور تک سناٹا تھا۔ وہاں کسی سنتری کا نام و نشان
نہ تھا۔ اس کاغذ کے ٹکڑے کو اس نے تیزی کی ایسی کیفیت نے آن لیا کہ اسے اپنے زخموں سے
رستے ہوئے خون کا احساس تک نہ رہا۔ اس نے بڑی بے تابی سے کاغذ کا وہ پرزہ کھول کر

[illegible]

[illegible] صرف [illegible] رات فرار کے لیے تیار رہنا۔ دشمن کی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ انہی ملت فروشوں کا دم قدم تھا کہ آج لاکھوں غیور اور بیسور کشمیریوں کو چند ہزار دوگروں نے انسانوں سے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ کشمیر کے جس کونے سے بھی کوئی چنگاری سلگتی' یہ غدار ملت فروش وہیں حق نمک ادا کرنے پر تل جاتے اور وہ کام جو شاید مہاراجہ کے تنخواہ دار درندے برسوں میں انجام نہ دے پاتے' ان نمک حرام فروشوں کی مدد سے چند دنوں میں انجام پا جاتا۔

محض چند ٹکوں کے لالچ میں اگر کسی گھر کے بھیدی نے زہراں اور اس کی نسبت کی لنکا ڈھا دی تو کیا ہو گا؟ زہریلے ناگوں کی طرح یہ پریشان کن سوچیں اس کے ذہن میں پھن پھیلانے لگیں۔

زہراں

معمول کے مطابق آج بھی زہراں اپنے باپ کا کھانا لے کر آئی تھی۔ وہ دوپہر کا کھانا لے آتی اور شام ڈھلتے ہی واپس چلی جاتی۔ اس دوران وہ پھل توڑنے یا درختوں کے گرد اگی گھاس پھوس کی صفائی میں اپنے والد کا ہاتھ بٹاتی تھی۔

آج جب وہ واپسی کے لیے روانہ ہوئی تو نہ جانے کیوں ایک بے نام سے خوف نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ چلتے چلتے ایک دفعہ تو اس کے جی میں آئی کہ وہ واپس اپنے باپ کے باغ میں چلی جائے' لیکن کچھ سوچ کر اس نے اس فیصلے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے اپنی بزدلی پر اب غصہ آنے لگا تھا۔ پچھلے دس سال سے اس کا یہ معمول تھا۔ پہلے وہ اپنی ماں کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ ایک روز جب اس کی ماں رات کو نماز پڑھنے کے بعد اس پر پھونکیں مار کر سوئی تو دوبارہ کبھی نہ اٹھی۔

آٹھ دس دن تک تو اس نے ماں کا سوگ منایا' پھر ننھی زہراں نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کا باپ روزانہ دوپہر کو گھر آ کر کھانا کھائے اور پھر تین چار میل کا پہاڑی راستہ طے کر کے واپس جائے۔ اس نے اپنے باپ سے ایک روز کہہ ہی دیا۔ "لالہ تم دوپہر کو نہ آیا کرو۔ کل سے میں تمہارے لیے کھانا لے آیا کروں گی۔"

باپ نے بڑی عجیب سی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ "لمبا فاصلہ ہے اور —— پھر گھر پر بھی تو کسی کو ہونا چاہیے۔"

"بے بے جو ہے لالہ۔" ننھی زہراں نے باپ کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا جس کی آنکھیں کسی بھی لمحے چھلک جانے کو تیار بہ تیار تھیں۔

پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا ان کے یہاں۔ ان کی بے بے ہی گھر رہا کرتی تھی۔ دونوں ماں بیٹی روٹی لے کر جایا کرتی تھیں اور دو تین گھنٹے باغ میں گزار کر واپس آ جاتی تھیں۔

لالہ نے اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں اس کے آنسو دیکھ کر ننھی زہراں رونا ہی نہ شروع کر دے' وہاں سے اٹھ جانے ہی میں مصلحت جانی اور جلدی جلدی دو چار نوالے

زہراں کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

اگلے روز جب وہ دوپہر کو گھر کی طرف آ رہا تھا تو اپنے باغ سے بمشکل ڈیڑھ فرلانگ دور واقع اس پہاڑی موڑ پر جہاں گذرے درختوں سے ٹیک لگا کر "ماہیا" گایا کرتے تھے، اسے دور سے ننھی زہراں آتی دکھائی دی جس نے اپنے سر پر ماں کی طرح کپڑے کا "ایوں" بنا کر رکھا ہوا تھا اور اس پر بڑے سلیقے سے کھانے کے برتن سجائے ہوئے تھے۔

——ایک پرسوز سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چپک گئی۔ دور سے آتی زہراں بالکل ماں کا عکس نظر آتی تھی۔ بچوں کی شکلیں عموماً اپنے ماں باپ ہی سے ملتی ہیں، لیکن جس حد تک زہراں اپنی ماں سے مماثلت رکھتی تھی، اس پر کبھی کبھی خود لالہ بھی حیرت زدہ رہ جاتا۔

اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنی لاڈلی کے سر سے برتن اتار کر زمین پر رکھے اور اسے اپنے کلیجے سے چمٹا لیا۔ بے اختیار اس کے دونوں گالوں پر آنسوؤں کے قطرے بہہ نکلے، لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ "ابھی تو چھوٹی ہے بیٹی۔" اس نے رندھے ہوئے گلے سے زہراں کو مخاطب کیا۔ "اکیلی تھک جایا کرے گی۔"

"نہیں لالہ۔" ننھی زہراں نے بڑی خود اعتمادی سے جواب دیا۔ "میں تھکنے والی نہیں ہوں۔"

لالہ اسے باغ میں لے آیا اور شام تک اسے ساتھ ہی رکھا۔ شام کو وہ گھر لوٹے تو پریشان حال بے بے نے خدا کا شکر ادا کیا۔

یوں تو شام کو دونوں باپ بیٹے اکٹھے ہی گھر واپس جایا کرتے تھے، لیکن جب درختوں پر پھل پکنے کے دن آتے تو لالہ ہفتے میں ایک آدھ دن ہی گھر آیا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کا زیادہ وقت دن کو پرندے اڑانے اور رات کو جنگلی جانوروں سے پھلوں کی حفاظت ہی میں گزر جاتا۔ زہراں ان دنوں اکیلی شام کو گھر لوٹا کرتی تھی۔

☆○☆

وہ بھی پھلوں کی تیاری کے دن تھے۔ اس کا باپ تو وہیں رہ گیا اور وہ خراماں خراماں گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

——سورج کا سرخ آتشیں گولہ اس کی داہنی سمت آنے والے پہاڑی سلسلے کی اوٹ میں چھپتا ہی چلا جا رہا تھا۔ پہاڑیوں کی چوٹیاں لو رنگ ہونے لگی تھیں۔ اسے ڈوبتے سورج کا منظر بہت پسند تھا اور اکثر وہ کافی دیر تک کسی جگہ رک کر اس منظر سے دل

بہلایا کرتی تھی۔ پہاڑی والے موڑ کے نزدیک پہنچ کر اس نے بائیں جانب قدرے نشیب میں بنے بڑے سفید اور سیاہ رنگ کے چھریرے خصلت سے کام رکھتے تھے۔ وہ کرتوں کے بل پچھلے پاؤں چشموں پر سے پھسلتے پل پر مضبوطی سے پاؤں جما کر ذرا سی دیر میں پنڈلیاں تک بے خبری میں پانی کی پھوار سے بھیگ جاتیں، لیکن وہ بھیگ جانے کا احساس اس ڈوبتے سورج کی شعاعوں میں ایسی غرق ہو جاتی کہ اپنے تن بدن کا اسے ہوش نہیں رہتا۔

ایک روز یوں ہی بیٹھے بیٹھے جب اس نے دراصل سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں تو اچانک کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ زہراں بڑبڑا کر اٹھی اور جب اپنے سامنے اس نے شیرو کو دیکھا تو گھبراہٹ سے اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ اس سے پہلے اس نے شیرو کا نام ہی سنا تھا یا بچپن کی وہ دھندلی سی یادیں تھیں جن کے سہارے اس نے گبھرو شیرو کا ایک سراپا اپنے ذہن میں سجا رکھا تھا۔ "شیرو اس کے تصورات سے بھی بڑھ کر خوبرو ہو گا۔" جھرنے کی ساری کنکناہٹ اس کے بدن میں در آئی تھی۔

وہ لوگ تو پہاڑی کے پرلی طرف والے محلے میں بستے تھے جب کہ اس کا چچا زاد بھائی—— شیرو، بازار والے محلے میں رہتا تھا—— ان دونوں کو متاہی رسوم کے مطابق پیدائش کے فوراً بعد ہی ایک دوسرے سے منسوب کر دیا گیا تھا اور جیسے جیسے زہراں کا شعور بیدار ہوتا گیا، ایک حجاب سا اس میں پیدا ہونے لگا—— جو کہنے ہی میں اس نے شیرو سے پردہ کرنا شروع کر دیا تھا اور آج جب وہ اچانک اس کے سامنے آیا تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اپنے حواس بحال کرے؟ تاہم اس نے بمشکل کھڑے ہو کر سلام کیا۔

"چچا سے ملنے جا رہا تھا، راستے میں تم نظر آ گئیں۔ سوچا تمہیں بھی دیکھتا چلوں کیسی ہو اب؟" شیرو نے جرأت کا مظاہرہ کیا۔

زہراں نے جواب میں صرف ایک مرتبہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا پھر کچھ کہے بغیر نظریں جھکا لیں، لیکن گونگے جذبوں کی زبان نے شیرو کے کانوں میں سرگوشی کی..... "ہاں تو کیسی لگتی ہوں؟"

"میرے تصورات سے بھی بڑھ کر خوبصورت ہو تم زہراں۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"جی——!" زہراں کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔

اس دفعہ تو شیرو بھی گھبرا گیا۔ کسی نادیدہ طاقت نے بے اختیار اس کے جذبات کی ترجمانی اس کی زبان سے کروا دی تھی۔ اس کا یہ فعل قطعاً غیر ارادی تھا۔ پھر جیسے وہ مطمئن سا ہو

گیا۔۔۔۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ بات کہہ کر اس نے اپنے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہو۔ "ہاں زہراں۔" اس نے سنبھالا لیا۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم۔۔۔۔۔" وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

پہاڑی کی اوٹ سے گذریا اور بھیڑیں اکٹھی نمودار ہوئی تھیں۔ شیرو کو امید تھی کہ زہراں بھی کچھ کہے گی' لیکن وہ خاموشی سے دوپٹے کے پلو کو انگلی کے گرد مروڑتی رہی۔ البتہ دو تین مرتبہ اس نے زمین پر گڑی اپنی نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جیسے شیرو کے کہے الفاظ کی صداقت کو کریدنے کی کوشش کر رہی ہو اور وہاں سے جواب میں "حق حق" کی صدائیں سن کر پھر نظریں جھکا لیں۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔" شیرو نے ڈھلان اترتی بھیڑوں اور رکھوالے پر نظریں جمائے کہا۔ زہراں کے سینے میں اس کی روانگی کے اعلان سے ایک ہوک سی اٹھی۔ بھیڑوں کے تعاقب میں آتا گذریا نمایاں ہونے لگا تھا۔ جب شیرو نے روانگی کے لیے پہلا قدم اٹھایا۔ زہراں کا ہاتھ بے اختیار روکنے کے سے انداز میں اس کی سمت اٹھا اور اٹھا ہی رہ گیا۔

"پھر آؤں گا۔" اس کے آگے کی سمت بڑھے ہاتھ کی لرزش نے شیرو کے اعصاب پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ اس نے پلٹ کر بمشکل یہی ایک فقرہ کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس راستے کی طرف گھوم گیا جس پر چل کر زہراں یہاں آئی تھی۔

جانے والا تو چلا گیا لیکن زہراں کو ایک خوبصورت درد ہمیشہ کے لیے بخش گیا۔ یہ عجیب سرور بخش درد تھا جس کی لذت اس کی جان لیے جاتی تھی۔ جب تک بھیڑیں اپنی پیاس بجھانے کے لیے اس جھرنے پر زہراں کے گرد دست قدرت کے بکھرے پتھروں پر نہ پھیل گئیں۔ وہ ٹکٹکی لگائے اس راستے کو گھورتی رہی جو چند فرلانگ کے بعد گھوم کر اس کے لالہ کے باغ تک جا پہنچتا تھا۔ پھر اس نے اپنی بے قابو دھڑکنوں کو سمیٹا اور ایک سرشاری کے عالم میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور جھرنے سے گھر تک کا فاصلہ اس نے شیرو کے تصورات کی نذر کر دیا۔

☆○☆

اس کے بعد تو زہراں کا معمول ہو گیا کہ وہ اکثر یہاں سے گزرتے ہوئے "کسی" نہ "کسی" کے منتظر رہتی۔ دو ماہ اس اندوہناک انتظار میں بیت گئے' لیکن شیرو نہ آیا۔ پھر ایک روز وہ اس دن کی طرح اچانک ایک پہاڑی موڑ سے نمودار ہو کر اس کی راہوں میں

اس دن شیرو کو دیکھتے ہی نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں اطمینان پھیل گیا تھا اور ۔۔۔۔ اس کے گالوں سے چپکتے آبدار موتیوں کو دیکھ کر شیرو کے دل نے کہا کہ ایک کوہسار سا ڈھ گیا۔

"کیا بات ہے زہراں؟" اس نے پہلی ملاقات کی طرح آج بھی بے اختیار اس کے ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہ انکسار ہمدردی تھا یا آواز مسکرا کر زہراں ہنسنے لگ گئی۔ "آئے کیوں نہیں۔۔۔۔ اس دن کے بعد سے؟" وہ سسک پڑی۔ "ارے پگلی کہیں کی' بات ہی ایسی ہو گئی تھی۔ ورنہ تو تمہیں بتانے آیا ہوں۔" اس نے زہراں کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔

"کیا بات تھی۔۔۔۔؟" زہراں یک لخت جیسے نیند سے بیدار ہو گئی۔ اس احساس نے کہ وہ بے اختیار شیرو کے سینے سے لگ گئی تھی' اس کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھا دی۔۔۔۔ حجاب اور احساس ناکردہ گناہ نے اس کے گالوں کی لوئیں تک سرخ کر دی تھیں۔

"آؤ زہراں' وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" شیرو نے بڑے سنجیدہ لہجہ میں اسے مخاطب کیا۔

شیرو کے لہجے کی سنجیدگی اور اس کی اس طرح پراسرار آمد نے زہراں کو چونکا دیا۔ وہ متجسس سی اس سمت اس کے تعاقب میں بڑھ گئی۔ جہاں وہ اس گزرگاہ پر آنے جانے والوں کی نظروں سے بالکل چھپ کر بیٹھ سکتے تھے۔ شیرو اسے یہاں تک لے تو آیا تھا' لیکن یہ بات اسے بھی پریشان کرنے لگی تھی کہ آخر زہراں کو وہ سب کچھ کہہ کر بھی پائے گا جو کچھ کہنے کے لیے اسے یہاں لایا ہے۔ کیا اس کا معصوم دل یہ صدمہ۔۔۔ بھی سہہ سکے گا؟

وہ تو ایک مرتبہ مل کر دوبارہ نہ ملنے پر بلکنے لگی تھی۔ شیرو کو کچھ نہ سوجھتا تھا کہ آخر زہراں کو وہ کیسے مطمئن کر پائے گا۔ اس کا اس دنیا میں لالہ' بے بے اور شیرو کے سوا اور ہے ہی کون؟ دو تین ماہ بعد جب وہ لوگ پھلوں کی ایک فصل سے فارغ ہو جاتے تو لالہ دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیتا۔ اب جو اچانک وہ اسے ایک لمبی جدائی کے سامنے سے دوچار کرنے آیا ہے تو کیونکر وہ اس حادثہ جانکاہ سے سنبھل سکے گی؟ پھر ایک مضبوط ارادے نے' ایک قوی خیال نے جیسے اس کے خیالات کی ڈولتی ناؤ کو کنارہ دکھا دیا۔

اس نے سوچا وہ کوہساروں کی بیٹی سے مخاطب ہے۔ وہ۔۔۔۔ اس نسل کا نمائندہ ہے جس کو حالات نے مادر کشمیر کو غیروں کے استبداد سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرنے کی سعادت نصیب کی ہے۔۔۔۔ وہ کشمیر کو ڈوگرہ فوج سے آزاد کروانے جا رہا ہے۔۔۔۔ وہ

ہی کی سمت پہنچی لیکن یہ کیا؟

ہی کے دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی جب کوئی باہر نہ نکلا تو وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر جا

بھائی بھائیں کر رہا تھا۔ لالہ نے دیوانہ وار گھر کے تینوں کمروں میں

زہراں کی اچانک گمشدگی بوڑھی عورت کے حواس پر بجلی بن کر گری۔ لالہ نے محلے کی دو تین عورتوں کو مدد کے لیے بلا لیا تھا۔ سب نے مل کر اس کے گھٹنوں کی مالش کی تب کہیں جا کر اسے ہوش آیا' لیکن وہ دیوانوں کی طرح ایک ایک سے اپنی زہراں کا پتہ پوچھنے لگی۔

"خدا کی قسم اسے اس جرم کی اتنی بھیانک سزا بھگتنا ہو گی کہ پونم کی پہاڑیاں بھی اس
[illegible] پتہ پائیں گی۔ رات کا انتظار کرو دوستو! آج کی رات فیصلہ کن ہو گی۔
[illegible] مہلت نہ دیں گے۔" حسین خان کو اپنی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔

"کیا خبر لائے؟" اس نے چھٹتے ہی بڑی بے چینی سے پوچھا۔
"حیرت ہے۔" نصیب نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔
"پہیلیاں نہ بجھواؤ نصیب۔" حسین خان نے سخت اضطراب کا مظاہرہ

سے پہ بے ہوش زہراں کو لاد رہا تھا۔

——— زہراں کی شکل پر نظر پڑتے ہی ایک سنسناہٹ سی اس کے بدن میں دوڑ گئی: "یہ لوگ اس حد تک بھی گر سکتے ہیں؟" اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا لیکن——— مہاویر جیسے شیطان کو وہاں دیکھ کر اسے تعجب بھی نہ ہوا۔ سجاول نے وہاں رک کر خود پر کسی کو شک لانے کا موقع نہ دیا اور وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔

اپنی رائفل جمع کرواتے وقت اس نے نے کوئی ایسی غیر معمولی حرکت نہ کی جس کی بنا . صد میں بھی کوئی اس پر شک کر سکتا۔ اب اسے گھر لوٹ جانا تھا۔ اس کی ڈیوٹی کل شام

نے اس کو کریدنے کے سے انداز میں پوچھا۔

"مجھے ذرا باغ تک جانا ہے' بڑا ضروری کام تھا حوالدار جی۔ میں تو آج چھٹی کرنے والا تھا' لیکن میر صاحب نے ایمرجنسی کی وجہ سے درخواست قبول نہیں کی——— میں نے سوچا چلو شام کو چلا جاؤں گا۔ خواہ مخواہ کیوں معمولی سی بات کے لیے افسروں کی منتیں کرتا پھروں۔" سجاول خان نے اسے مطمئن کر دیا۔

بیرک کی طرف جاتے ہوئے جہاں اس کے سویلین کپڑے رکھے ہوئے تھے' سجاول خان

جہاں نے اب جینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس نالے کے کنارے
تھا۔ تھا۔ رات کے بالکل ساتھ ہو رہا تھا۔ تھا۔ ہونے کی ساری گندگی اسی نالے
تھا۔ میں بھی یہ بات [illegible] کہ کوئی اس نالے میں کبھی

پھر رہا تھا ایک عجیب [illegible]
جیسے اس نے کوئی حرکت کی تو نہ جانے کیا قیامت گزر جائے۔
۔۔۔اس کا حلق دہشت سے خشک ہو رہا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔
آہستہ آہستہ اس کا ذہن بیدار ہونے لگا اور اسے تمام واقعات دہشتناک منظر کی طرح یاد

میجر رام سنگھ کا حکم سنتے ہی اس کے دونوں ماتحت "جے بجرنگ بلی" کا نعرہ لگاتے ہوئے کمرے سے باہر کو لپکے۔ چند منٹ بعد ہی فوجیوں کی مختلف ٹولیاں مختلف سمتوں میں زہراں اور اس کے اغواکنندہ کی تلاش میں روانہ ہو گئیں۔

زہراں اور شیرو کی ماں دونوں اس کے ہاتھ آتے آتے نکل گئی تھیں۔ رام سنگھ سوچ رہا تھا کہ شیرو کی ماں تک تو ان کی رسائی ہی نہیں ہو سکی' لیکن زہراں کی یہاں موجودگی کا علم حریت پسندوں کو کیسے ہوا؟

رام سنگھ جانتا تھا کہ لالہ مہادیو کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں۔ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا اور ایسا گہرا آدمی کبھی اتنا غیر محتاط نہیں ہو سکتا کہ وہ زہراں کے اغوا کا علم کسی کو ہونے دے۔۔۔۔ اغوا ہونے سے تھانے پہنچنے تک اس نے تو کسی کو کانوں کان اطلاع نہیں ہونے دی تھی۔ ان کے خصوصی عملے کے سپاہی جو اس مہم پر اس کے ساتھ گئے تھے' ان میں سے بھی کسی کی وفاداری پر وہ شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

۔۔۔۔پھر اس نے فرض کیا کہ اگر حریت پسندوں کو اس بات کی خبر بھی ہو گئی تھی تو وہ بھی اتنی تیزی سے حرکت میں نہیں آ سکتے تھے۔ انہیں اس جگہ پہنچنے کے لیے رات کا انتظار کرنا چاہیے تھا اور جس راستے سے زہراں کو نکالا گیا تھا' اس طرف تو کوئی ذہن جا ہی نہیں سکتا تھا۔

اس کا ذہن مکمل بیدار تھا اور وہ تمام امکانات پر دماغ سوزی کر رہا تھا تاکہ جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ کر کوئی راہ نکال سکے۔ میجر رام سنگھ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ حرکت ضرور وہاں موجود لوگوں میں سے کسی کی ہے۔

۔۔۔۔شاید کسی مسلمان فوجی یا پولیس والے نے زہراں کو اغوا کر لیا ہے یا وہ حریت پسندوں کا کوئی ساتھی ہے جس کی اطلاع پر وہ لوگ فوراً" حرکت میں آ گئے اور اطلاع دینے والے ہی نے انہیں اغوا اور فرار کے لیے اس راستے اور طریق کار کی نشاندہی کی ہو گی۔

رام سنگھ کی ترقی کا شاید سب سے بڑا راز ہی یہی تھا کہ اس نے جوش میں بھی کبھی ہوش کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور اب چونکہ وہ بڑی تیز رفتار سے اپنے ذہن میں ترتیب پا جانے والے مفروضوں پر عمل پیرا تھا۔ اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس واقعے کی [illegible] وہاں موجود مسلمان سپاہیوں کو نہ ہونے پائے۔

[illegible] اطلاعات کے مطابق صرف سجاول ہی چھٹی کر کے گیا تھا۔

[illegible] نے کسی کو بتائے بغیر وہاں موجود پولیس کے مسلمان اور غیر مسلم تمام

ساتھیوں سے اپنے طور پر اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ [illegible] نے کوئی غیر معمولی حرکت نوٹ نہیں کی۔

پھر اسے خیال آیا کہ اگر وہ حریت پسند [illegible] سجاول ہی تھا تو وہ کس طرح آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ لوگ تو پہلے سے وہاں تھے اور وہاں اطلاع دینے والے کی واپس نہیں آ سکتا اور۔۔۔۔ اگر اس نے چند ساتھی وہاں چھوڑ دیے ہوں تو بھی اتنی جلدی کوئی واپس نہیں آ سکتا۔ سجاول کے کہنے پر فوراً" حرکت میں آ گئے تھے تو بھی ابھی وہ [illegible] پہنچا کر واپس نہیں آیا ہو گا۔

۔۔۔۔اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی اس نے جائے واردات پر موجود [illegible] کے لیے اس کے کمرے کی طرف روانہ کر دیا تھا۔

☆○☆

"یار! میجر رام سنگھ کے کمرے سے ایک انتہائی خطرناک زیر تفتیش ملزم فرار ہو گیا ہے۔" حوالدار جانکی داس نے قہوے کا لمبا گھونٹ بھرتے ہوئے اپنی دانست میں اسے "اہم اطلاع" دی۔

"تمہاری عقل کیا گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ وہاں سے کون بھلی کا اٹل فرار ہو سکتا ہے' چاروں طرف تو رام سنگھ کے فوجی پہرہ دے رہے ہیں۔ پولیس والوں کو تو اس طرف جانے کی بھی اجازت نہیں۔" سجاول نے بظاہر اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

"یہی تو بات ہے۔" جانکی داس نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے سے لہجے میں کہا۔ "رام سنگھ کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ خود فرار نہیں ہو سکتا۔ ضرور اسے کسی نے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔"

"میں اس سلسلے میں اب کیا عرض کروں۔ ہم تو معمولی سے بندے ہیں' اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ صبح میر صاحب آ جائیں گے تو یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔ وہ تو مفرور کو کبھی معاف کریں گے ہی نہیں۔ تم تو جانتے ہو انہوں نے آج تک کتنے اشتہاری مجرم گرفتار کروائے ہیں۔"

"بھگوان کے لیے۔" جانکی داس نے اس کے زانو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھنا۔ اگر اسے ذرا سا بھی شک ہو گیا کہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے تو وہ مجھے فوراً" گولی مار دے گا۔" پھر جانکی داس نے اس کے بالکل ساتھ جڑتے ہوئے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ "اس نے تو مجھے تمہاری چیکنگ کے لیے روانہ کیا ہے۔ وہ اپنی تسلی

کرنا چاہتا تھا کہ تم گھر ہی پر موجود ہو یا نہیں۔"

حوالدار جانکی داس سیدھا سادا بوڑھا آدمی تھا۔ اس نے قصے کی دو بیالیوں سے پر
ساری کہانی سجاول کو سنا دی اور اس بات کا یقین بھی دلا دیا کہ وہ اس کی طرف سے
مطمئن رہے۔ جانے سے پہلے اس نے ایک مرتبہ پھر سجاول سے درخواست کی کہ وہ اس
بات کا ذکر اپنے کسی ساتھی سے بھی نہ کرے۔

جانکی داس کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد سجاول جس طرح اپنے گھر میں داخل ہوا تھا
اسی طرح دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا۔ پہلے اس نے گھوم پھر کر اطمینان کر لیا کہ کوئی اسے دیکھ
تو نہیں رہا اور پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر لالہ کے مکان کے عین سامنے جا پہنچا۔

——پریشان حال لالہ اتنی رات گئے سجاول کو اپنے دروازے پر دیکھ کر چونک پڑا۔
اس کی صاحب سلام تو سجاول سے تھی' لیکن اس سے کچھ زیادہ تعلقات نہ تھے۔ ویسے اسے
اس بات کا علم ضرور تھا کہ سجاول پولیس میں ملازمت کرتا ہے۔ سجاول نے اسے مختصر لفظوں
میں سارے واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد فوراً" بے بے کو ساتھ لے کر یہاں سے ہٹ
جانے کو کہا۔ اسے علم تھا کہ جلد یا بدیر لالہ' میجر رام سنگھ کے انتقام کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔
کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر اس نے فی الحال زہراں اور چاچی کا پتہ بتانے سے
معذرت کی' لیکن اس بات کا وعدہ بھی کر لیا کہ وہ مناسب موقعے پر اسے زہراں سے ملا دے
گا۔ وقت کی کمی کا احساس لالہ کو دلا کر وہ رخصت ہو گیا۔

صبح بستی والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لالہ اور بے بے بھی گھر سے غائب
ہیں——!

سجاول خان

مہلو پریشان تھا۔ جانے سے آدھا دن باہر نکلا تھا۔ اس نے اس بات کا یقین کرنا چاہا کہ آنے جانے والوں کی نظروں سے بچا رہے۔

——شیرو کی ماں کے بدلے اس کی بھتیجی نے میجر رام سنگھ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے سے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ دراصل اس نے زہراں کو چاچی کی تحویل سے تھے کے عتاب سے محفوظ کر لیا تھا ورنہ تو پچھلے دو تین سال سے جب سے وہ رام سنگھ سے ساتھ کام کر رہا تھا' اس نے بخوبی اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ ہاتھی کی صورت میں رام تھے کی حالت زخمی سانپ کی سی ہو جاتی ہے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اپنی بیٹی کمالا کے مسکراتے چہرے پر پڑی جو اسے دیکھتے ہی "چاچی" کا نعرہ لگا کر اس سے چمٹ گئی تھی۔

"خیریت بیٹی؟" مہلو پریشان نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بنتے ہوئے کہا۔

"چاچی" کمالا سسک پڑی۔ "زہراں غائب ہے۔ کہاں چلی گئی وہ؟"

"ارے واہ اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ کہیں چلی گئی ہو گی۔ آ جائے گی۔" مہلو نے کمال مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

کمالا بضد رہی کہ وہ خود اسے تلاش کرے۔ اسے مطمئن کرنے کے لیے مہلو اپنی بیٹی کے ساتھ لالہ کے ہاں گیا اور اس سے بہت زیادہ ہمدردی کا اظہار کرنے کے بعد اسے یقین دلایا کہ زہراں کی تلاش میں وہ زمین آسمان ایک کر دے گا۔ کمالا اپنے مکار باپ کی یقین دہانی پر قدرے مطمئن سی ہو گئی' لیکن مہلو کے لاکھ اصرار کرنے پر بھی اس نے رات کا کھانا نہ کھایا۔

"جب تک زہراں نہیں آ جاتی میں "جل بھوجن" نہیں کروں گی۔" اپنی ماں کے اصرار پر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور اپنے سونے کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

HBC

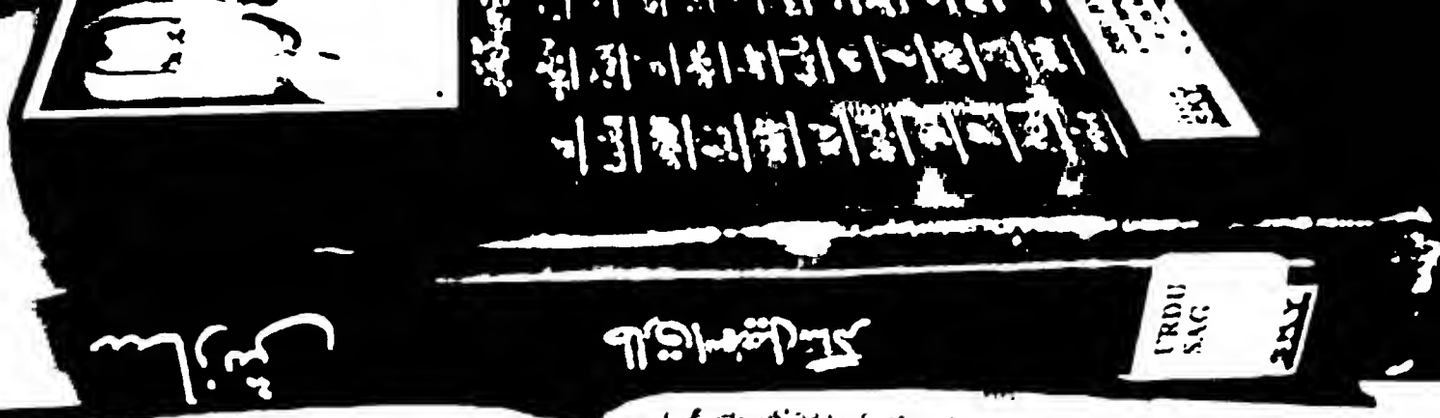

URDU SAG

☆○☆

رات کے تیسرے پہر وہ تینوں اس محلے کے باہر کھڑے اصیب کے منتظر تھے جس کے ایک مکان میں صلاح پرشاد آنے والی قیامت سے بے خبر شراب کے نشے میں مدہوش گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ انہیں اس بات کے ڈراؤنے خواب کے پیچھے کھڑے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے جب ایک مکان کی دیوار سے ٹپکا ایک سایہ لمحوں کی سست رفتار کو مات دیتا دبے پاؤں ——— شرفو کی گرفت پستول پر مضبوط ہو گئی۔

"حسین خان!" آنے والے کی سرگوشی نے انہیں مطمئن کر دیا۔

حسین خان آگے بڑھ آیا۔ اصیب نے اس کے کان سے منہ لگا کر اسے کچھ سمجھایا۔ اس کی باتوں پر کبھی تو حسین خان سر ہلانے لگتا اور کبھی سر کو سوال بن جاتا۔

چند منٹ بعد وہ تینوں اصیب کی سربراہی میں صلاح پرشاد کے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تینوں ایک دوسرے کے بعد مکان کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے۔ حسین خان سب سے آگے تھا' دونوں اس کے پیچھے۔

اب وہ کمروں کی دو رویہ قطار کے سامنے کھڑے تھے۔ شرفو کو اس گھر کے ایک ایک کمرے سے آشنائی تھی۔ اس کا بچپن اس حویلی میں کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ حسین خان نے کھلاڑی بردار کو دروازے پر کھڑا کیا۔ شرفو اس کے اشارے پر زنان خانے کی طرف بڑھ گیا جب کہ وہ خود چند سیکنڈ کے بعد صلاح پرشاد کے سر پر رائفل تانے کھڑا تھا۔

"کہ ..... کہ ..... کون ہو تم؟" خوف اور دہشت سے صلاح پرشاد کو اپنے سر سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆○☆

حسین خان نے ایک مرتبہ پھر ہیبت کے پہلے ہی وار میں اوسان کرلیں کو اس کی طاقت اس نے کمزور لمحے میں لپیٹ کر اس طرح کندھے پر رکھ لی تھی کہ اس کی

"اشرف خان" اس نے اپنے پہلو میں کمزور لوہار کو مخاطب کیا۔ "اصولاً مجھے تمہیں اس کام میں نہیں لے جانا چاہیے تھا کیونکہ تم ابھی زیادہ تجربہ کار نہیں ہوئے' لیکن اس وقت کے پیش نظر کہ تم کیس اپنے دوست کی موت کا انتقام نہ لے سکنے کی وجہ سے احساس عمر بھی کا شکار نہ ہو جاؤ' میں نے تمہیں ساتھ لے لیا ہے۔ ہاں ——— ! تم صرف ایک بات یاد رکھنا کہ ہمارا مقابلہ دنیا کے "خبیث ترین انسانوں" میجر رام سنگھ اور صلاح پرشاد سے ہے۔ ذرا سی غلطی بھی ہم سب کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔"

"آپ ہم میں سے کسی ایک کی غلطی نہیں ہونے دیں گے۔" اشرف خان نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ پستول اس نے بھی اپنے جسم سے باندھ رکھا تھا' لیکن اس طرح کہ ضرورت پڑنے پر اسے فوراً استعمال میں لا سکتا تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی اس لمحے سے پہلے تک اس کے پاس نہیں تھا' وہ صرف کلہاڑی اٹھائے ہوئے تھا۔

اب وہ تینوں میر ولی اور ان کے دوسرے ساتھی انہیں پہاڑی راستوں کے اختتام رخصت کرنے آئے تھے۔ روانگی سے پہلے میر ولی نے حسین خان کو مخاطب کر کے کہا تھا "لیکن ایک بات یاد رکھنا اس طرف واپس نہ آنا۔ ہم صرف تمہارے منع کرنے پر رکے رہے ہیں ورنہ ہمارے دل میں تو ہم ابھی کسی بھی لمحے وہ لال نہیں جانا کہ سدھنوں کی غیرت کو للکار کر یوں

جب ملک [illegible] نے [illegible] اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے کہا

HBC

[illegible] کے [illegible] بہرام گور [illegible] کے [illegible] کے [illegible] کے

HBC

اس پر تن کرا قلعہ بھر اس نے دونوں ہاتھوں کو سلاخیں اکٹھا کر کے دیکھا اس کے بعد
دونوں ہاتھوں نے دو شاخوں میں اتنی جگہ بنا دی تھی جس میں سے شیرو بھی بخوبی
آسانی سے گزر سکے۔ اس کے ساتھ ہی ایک رسہ اندر آیا جس کا ایک سرا دیوار سے بھی
لٹک رہا تھا اور دوسرا باہر۔

شیرو نے دھڑکتے دل سے رسے کو پکڑا تاکہ اس کے سہارے دیوار پر چڑھ کر
روشندان تک پہنچ سکے' لیکن ابھی اس نے پہلا ہی قدم بڑھایا تھا کہ اس کی نظریں سامنے
تنیں --- پہرے دار کی برچھ کی روشنی اسے دروازے کے باہر ترائی میں کھائی سے نمودار
ہوتی تھی۔

شیرو ایک وقت دو باتوں کا شکار تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باہر والوں کو اس
بات کی اطلاع کیسے دے کہ وہ رسی باہر پھینک لیں اور دوسری طرف وہ پہرے دار کے دہانے
پہنچنے سے پہلے باہر کود جانا چاہتا تھا۔ عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا وہ۔

پہرے دار کی برچھ کی روشنی اس کے سامنے والی دیوار پر لرز رہی تھی' پھر یک بیک
روشنی غائب ہو گئی۔ شیرو نے اطمینان کا سانس لیا کیوں کہ اب پہرے دار کے قدموں کی
آواز بھی دور ہی دور بھتی جا رہی تھی --- اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔ اس
نے اپنے جسم پر لپٹے پیٹروں سے دونوں ہاتھ پونچھے اور رسی کی طرف لپکا۔

--- اس کی جسمانی حالت قطعی اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ وہ رسی کے سہارے
دیوار میں بنے روشندان تک پہنچ سکتا' لیکن اس لمحے نہ جانے کہاں سے اتنی توانائی اس میں
عود کر آئی کہ اس نے دونوں ہاتھوں سے بڑی مضبوطی کے ساتھ رسی کو تھاما اور دیوار پر
پاؤں ٹیکتا روشندان کی طرف لپکا اور ابھی وہ بمشکل دو تین فٹ ہی اوپر پہنچا تھا کہ اس کے
ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ اسے اپنی کمزوری پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ تاہم رسی کو
ہاتھوں سے پکڑے ہوئے اس نے دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور دوبارہ ہمت کر کے اوپر کی
سمت سرکنے لگا۔ روشندان کے نزدیک اچانک ایک ہاتھ دست سکندری کی طرح نمودار ہوا
اور کسی نے اندر جھکتے ہوئے دوسرا ہاتھ بھی مدد کے لیے اس کی طرف بڑھا دیا۔

شیرو نادم ہونے لگا تھا۔ اس لیے اس نے اس تائید غیبی کو اپنی خوش بختی جانا اور کسی
کی طرح اپنے دونوں ہاتھ اندر لپکتے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں دے دیئے جنہوں نے
اسے اوپر کھینچنا شروع کر دیا۔ دیوار سے رگڑ کھاتا وہ اب روشندان تک پہنچ گیا تھا جس کی کوہ
میں اس کی مدد کو آنے والے نے نکل کر اس کے باہر نکلنے کے لیے راستہ بنا دیا تھا۔

وہ ہرے بھرے کھیتوں سے ہوتا ہوا اس پہاڑی سلسلے تک پہنچا تھا جہاں اس نے
ہوں اندر چھپے ہوئے سپاہیوں کو دیکھا تھا۔ وہ سپاہی اب وہاں نہیں تھے۔
کی بندوقیں سپاہیوں سے چھین کر وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

شیرو کو توقع تھی کہ وہ لوگ اس سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو چکے ہوں گے۔
وہاں کے پاؤں زمین سے لگتے ہی اس کا اندازہ کہ وہ لوگ ابھی ایک گھنٹہ پہلے وہاں سے گئے ہیں۔
اس کے پاؤں سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے انجام کی تکمیل کرنے والے اپنے ساتھی کو
شیرو کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے انجام کی تکمیل کرنے والے اپنے ساتھی کو
تھا کہ اسی شخص نے اسے قید سے رہائی دلائی ہے' لیکن اس کا ارادہ یا پروگرام کیا تھا۔
ظاہر تھا شیرو ایک طرح سے اس کے ساتھ گھسٹ تی رہا تھا۔ راستے میں جب اس نے ایک
مرتبہ اس کا نام جاننا چاہا تو نوواردو نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔
اب وہ لوگ تھانے سے قریباً آدھ میل دور پہنچ چکے تھے۔

"فی الحال خاموشی سے میرے ساتھ چلتے آؤ۔" نوواردو نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

شیرو چونکا۔ اسے یوں لگا جیسے اس سے پہلے بھی اس نے کہیں یہ آواز سنی ہے' لیکن
کہاں؟ اسے یاد نہ آ سکا۔

"کیا تم حسین خان کے ساتھی ہو؟" اس نے چلتے چلتے ہانپتے ہوئے نوواردو سے پوچھا
کیونکہ تیز چلنے سے اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔

"جلد ہی تمہیں تمام سوالات کا جواب مل جائے گا۔" نقاب پوش نے اس کی طرف
دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

اب وہ لوگ اس پہاڑی سلسلے میں داخل ہو رہے تھے جو تھانے سے تقریباً دو ڈھائی
میل دور واقع تھا اور جس کے چاروں اطراف گھنا اور گنجان جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جنگل میں کچھ
دور جانے کے بعد شیرو بے دم سا ہو گیا اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے
قدم من من کے ہو رہے تھے۔ "مجھ سے اور نہیں چلا جائے گا۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اٹھو۔ شاباش! ہمت کرو۔ تھوڑی دور اور چلنا ہے۔" نقاب پوش نے اس کی ہمت
بندھائی۔

شیرو نے درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہونا چاہا لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اسے
اپنی بزدلی پر غصہ تو بہت آیا' لیکن وہ بمشکل چند قدم چلنے کے بعد لڑکھڑا کر گر پڑا۔

HBC

زوار۔ جب چاند نے اسے زمین پر اتارا تو اس نے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ بار بار گر پڑتا تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ اپنے قدموں پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ابھی گر پڑے گا۔ چاند نے اسے سہارا دے کر اپنے بازو سے لگا لیا اور چند لمحے اسے اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ پھر اس کی بغل میں ہاتھ دے کر اسے سہارے سے آگے اچھالا اور چند لمحے بعد وہ بھی اس کے برابر آ گیا۔ اس کے بعد اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دونوں ایک اجنبی منطقہ اور قدرتی غار کے کنارے سے ہوا میں اڑتے ہوئے ایک بلند چٹان کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ چٹان بھی ایک پہاڑی سلسلے می

HBC

[illegible] کی طرف دیکھا۔ [illegible]
[illegible] کے ہاتھ سے [illegible]
[illegible] ہوئے [illegible]
[illegible] صادق بھی!" [illegible]
[illegible] ہاتھ پر [illegible]
[illegible] شیرو بھاگ گیا صادق بھی!" منوہر لال نے [illegible]
[illegible] ہوئے کہا۔
[illegible] "ہاں!" رام سنگھ نے پوری قوت سے ہاتھ میں پکڑا ہوا اس کے [illegible]
[illegible]

منوہر لال نے حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے اس کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ اسے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو' میجر رام سنگھ نے اسے دو تین ہیوی گھونسے مکتے ہوئے مزید رسید کر دیئے۔ احساس ذلت اور غصے نے چھوٹے تھانیدار منوہر لال کو بھی پاگل کر دیا۔

"پاگل ---- پنجی!!" وہ غصے سے چلاتا ہوا باہر دوڑ پڑا۔

رام سنگھ نے پہلے تو اس کے پیچھے دوڑ لگائی' لیکن چند قدم دوڑ کر ہی رک گیا۔ اسے اپنی بیوقوفی کا احساس ہو گیا تھا اور اب اس نے شیرو کی کوٹھڑی کا رخ کیا۔

جب وہ اپنے پہرے داروں کی معیت میں شیرو کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچا تو روشندان کے راستے نکلا ہوا سر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ کوٹھڑی کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا اور گارڈ کے سامنے انسپکٹر میر اور اس کے ساتھی ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑے تھے۔

"کھولو اسے کمبخت۔" اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پا رکھا تھا۔

انسپکٹر میر کے اشارے پر ایک سپاہی آگے بڑھا اور اس نے ہاتھ میں پکڑے چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی نکال کر کانپتے ہاتھوں سے کوٹھڑی کا تالا کھولا۔ سب سے پہلے ہو

ہم کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ اس نے بیل بیل اگرمیں سے بنایا گیا رسہ [illegible] کی طرف دیکھا۔ [illegible] ہوئے [illegible] ہوئے [illegible] ہوئے

کو جس نے اب دوسرے کی جان اختیار کر لی تھی۔ یہ بھی ہر مسلمان کا ہی بھائی تھا جو
اتحاد کر لیتے ایک۔ اگر یہ لوگ اسلحہ بند کر دیں تو ہم ان کو راشن اسلحہ
سرداریاں سب کچھ ان سے چھین لیں گے۔"

"لیکن نہیں ——!" کوئی بلند طاقت اسے مسلسل تسلیاں دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
درست کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ بڑی دور تک کشمیری مسلمانوں کے دل و دماغ میں پھیلی ہوئی
ہیں۔ بس یہ تو وقتی ابال ہے جیسے ہی ایک مرتبہ پھر وہ لوگ اپنی مکارانہ فریب کاریوں کا جال
لے کر ان کی طرف بڑھے، یہ سادہ لوح سے مسلمان دوبارہ اس میں پھنس جائیں گے۔ پھر
نہ کوئی مجاہد باقی رہے گا نہ آزادی کی تڑپ۔ ایک نہ ایک روز یہ تحریک ناکام ہو کر ختم ہو
جائے گی۔"

جیپ پونچھ چھاؤنی کے باہر آ کر ٹھہر گئی —— اسے پہچان کر ڈیوٹی پر موجود پہرہ
نے بیریئر اوپر اٹھا کر جیپ کو راستہ دے دیا۔ مجاہدین کے تحریک اور ریاست میں
مسلسل چھاپہ مار کارروائیوں نے مہاراجہ کے حکمرانوں کو خاصا چوکنا کر دیا تھا اور خصوصاً
پونچھ میں تو فوج نے زبردست حفاظتی اقدامات کیے ہوئے تھے۔ چھاؤنی کے نزدیک کسی کو
پھٹکنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ پچھلے آٹھ دس روز میں وہ پندرہ بیس مشتبہ شرپسندوں کو
گولیوں کا نشانہ بھی بنا چکے تھے اور چھاؤنی کے او۔سی کا حکم تھا کہ کسی فوق الفطرت کو بھی
شناخت حاصل کیے بغیر اندر داخل نہ ہونے دیا جائے، لیکن میجر رام سنگھ اس حکم سے مستثنیٰ
تھا۔ کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اسے روک کر اس کی شناخت دریافت کرتا۔

چھاؤنی کے داخلی دروازے کے ایک کونے میں بنے کمروں کے سامنے اس نے ڈرائیور
کو جیپ روکنے کا اشارہ کیا جہاں فوجیوں کے ہجوم میں اسے بوڑھے او۔سی ڈوگرے کا چہرہ
نمایاں نظر آیا۔

جیپ سے اتر کر وہ تیز رفتاری سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا او۔سی تک جا پہنچا۔ وہاں موجود
فوجیوں کا ہجوم اسے دیکھتے ہی چھٹ گیا تھا۔ او۔سی کے سامنے ایک سٹریچر پر لاش دھری تھی
جس پر سرخ کمبل ڈال کر اسے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ میجر رام سنگھ نے غیر اختیاری طور پر آگے
بڑھ کر اس کا چہرہ ننگا کیا تو ایک سنسناہٹ سی اس کے رگ و پے میں سما گئی اور برقی رو کی
تیزی سے اس کے دل و دماغ میں دوڑنے لگی۔

اس کے سامنے لالہ مہاویر پرشاد کی لاش دھری تھی۔ دل کے مقام پر صرف ایک
سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے بہنے والا خون اب کناروں پر جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ یوں لگتا تھا

کہ کسی باہر سے آنے والے نے بڑے اطمینان سے اس کے سینے کے بائیں جانب
رام سنگھ لاش کی طرف سے نظر ہٹا کر
صدمے کی شدت کی وجہ سے اب وہ
وہ ہاتھ کی ہے اسے اب وہ سمجھ گیا تھا
خارج ہونے والی ہلاکت خیز اس کے جسم میں داخل ہو کر اس کا
میجر رام سنگھ نے کسی معمول کی طرح رقعہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اسے
جانے کا احساس ہونے لگا تھا۔ "لاش ایک پونچھ والے نے دریافت کی تھی۔" اس کے
نے مڑ کر اسی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"جی؟ کہاں سے؟" رام سنگھ کو یہ تعین اخذ کرنے کے لیے اپنی قوت ارادی کو
بروئے کار لانا پڑا۔

"چھاؤنی کے نزدیک پہاڑی سلسلے میں ایک ویرانی جگہ پر لاش ملی تھی۔ قتل کا یہ طریقہ
اس کے سرہانے ایک پتھر کے نیچے رکھا ملا تھا۔ اس وقت تک ٹھوس وجہ نہیں معلوم ہو سکی تھی
اسے رات کے آخری پہر گولی ماری گئی ہے۔ میں نے فوراً دو مشتبہ شرپسندوں پر بلا روک ٹوک
پھیلا دی ہیں، لیکن ان کی طرف سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔"

"ہوں" میجر رام سنگھ نے لمبی سانس لی۔

وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر پلٹا اور بوجھل قدموں سے اپنی جیپ تک آ گیا۔ جیپ کے
بونٹ سے ٹیک لگا کر اس نے رقعہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

"رام سنگھ!

تمہارا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ آج جس انجام سے یہ بھیڑیا دوچار ہوا ہے، تم بھی بہت جلد اسی انجام کو پہنچنے والے ہو۔ تمہارے جرائم کی فہرست بھی اس کی طرح بہت لمبی ہے اور ہماری ہائی کمان نے تمہارے لیے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا ہے۔ کل تک اگر تم نے آزادی کشمیر کے جرم میں گرفتار شدہ تمام مظلوموں کو رہا نہ کیا تو اپنے بھیانک انجام کو پہنچو گے۔ مجاہدین کی رہائی کی صورت میں ہم تمہیں پونچھ سے بحفاظت نکل جانے کا موقع فراہم کر دیں گے دوسری صورت میں یاد رکھنا، پونچھ تمہارے لیے موت کا

بلیغار

[illegible] کی ایک تاریخ

[illegible] برطانوی ایجنسیوں کے تعاون سے دلی میں مسلمانوں کی [illegible] کے [illegible] کی پانچ کالونیوں میں سوچ بچار کے بعد [illegible] کے [illegible] کے [illegible] کے

HBC

سازش

[illegible] کی [illegible] کی [illegible]
[illegible] کی [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible]

اور ہی اس ہلے کی تیاری کے لیے نکلی تھی کہ عقب سے مجاہدوں کی مدد کو آ
جیپ لگ سے پہلے ہی بگ کمانڈر صرگ مسلم خوشی کے لیے خاصی تعداد میں
کا کار جارحی فوج کے افسران کی اس لالچ میں ان کا شاہ کو ہلاک کرنا چاہتی تھی۔
اکثر جارحیت کا خواب پورا کرنا چاہتی تھی۔

مجاہدین کے حملوں سے اتنا خوفزدہ تھا کہ وہ اسنگ سے اس معرکے دوران
ہلہ ہی شہ کرنا رہا تھا۔ قریباً تین گھنٹے کی گرما گرم بحث کے بعد صرگ مجاہدوں
درخواست بھیج دی۔ جنرل نے بگ کمانڈر کے مطابق مجاہدوں نے جارحیت سے باہر نکلنے
کے خلاف فوری مدد کی درخواست کی تھی۔

مجاہدین اپنے بچنے میں لیے بگ کمانڈر صرگ علی الصبح پالم پور کی طرف روانہ ہو
تھا جبکہ اس کی واپسی کا انکار شدت سے کر رہا تھا۔

☆○☆

جہاں اور شیرو بہادری کی ایک قدرتی اوٹ میں کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔

"آپ کھل کر سامنے کیوں نہیں آتے؟" شیرو نے پریشان ہو کر جہاں سے پوچھا۔

یہ اطلاع اس کے لیے بڑی چکرا دینے والی تھی کہ جہاں کا تعلق کسی بھی گروہ سے
نہیں اور صرف اپنی انفرادی کوششوں سے شیرو' اس کی ماں' زبراں اور اس کے باپ کو بگ
رام سنگھ کے خلافانہ شکنجے سے نکال لایا ہے۔

"ابھی وقت نہیں آیا برخوردار۔" جہاں نے حسب معمول اسے ٹالنا چاہا۔

"کیوں؟"

"تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ دیکھو شیرو میں تمہیں واپس جانے سے قبل یہ
مگر میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔۔۔۔ ایک مسلمان اور کشمیری ہونے کے ناطے
میرا فرض تھا کہ میں اپنے کشمیر کے لیے لڑنے والے ایک مجاہد کو جس کے باپ نے اپنی
مقدس سرزمین کی آزادی کے لیے جان کا نذرانہ دیا تھا' دشمن کی قید سے رہا کروانا اور
کشمیر کی عزت۔۔۔۔ اس کی مگیتر اور ماں کو دشمن کے ناپاک ارادوں سے بچانا
رکھوں۔۔ اور اگر تم اسے نیکی یا احسان سمجھتے ہو تو میری ایک درخواست ہے کہ اپنی کی
اپنے متعلق کچھ نہ بتانا۔"

"میں آپ کی بات میں پوشیدہ مصلحت کو کو کہ سمجھ نہیں پایا' لیکن آپ کے جذبات
مدنظر رکھتے ہوئے آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس راز کو راز ہی رکھوں گا۔ اس وقت تک

[illegible]

جہاں ہلکی ہلکی باتیں ہو رہی تھیں' شیرو کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ وہ
جہاں کی گود میں سر رکھ کر سو گیا۔

جہاں نے دیکھا' نوجوان شیرو کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی تھی۔

"ادھر آؤ۔" اس نے شیرو کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دوسرے کے پیچھے پہاڑی سلسلے سے منسلک کچھ پگڈنڈیوں کے اندر داخل ہو
میل تک چلتے چلے گئے۔ ایک جگہ پہنچ کر جہاں کچھ درختوں سے سورج کی شعاعیں بمشکل
گزر کر زمین تک پہنچ سکتی تھیں' جہاں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اپنے کندھے پر رکھی
کدال سے اس نے ایک درخت کے تنے کے ساتھ تھوڑی سی کھدائی کی اور ایک تھیلا باہر
نکال لیا۔ تھیلا خاصا وزنی تھا۔ شیرو کو اس کی مدد کے لیے آنا پڑا۔ حیرت سے وہ ان سارے
مناظر کو ذہن میں محفوظ کر رہا تھا۔

جب جہاں نے تھیلے کا مضبوطی سے بندھا ہوا منہ کھولا تو شیرو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ
رہا۔ تھیلے میں موجود دو اسٹین گنیں اور کچھ رائفلز نکال کر جہاں نے شیرو کو تھما دیں اور
تھیلے کا منہ اسی طرح مضبوطی سے باندھ کر اسے زمین میں دفن کر کے مٹی برابر کر دی۔ بہت
احتیاط اس نے خاصی گھاس پھونس اور درختوں کے پتے اس پر ڈال دیئے تھے۔ کون تو یہاں
بھی کسی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' لیکن اگر کوئی آ بھی جاتا تو اسے شک کرنے
کی گنجائش میسر نہ تھی۔

"شیرو!" جہاں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کیا۔ "ہم لوگ ایک ایسی

رہائی سے پہلے بنّی اسے چند لمحے کی تنہائی زہراں کے ساتھ میسر آ گئی تھی
زہراں وہاں سے اٹھ کر قریبی احاطہ میں ایک چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی
انکھیں خالی تھی۔
شیرو اسے قدموں چلتا ہوا اس کے پیچھے اس طرح آن کھڑا ہوا کہ
اس کی نظر تک نہ ہوئی۔ بنّی نے اس کی لاشعوری حرکت سے محظوظ ہوتے ہوئے
اپنے پیچھے کھڑا پایا۔ جانے وہ کب سے اس کے ساتھ بڑے انہماک سے
پتھروں پر سے پھسلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔
"آپ ۔۔۔" وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔
"ہاں میں ہوں زہراں۔ اچھا ہوا تم اس طرف آ گئیں۔ مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔"
جواب میں زہراں سوائے اپنی چادر کے پلو سے انگلی سلجھانے کے اور کچھ نہ کر سکی۔
"زہراں میرے پاس کہنے کے لیے بڑی باتیں ہیں۔ جب میں تفتیش کاٹ رہا تھا
وطن مجھے وطنوں کی اذیت برداشت کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے کوٹھری میں بھیج
دیا کرتا تھا تو میرے پاس خود کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بڑی دلیل موجود تھی کہ
سب کچھ مجھے وطن کی آزادی کے لیے برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔
لیکن مجھے چند لمحوں کے لیے اگر پرسکون پناہ میسر آئی تھی تو صرف تمہاری یاد میں کہ
تمہارا جیالا پیکر میرے لاشعور میں رچا ہوا تھا۔ تب میں تمہاری قربت کی حسین مہک کو محسوس
کیا کرتا تھا۔
۔۔۔ آج میں سوچتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ مجھے تمہارے ساتھ بتائے ہوئے
قیامت کی خبر ہو جاتی تو میں شاید کبھی نہ سنبھل پاتا۔ زہراں! میں آج جس راستے پر گامزن
ہوا ہوں' یہ کوئی نیا راستہ نہیں۔ میرے باپ نے انگلی پکڑ کر مجھے بچپن ہی میں ان راہوں پر
چلنا سکھا دیا تھا۔ آج جب ان کی قربانیاں رنگ لا رہی ہیں اور ساری وادی کے سپوت اور
وطن کی آزادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو ان کی روح کتنی خوش ہو گی۔ خدانخواستہ اگر
میں موت کی اس شاہراہ پر قدم نہ رکھتا تو شاید کبھی روزِ قیامت اپنے باپ سے آنکھیں نہ ملا
سکتا۔ زہراں! میرے پاس وقت کم ہے۔ حالات نے ہمیں ایسے رشتے میں باندھ دیا ہے جس
سے مفر نہیں اور اگر کبھی اس راہِ آزادی میں میری شہادت کی خبر آ جائے تو ان جیالی
بیٹیوں کی طرح جو زندگی بھر کنواری بیٹھی رہتی ہیں' اپنی زندگی ضائع نہ کر دینا اور نہ ہی

اس نے بنّی کی پیٹھ تھپک کر اسے خود سے الگ کیا۔ "ہٹ پگلی نہ ہو تو ۔۔۔!"
الہ' بنّی کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا اور زہراں سامنے والی پگڈنڈی پر
جاتے اس مسافر پر نظریں جمائے کھڑی تھی جو اسے جدائی کے نئے جذبوں سے آشنائی بخش کر
پلٹا کر اس کی حد نگاہ سے دور ہی دور ہٹتا چلا جا رہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹ کپکپائے اور
آنکھوں میں تیرتی نمی بوند بوند گالوں پر پھسلنے لگی۔
"خدایا! میرے شیرو کو اپنی امان میں رکھنا ۔۔۔!"

موت کی شاہراہ

وہ اٹھائیسویں چاند کی راتیں تھیں۔

رات کے دوسرے پہر جب چاند کشمیر کی سربفلک پہاڑیوں کے عقب میں ڈوبنے جا رہا تھا، شیرو اپنا منہ سر کمبل میں چھپائے ہوئے شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں ایسا راستہ اپنایا تھا جس پر کسی فوجی یا کسی پولیس پارٹی سے اس کی مڈبھیڑ نہ ہونے کے برابر تھی ——— اس کے زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔ لیکن تین چار روز سے زیادہ لاپتہ لوگوں کی طرح لیٹے رہنا اس کی فطرت نے گوارا نہ کیا۔ جاول نے خدا جانے کہاں سے جڑی بوٹیاں لا کر اس کے زخموں پر لگائیں جنہوں نے جادو کا اثر دکھایا تھا۔ وہ دن رات میں دو مرتبہ ان لوگوں کی خبر لینے آتا اور ان سب کی خدمت میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ جانے کہاں سے وہ ان کے لیے اتنا گھی اور دودھ لے آیا تھا۔

یہ سارا شہر اور اس کی گلیاں محلے شیرو کے دیکھے بھالے تھے، لیکن آج نہ جانے کیوں وہ خود کو یہاں سے گزرتے ہوئے اجنبی سا محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے ہی گھر پر ڈاکہ ڈالنے جا رہا ہو۔ چلتے چلتے اچانک وہ ٹھٹک کر رک گیا ——— مخالف سمت سے اسے ٹارچ کی روشنی اپنی سمت لپکتی دکھائی دی۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی شیرو کے جسم میں برقی رو دوڑنے لگی۔ وہ بغیر آواز پیدا کیے پھرتی سے ایک نیلے کی اوٹ میں ہو گیا جہاں وہ ان لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ آستین گن پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور اس نے گن سیدھی کر کے اس سمت اندھیرے میں نظریں گاڑھی ہوئی تھیں جس طرف سے اب بہت سے قدموں کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ اس کی حس سماعت پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی تھی۔

اچانک وہ سہم کر رہ گیا۔ ایسے ہی قدموں کی آواز اس کے عقب سے بھی آنی شروع ہو گئی تھی۔ شاید یہاں پہنچ کر دونوں پارٹیوں نے آپس میں رابطہ قائم کرنا تھا اور سوئے اتفاق

ے۔۔ ان ۔۔وں ہزار پارٹیوں کے بین الاقوامی میں بھس کر وہ گیا تھا۔ لیکن
صورتِ نہیں ہا تو۔۔ خاموشی سے آنے والوں کا لقمہ بن جانے یا مقابلے والوں سے
ہونے سے پہلے ہی سامنے کی سمت اچانک فائرنگ کر کے خلاء پیدا کرنے اور بھاگ
۔۔۔اس کے سامنے پھیلا پہاڑی سلسلہ بھی اپنا دامن پھیلائے اسے سمیٹ لینے
بالکل تیار تھا اور اس سلسلے میں یہاں سے بمشکل ڈیڑھ دو میل دور گھنے جنگل میں اس کے
ساتھی چھپے ہوئے تھے۔

ایک ایک لمحہ اس پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ جلد ہی شیرو ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے
بھی سے لقمہ اجل بننے کی بجائے بلاروں کی طرح موت سے ٹکرا جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
۔۔۔ابھی تک سامنے سے آنے والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ شیرو پیچھے کی طرف
سے اضافہ اور جھکتے ہوئے قریباً بھاگ کر اسی ٹیلے کی نکڑ پر پہنچ گیا جس کے پہلو سے پگڈنڈی
پارٹی کو نمودار ہونا تھا۔ ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی سب مشین گن کو
سنبھالا۔ ابھی اس نے اسٹین گن سیدھی ہی کی تھی کہ روشنی کی ایک لکیر اس سے بمشکل دو
تین گز دور ریتیلی نظر آئی۔ اس کے ساتھ کسی کے اونچا اونچا بولنے کی آواز بھی سنائی دی۔
آنے والے مجاہدین کو گالیاں دے رہے تھے جنہوں نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر
رکھی تھی اور انہیں اپنے بستروں سے اٹھ کر کشمیر کی جان لیوا خنکی ہوئی راتوں کے
حوالے کر دیا تھا۔۔۔ شیرو کی انگلی ٹریگر پر جم کر رہ گئی۔ تربیت یافتہ فوجیوں کی طرح اس
نے قریباً جھکتے ہوئے ایڈوانس کرنے کی پوزیشن بنائی اور نظریں ادھر جما دیں۔ اس کے
عقب میں آنے والی آوازیں بھی اب نمایاں ہونے لگی تھیں، پھر سب جیسے گڈمڈ ہو کر
گئیں۔ دو پولیس والے جنہوں نے رائفلیں اپنے کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں، سامنے سے
نمودار ہوئے۔ دونوں کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے جب اچانک ان کے قہقہوں نے موت
کی چیخوں کا روپ اختیار کر لیا۔ شیرو کی اسٹین گن کی لال سرخ زبان باہر نکلی اور الیس
چاٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ آگے کی سمت بھاگا۔

محض پندرہ بیس قدم بھاگ کر اس نے ایک ٹیلے کی اوٹ میں چھلانگ لگائی اور کندھے
سے اسٹین گن لگا کر اس کا رخ مرنے والوں کے ان تین ساتھیوں کی طرف کر دیا، جنہیں
اچانک پیش آمدہ صورت حال نے حیرت زدہ کر دیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے گلے میں
لٹکی رائفلوں کو اتار کر فائر کرتے وہ بھی شیرو کی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔

اچانک فائرنگ اور مرتے ہوئے سپاہیوں کی دلدوز چیخوں نے آنے والوں کو خبردار کیا تھا۔ وہ

تاہم اگر فوجیوں کا کوئی ایمان تھا تو یہ تھا کہ انہوں نے کبھی میدان نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اگر
بھی حملے کے مقابلے اور پیچھے ہٹنے میں فرق نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے تو صرف یہ سنا تھا کہ
بھی تھیں۔ شیرو نے پہلے تو چاہا تھا کہ وہ رک کر مرنے والوں کی رائفلیں اٹھا لے، لیکن اس
فی الحال فوراً بھاگنا چاہئے۔ یہاں ایک لمحے کا توقف بھی اس کی جان لے سکتا تھا۔ ٹیلے کی
اوٹ میں وہ بیٹھا وہ پہاڑی سلسلے کی طرف بھاگ اٹھا۔

اچانک اس کے عقب میں کسی طاقتور ٹارچ کی روشنی ابھری اور اگلے وہ اپنے کسی لاشعور میں
حمل کے نتیجہ وہ کریک لائٹ سائٹ والی گھنی جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دیتا تو شاید
روشنی کے تعاقب میں چلنے والی درجنوں گولیوں میں سے کئی گولیاں اس کے جسم میں پیوست
ہو روشندان بنا دیتیں۔

فائرنگ کی آواز سے اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس کا مقابلہ پولیس کی ریزرو سے
بھری ہوئی بھیڑوں سے نہیں، ڈوگرہ فوجی دستے کے خون آشام بھیڑیوں سے ہے۔ شیرو اپنی
سے چیتا اپنی کمینیوں کے بل بڑی تیز رفتاری سے پہاڑی سلسلے کی طرف رینگ رہا تھا اور ہر
اس نے اپنے عمل میں تیزی پیدا کرنے کے لیے لوتھیں لگنی شروع کر دیں۔

لڑھکنیاں لگاتا اب وہ پہاڑی سلسلے میں پہنچ کر قدرے محفوظ ہو چکا تھا۔ اس نے زمین
سے اٹھ کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے اپنی سمت یلغار کرتے ڈوگرہ فوجیوں کا جائزہ لیا اور
ایک جگہ رک کر اطمینان سے ان کی سمت فائرنگ کرتے ہوئے گن کی میگزین خالی کر دی۔
وہ ڈوگرہ فوجیوں کو جو کسی کارنامے کی توقع پر سیدھے اس کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے،
شیرو نے الٹ کر گرتے اور زمین چاٹتے دیکھا اور بھاگ اٹھا۔ اس نے دوسری میگزین بھاگتے
ہوئے ہی گن میں فٹ کی تھی۔

☆○☆

اب وہ پہاڑی سلسلے کے اندر ہی اندر بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

۔۔۔اپنے تعاقب میں آنے والی گولیاں اور گالیاں اسے بخوبی سنائی دے رہی تھیں،
لیکن جس علاقے میں وہ پہنچ چکا تھا وہاں تو دن کے اجالے میں بھی فوج کی پوری بٹالین اسے
ڈھونڈنے میں ناکام رہتی۔

میجر رام سنگھ کی ظالمانہ تفتیش نے اس کے جسم سے خاصی توانائی نچوڑ لی تھی لہٰذا یوں
بھی بھاگتے بھاگتے اب اس کا سانس قدرے پھولنے لگا، لیکن اس نے تھکاوٹ یا کمزوری کے
اس احساس کو خود پر غالب آنے کا موقع نہ دیا اور اس علاقے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں

اسے اپنے ساتھیوں کی مدد ملنے کی توقع تھی۔

اسلئے تو اب اس کے تعاقب میں آنے والے فوجیوں کو لوٹ جانا پڑا تھا۔ پہنچ تھا کہ ان پہاڑیوں میں ایک مرتبہ گم جانے کے بعد ان کے یہاں سے واپسی کے امکانات معدوم ہو جاتے تھے' لیکن ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور وہ شیرو کے تعاقب میں گولیاں چلاتے ہوئے آ رہے تھے ـــــ فائرنگ کی آواز تو حسین خان اور اس کے ساتھیوں تک کبھی کی پہنچ رہی تھی' لیکن فائرنگ کرنے والے انہیں اب نظر آئے تھے۔ وہ لوگ اپنی پناہ گاہ سے دو تین فرلانگ کی دوری پر یہاں بیٹھے ہوئے تھے تاکہ پیچھا کی جانب سے کیے جانے والے اچانک حملے کا منہ توڑ جواب دے سکیں۔ فائرنگ کی اس آواز نے انہیں چونکا دیا ـــــ!

پہلے انہیں اونچائی سے ایک سایہ اپنی سمت بھاگتا نظر آیا' پھر اس کے تعاقب میں فائرنگ کرنے والوں کے بیولے نمایاں ہونے لگے۔ اس بات کا اندازہ تو انہیں بخوبی ہو چکا تھا کہ ایک شخص بھاگ رہا ہے اور اس کے تعاقب میں فائرنگ کی جا رہی ہے' لیکن جہانداد خان اور حسین خان کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ دشمن کی کوئی چال ہو اور وہ لوگ اس طرح "ڈرامہ" رچا کر اچانک ان کے سروں پر پہنچ جانا چاہتے ہوں۔

"اشرف خان" اس نے اپنے دائیں ہاتھ ایک پتھر کی اوٹ میں کھڑے شرفو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کیا۔ "تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیچے اترو اور اس بھاگنے والے کو گھیر کر پکڑنے کی کوشش کرو۔ اگر شک گزرے یا وہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرے تو اسے گولی مارنے میں بالکل دریغ نہ کرنا۔" اس نے شرفو کو ہدایات دیں۔

حسین خان کی بات مکمل ہوتے ہی شرفو کے ساتھ چار اور مجاہد پہاڑی کی ڈھلان سے نیچے اتر کر ان راستوں کی طرف بڑھنے لگے جہاں وہ شیرو کو باسانی گھیرے میں لے کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکتے تھے۔

"نصیب!" حسین خان نے اپنے ساتھ پیچھے دوسرے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "تم ولی کو جنگل کی طرف روانہ کر دو تاکہ وہ تمام لوگوں کو خبردار کرے' لیکن انہیں سختی سے ہدایت کر دے کہ میرے حکم کے بغیر ایک گولی بھی فائر نہ کی جائے۔ تم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میرے ساتھ ہی آؤ۔ ہمیں ان فوجیوں سے نمٹنا ہے۔"

نصیب اور اس کے پانچ راکٹل بردار ساتھی کمانڈر حسین خان کے پیچھے پیچھے پہاڑی سلسلے میں غائب ہو گئے جب کہ نور ولی تیزی سے جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اور ـــــ عین اسی لمحے شیرو نے اپنے ساتھیوں کی طرف پہاڑی سلسلوں سے دیکھے۔

ـــــ فائرنگ ایک دم بند ہو گئی تھی اور چند ہی لمحے بعد جانبین طرف سے ہونے لگی۔

ـــــ مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے اس کے ساتھیوں نے تعاقب میں آنے والے سارے کے سارے فوجیوں کو مار ڈالا تھا۔ اب وہ قدرے سکون سے پہاڑ پر چڑھ کر بھاگنے کی مہلت حاصل کر ـــــ اچانک ایک پہاڑی موڑ مڑتے ہوئے ایک راکٹل کی تھکاوٹ زدہ نظر اس کی زد پر آ گئی۔

"ہینڈز اپ!" کسی کی للکار گونجی۔

شیرو نے بڑے اطمینان سے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ اسے یقین تھا کہ یہ اسی کا کوئی ساتھی ہو گا۔

"اپنی گن نیچے پھینک دو اور میری طرف گھومو۔" دوسرا حکم ملا۔

"شرفو! کیوں میری گن کا نقصان کرواتے ہو۔ پہلے ہی بڑی مشکل سے ہاتھ لگی ہے۔" شیرو نے اپنے دوست کی آواز پہچان لی تھی۔

"شیرو ـــــ!" شرفو نے مسرت سے قہقہہ لگاتے ہوئے نعرہ لگایا اور راکٹل ایک طرف رکھ کر بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ اس کے منہ سے شیرو کا نام سنتے ہی اس کے ساتھی بھی وہاں اکٹھے ہو گئے اور سب باری باری شیرو سے بغلگیر ہو رہے تھے۔

شرفو شدت جذبات سے دو تین مرتبہ "شیرو! میرے یار! میرے بھائی ـــــ!" کہہ کر اس سے لپٹ چکا تھا اور وہ سب شیرو کو اپنے جلو میں لیے اپنی ایک مخصوص پناہ گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے ـــــ جہاں کمانڈر حسین خان بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔

☆○☆

بھارت کے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد اس بات کی پکی امید تھی کہ وہ فوراً اپنی افواج کشمیر روانہ کرے گا۔ مہاراجہ پچھلے دو تین ماہ سے ذہنی مریض بن کر رہ گیا تھا۔ آج بھی جب وہ مہر سنگھ کو رخصت کر کے واپس ہوا تو اچانک بوکھلا گیا' جب اس کے اے ڈی سی نے ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ قبائلی پٹھان بارہ مولا کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ڈوگرہ پلٹنیں ان کے لیے بھیڑوں کے ریوڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

"میرا خیال ہے ہمیں رات کے اندھیرے میں سری نگر سے نکل جانا چاہیے۔" اس نے مہارانی سے کہا۔

دونوں اپنی آرام دہ خواب گاہ میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے
مہاراجہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ مہارانی کو آلہ کار بنا کر اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کا محل سازشوں کا گڑھ بن چکا تھا اور اس سازشی ٹولے کا سرغنہ تھا ـــــ راج گرو!

راج گرو کی شخصیت خاصی پراسرار تھی۔ ایک روز وہ اچانک ہی ڈوگرہ محل میں پجاری رانی سے ٹکرا گیا جس کے بعد سے اسے رانی کے مندر کا خصوصی پروہت مقرر کر لیا گیا۔ اس بات کا علم کسی کو نہیں تھا کہ راج گرو کو کانگریس کے اس خاص طبقے کے لیڈروں کی مکمل پشت پناہی اور سازش کے ساتھ محل کی طرف روانہ کیا گیا تھا' جو ہمیشہ سے مسلمانوں کا دشمن رہا تھا۔

اس طبقے کے لیڈروں کو اس بات کا یقین تو ہو چکا تھا کہ کشمیر کے مسلمان کبھی بھارت کی غلامی میں رہنا پسند نہیں کریں گے۔ یوں بھی اصولاً" اور قانوناً" دونوں طرح سے کشمیر پاکستان کا حصہ تھا' لیکن جیتے جی وہ یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ راج گرو اپنی شیطانی ذہنیت سمیت ایک مذہبی رہنما کا لبادہ اوڑھ کر ڈوگرہ محل تک پہنچ گیا تاکہ مہاراجہ کے دل و دماغ، مہارانی کے ذریعے قابض ہو کر اس سے ہندو لیڈر شپ کے حسب خواہش احکامات جاری کروا سکے۔

روایتی ہندو گروؤں کی طرح راج گرو بھی خفیہ شیطانی قوتوں کا منبع تھا اور اس کی یہی شیطانیت اسے مہاراجہ کے زنان خانے تک لے گئی تھی۔ اس نے مہارانی کے ذہن کو اپنے حصار میں جکڑ رکھا تھا ـــــ کانگریس بابی کمان کے زیر ہدایت محض دو تین مہینوں میں اس نے رانی کے ذریعے کشمیر کی سیاست کو بالکل ہی نئے رخ پر ڈال دیا اور مہاراجہ سے اس کے خلاف مرضی اقدامات کروا دیئے۔

مہاراجہ ہری سنگھ کا وزیراعظم پنڈت رام چند کاک غیر متعصب ہندو تھا اور اس کی مسلمان افسران اور لیڈروں سے خاصی بے تکلفی تھی۔ اپنی سیاسی بصیرت کے بل بوتے پر اس نے مہاراجہ کو کشمیریوں کے سامنے بھی "غیر متعصب ڈوگرہ مہاراجہ" کے روپ میں پیش کیا ہوا تھا اور کئی سیاسی طوفان اپنے تدبر سے روک رکھے تھے۔

مسلمان افسران سے پنڈت کاک کی دوستی متعصب' ہندو لیڈروں کی نظروں میں' جو کشمیر و بھارت کا اٹوٹ انگ بنانا چاہتے تھے' بہت کھٹکتی تھی۔ انہوں نے پہلے بھی وزیراعظم پر ... مسلمان کی حمایت کرنے کا الزام عائد کیا' لیکن دال گلتی نظر نہ آئی تو رانی کے ذریعہ

مہاراجہ ہری سنگھ کے کان بھرنے جانے لگے۔
... کرو نے پہلی دو تین ملاقاتوں ہی میں رانی کو اپنا "گرو" کر لیا تھا اور وہ دن کا ... زیادہ حصہ گرو جی کے چرنوں میں ہی گزارا کرتی تھی۔ ایک روز روایت کے برعکس وہ رات کو ... بلی بن کر گرو جی کو وزیراعظم کشمیر رام چند کاک کے دست راست کرنل بخشی ... دارت سے بیدخل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ صدمہ ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ... لے جان لیوا تھا کہ اسے مہاراجہ کے حکم پر "پاکستان کی دریدہ دہنی" کے الزام میں گرفتار ... گرفتار کا مقدمہ قائم کر دیا گیا ہے۔

اب راستے کا پتھر ہٹ چکا تھا اور راج گرو کو کھل کھیلنے کے بھرپور مواقع حاصل تھے۔ اس نے اپنی چیلی کو خوب خوب استعمال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے راجہ کے گرد سے اس کے پرانے اور تجربہ کار ملازمین کو ہٹا کر مسلم دشمن اہلکاروں کا نیا حلقہ قائم کروا دیا گیا۔ یہ لوگ اٹھتے بیٹھتے اسے یہی مشورہ دیتے تھے کہ اگر اس کی نجات کی کوئی صورت ہے تو صرف بھارت سے الحاق میں۔ اسی دباؤ کے تحت مہاراجہ نے بھارت سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ گو وہ بعد میں بہت پچھتایا اور اپنے اس فعل کو "بابل پن" سے تشبیہ دی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مہاراجہ کو راج گرو نے یقین دلایا تھا کہ اس کی گدی قائم رہے گی اور کشمیر ایک علیحدہ اور آزاد ملک کی صورت میں اس کے زیر نگیں رہے گا۔ اب پروگرام کے دوسرے حصے پر عمل شروع ہوا ـــــ وہ تھا کشمیر میں بھارت کی مسلح افواج کا داخلہ' تاکہ وقت آنے پر وہ بزور اپنا فیصلہ منوا سکیں۔ ونگ کمانڈر مہر سنگھ کی آمد اسی منصوبے کا حصہ تھی اور وہ کامیاب و کامران لوٹا تھا۔

مہاراجہ کے ذہن پر پاکستانی حملہ آور اس بری طرح سے چھائے تھے کہ وہ ذہنی مریض بنا کر رہ گیا۔ اس روز جب اسے اے ڈی سی کے ذریعے قبائلی پٹھانوں کے سرپر پہنچنے کی اطلاع ملی تو وہ بالکل ہی دل چھوڑ گیا۔

"مہاراج جی!" رانی نے بڑے ناز و ادا سے اٹھلا کر اس کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک روز ہی کی تو بات ہے' گرو جی کہہ رہے تھے کہ "شبھ گھڑی" آیا ہی چاہتی ہے۔ بھارتی فوج کو ان کے حساب کے مطابق پرسوں تک پہنچ جانا چاہیے۔"

"جہنم میں گیا تمہارا گرو۔" مہاراجہ نے اسے جھٹک کر خود سے الگ کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ مہارانی نے پہلے تو آگے بڑھ کر اسے روکنا چاہا' لیکن اس کی آنکھوں میں ناچتے شعلے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

وہ رات مہاراجہ نے دہشت اور پریشانی کے ملے جلے جذبات کے تحت شراب نوشی اور چل قدمی کی نذر کر دی۔ علی الصبح جب اسے علم ہوا کہ سری نگر سے صرف دس میل کے فاصلے پر واقع بارہ مولا بھی قبائلی پٹھانوں نے فتح کر لیا ہے اور اب وہ لوگ سری نگر کی طرف تیزی سے ایڈوانس کر رہے ہیں تو اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے فوراً" اے ڈی سی کو طلب کیا۔

"جی سرکار!" اس نے ہاتھ باندھ دیئے۔

"فوراً" سفر کی تیاری کرو۔ ہم جموں جانا چاہتے ہیں۔" خود مہاراجہ کو اپنی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔

"لیکن مائی باپ....." اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"شٹ اپ! حکم کی فوری تعمیل ہو۔" مہاراجہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"جو حکم مہاراج!" اے ڈی سی سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

مہاراجہ کے کمرۂ خاص سے وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر نکلا تھا۔ اس کا سرخ راج گرو کے خصوصی آشرم کی طرف تھا۔ مندر سے پجاریوں کے پاٹھ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ بھجن کتھا اپنے عروج پر تھی' لیکن اے ڈی سی جانتا تھا کہ راج گرو ابھی بستر استراحت پر موجود ہو گا۔

گرو جی کے کمرے کے باہر کوئی پہرے دار بھی خلاف توقع موجود نہیں تھا۔ مہاراج کا یہ فیصلہ ایک بم کی طرح اے ڈی سی کے ذہن میں پھٹا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس لیے وہ سیدھا یہیں چلا آیا تھا۔ نہ جانے بغیر اطلاع کے آمد کا گرو جی کتنا برا منائیں؟ اس نے سوچا اور ٹھٹکا' لیکن معاملے کی سنگین نوعیت نے اسے ہمت دلائی اور اے ڈی سی نے اچانک بڑھ کر دروازے پر ہاتھ مارا جو اندر سے کھلا ہونے کی وجہ سے کھلتا چلا گیا۔ سامنے راج گرو اپنے چوبی تخت پر نرم اور دبیز ریشم کے گدوں پر ڈھیر ہوا پڑا تھا اور مہاراجہ کی خصوصی باندی کوشلیا اس سے لپٹی "بکتی پراپت" کر رہی تھی۔

"ما---- ما---- مہاراج۔" اس کی زبان ہکلانے لگی۔

"شانت بالیکے۔" اس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ اونچا کر کے سائبان کی طرح یوں بلند کیا جیسے آنے والے نے کچھ دیکھا ہی نہ تھا۔

"جا بالیکے۔" اس نے سہمی ہوئی کوشلیا کی کمر پر تھپکی دی۔

کوشلیا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے الٹے قدموں چلتے ہوئے دونوں ہاتھ باندھ کر

مہاراج کو "جیسی نواسے" اور باہر نکل گئی۔

"بیٹھو!" راج گرو نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں نوخیزہ اے ڈی سی کے چہرے پر جما دیں۔

اے ڈی سی نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ باندھ کر اسے اس نئی "چیز" سے آگاہ کیا۔

راج گرو اس کی بات سن کر خاموش ہو رہا۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ مراقبے کی کیفیت سے بیدار ہو کر اے ڈی سی سے مخاطب ہوا۔ "ٹھیک ہے اس کے حکم پر عمل کرو۔ ہری سنگھ کی ہر طرح سے رکھشا کرنا۔ اپنے پندرہ آدمی ساتھ لے لو۔ خبردار ایک بھی دربار کا آدمی نہ ہو۔ مہاراج کی جان بہت قیمتی ہے۔ اسے ہر صورت ابھی زندہ رہنا چاہیے۔ ہاں اگر وہ پاکستان کی طرف فرار ہونے یا حملہ آوروں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرے تو اسے فوراً" جان سے مار دینا۔"

"آدیش ہے۔ (ضرور ایسا ہی ہو گا) گرو جی۔" اے ڈی سی نے ہاتھ باندھے اور الٹے پاؤں چلتا کوشلیا کی طرف باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں مسلح محافظوں کی رہنمائی میں مہاراجہ کا قافلہ جموں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی کار میں دو مسلح باڈی گارڈ ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ لیے بیٹھے تھے۔ کار کے آگے ایک ٹرک ڈوگرہ فوجیوں کا بھرا ہوا چل رہا تھا جس میں لگے طاقتور وائرلیس سیٹ کے ذریعے راستے کی پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔

دو سو میل کا فاصلہ بخیر و عافیت اور راستے میں دم لیے بغیر مسلسل طے کر کے مہاراجہ جموں جا پہنچا۔ اس کے ذہن میں کیا ہے؟ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ اس بات کا علم کبھی کسی کو نہ ہو سکا۔

مہاراجہ نے سختی سے اس بات کی ہدایت کر دی تھی کہ اس کی آمد کو بالکل خفیہ رکھا جائے۔ اے ڈی سی کو اس نے اپنی خواب گاہ میں طلب کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہاتھ باندھے مہاراجہ کے سامنے کھڑا تھا۔

"اگر کل صبح تک وی پی مینن بھارت سے فوجی مدد لے کر نہ پہنچے تو تم مجھے نیند میں گولی مار دینا۔" مہاراجہ نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔

اے ڈی سی نے کچھ کہنا چاہا' لیکن حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔ بڑا عجیب اور وحشت ناک فیصلہ کیا تھا اس کے مہاراج نے۔

"اب کیا بونگوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑے ہو۔ جاؤ۔ شب بخیر!" مہاراجہ نے اسے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔

HBC

☆○☆

گردش حالات نے جب کشمیر کے ڈوگرہ مہاراجے کو اتنا بے بس اور بے دل کر دیا تھا
وہ مجاہدین کی مسلسل اور منضبط کامیابیوں کے ہاتھوں عاجز اور ذہنی مریض بن کر اس مقام پر
پہنچ چکا تھا کہ اپنے اے ڈی سی کو خود کو گولی مارنے کا حکم دے رہا تھا۔ لیکن ان لمحات میں
وقت کا دھارا بدلا۔ کاتب تقدیر کا قلم ایک نئی نہج اپنا گیا۔ اس کے ساتھ ہی برصغیر کی تاریخ پر
ایک ایسا سیاہ باب رقم ہونے لگا جس نے بعد میں اس خطہ زمین پر بسنے والے کروڑوں
انسانوں کی بدبختی پر مہر ثبت کرنا تھی۔

قبائلیوں کے حملے کے تیسرے ہی روز بھارتی بالائی کمان ایک اہم فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔
کانگرسی لیڈر اس زعم میں مبتلا تھے کہ یہ نوزائیدہ مملکت جس پر یک دم لاکھوں یتیم، بیوہ
اور لٹے پٹے انسانوں کا بوجھ آ پڑا ہے، جس کا خزانہ بالکل خالی ہے، جس کے حصے میں آئی
والی فوج سمندر کے پار یا برصغیر کے دور دراز کونوں میں پاکستان سے ہزاروں میل دور
کیمپوں میں بے دست و پا پڑی ہوئی ہے، محض چند ہفتوں میں معاشی موت مر جائے گی۔
خود پاکستان کا وجود سلامت رکھنا ہی اس مملکت کے لیے ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ
کانگرسی لیڈرشپ کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کمزور جسم،
لیکن فولاد ایسے مضبوط ارادوں کا مالک قائداعظمؒ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے
کہہ رہا ہے کہ کشمیر، دکن اور حیدر آباد ہمارے ہیں اور وہ پاکستان کی سمت اٹھنے والے ہاتھوں
کو کاٹ کر پھینک دے گا۔

پاکستانی افواج کا انگریز کمانڈر انچیف ان کا پروردہ تھا۔ اس کے جیتے جی اس بات کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ پاکستانی فوج کشمیر میں داخل ہو، لیکن جنرل طارق کی کمان میں اپنے
مظلوم کشمیری بھائیوں کی مدد کو آنے والے پٹھان اور کشمیری مجاہدین جس تیزی سے کشمیر کے
دارالحکومت کی طرف بڑھ رہے تھے، اس کا کبھی کسی کو گمان بھی نہیں گزرا تھا۔

قبائلی سرفروشوں کی یلغار کے تیسرے ہی روز بھارتی حکمرانوں نے اپنے چیف آف
اسٹاف کو حکم دیا کہ وہ کشمیر میں حملے کا پلان تیار کرے۔

جب مہاراجہ ہری سنگھ حالات سے تنگ آ کر خودکشی کے منصوبے بنا رہا تھا تو سلانو
کے رہنے والے بریگیڈیئر ٹھاکر کی قیادت میں ایک سو فوج بردار طیارے بھارتی فوجوں
کو سری نگر کی طرف اڑا لے جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ گورداسپور، جالندھر اور
انبالہ کی چھاؤنیوں میں موجود تمام بھارتی فوجوں کو جموں کی طرف بڑھنے اور اس

فوراً بعد کر لینے کے احکامات جاری ہو رہے تھے اور تاریخ کا دھارا بڑی تیزی سے اپنا رخ
بدل رہا تھا۔

☆○☆

میجر رام سنگھ نے بھی گولیاں نہیں کھیلی تھیں، لیکن پے در پے ناکامیوں نے اسے بھی ادھ
موا کر رکھا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ پچھلے مہینے ہو تین
ایسی جنیں چوری ہوئی تھیں وہ مجاہدین آزادی کے ہاتھ لگ چکی ہیں۔
لاشیں اس کے سامنے رکھی تھیں اور ان کی موت واقعی ایسی گن کی فائرنگ سے ہی
ہوئی تھی۔ دونوں پٹرول پارٹیوں میں سے صرف ایک خوش قسمت اپنی بربادی کی کہانی سنانے
کے لیے زندہ اس تک پہنچ پایا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ اس نے اپنے افسر کے حکم کی خلاف
ورزی کرتے ہوئے پہاڑی سلسلے میں چھاپہ مار کا تعاقب کرنے کی بجائے چھپ جانے ہی میں
عافیت جانی تھی۔

"——— ایک حملہ آور اور پولیس کی پوری پٹرول پارٹی کا صفایا کر گیا اور ——— اس کے
تعاقب میں جانے والوں کو اس کے پہاڑوں میں چھپے ساتھیوں نے لقمۂ اجل بنا دیا۔" میجر رام
سنگھ کا ذہن صرف ایک ہی سمت راہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے سوچا "ناممکن ہے کہ وہ لوگ
اکیلے ہوں۔ ضرور ان کی پشت پناہی پاکستانی فوج کر رہی ہے۔" قبائلیوں کی مسلسل پیش قدمی
کی خبروں نے الگ اس کا برا حال کر رکھا تھا۔ لالہ مہاویر پرشاد اس کے لیے بڑے کام کا
آدمی تھا۔ اس کا سارا نظام جاسوسی لالہ مہاویر پرشاد ہی کے سہارے چل رہا تھا اور اسی کی
کوششوں سے میجر رام سنگھ کو مقامی غدار میسر آئے تھے۔

لالہ مہاویر کے اغوا اور موت کے بعد سے مجاہدین آزادی کی ایسی دہشت ان مقامی
غداروں پر بیٹھی تھی کہ وہ اب تھانے میں آنے سے بھی خوفزدہ رہتے تھے۔ زیادہ تعداد ان
غداروں کی تھی جو قبائلیوں کے آزاد کردہ علاقے کا رخ کر رہے تھے یا پھر سری نگر اور جموں
کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میجر رام سنگھ کو ایک خوف اندر ہی اندر سے کھا رہا تھا۔ اس نے
سوچا یہ بھی تو ممکن ہے کہ اگر اس نے مجاہدین آزادی کی دی ہوئی وارننگ کو نظرانداز کر
دیا تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کر گزریں۔

وہ تو شیرو کے فرار اور لالہ مہاویر پرشاد کی لاش ملنے کے فوراً بعد ہی یہاں سے کسی
اور جگہ تبادلہ کروا کے جا چکا ہوتا، لیکن اس کے لاشعور میں لگی انتقام کی آگ اب اس کے
شعور کو بھی جھلسانے لگی تھی۔ وہ صرف انتقام کے لیے یہاں رکا ہوا تھا۔ زہراں کے اغوا،

شیرو کے فرار اور لالہ صلاح کی موت کا انتقام——!

اس سے پہلے اس نے کبھی اپنے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات نہیں کیے تھے' لیکن اب وہ اس سلسلے میں خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا' تین چار مسلح سپاہی اس کی حفاظت کے لیے اس کے ہمراہ ہوتے۔ ایک بات کا تو اسے پکا یقین تھا کہ اس تماشے کے اندر بھی مجاہدین کا کوئی نہ کوئی ہمدرد ضرور موجود ہے—— اسی کی مدد سے الوہاں نے زہراں کو اغوا کیا اور شیرو کو فرار کروا دیا ہے۔ اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے کہ شیرو بغیر کسی "اندرونی امداد" کے وہاں سے فرار ہو سکتا۔

میجر رام سنگھ کا پونچھ میں اب صرف ایک ہی کام باقی رہ گیا تھا کہ وہ آستین کے سانپ کو ڈھونڈے اور اسے اذیتیں دے دے کر اپنے ہاتھوں مار ڈالے۔ یہی عزم تھا جس نے رام سنگھ کا حوصلہ بڑھائے رکھا۔ اس نے تمام معاملے پر براہ راست نظر رکھنے کا فیصلہ کیا تو اور بجائے کسی اور کو شامل کرنے کے اکیلے ہی اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس نے باری باری تمام پولیس ملازمین کو جن میں بلبند سنگھ اور ڈوگرے بھی شامل تھے' علیحدہ علیحدہ اپنے پاس بلا کر ان سے گفتگو کی تھی۔ اس نے کمال مکاری سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو یہ اندازہ ہی نہ ہونے دیا کہ اسے کسی پر کسی قسم کا شک ہے—— اور اپنی طویل تفتیش کے بعد اس کے ذہن نے جن مشتبہ آدمی کی نشاندہی کی تھی' ان میں سے ایک سجاول بھی تھا۔ میجر رام سنگھ نے انتہائی معتمد اور خصوصی آدمیوں کے ذریعے ان لوگوں کے معمولات چیک کیے تھے۔ خود بھی مختلف بھیس بدل کر باری باری ان لوگوں کی نگرانی کی تھی—— جب سجاول کے متعلق اسے خبر ملی کہ اس کے بچے تو تقسیم ملک کے اعلان سے پہلے ہی پاکستان پہنچ چکے ہیں تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"جناب کیا عرض کروں!" جب میجر رام سنگھ نے کمال مکاری سے اپنے چہرے کے تاثرات بدل کر بڑے معصوم سے لہجے میں سجاول سے اس کے بیوی بچوں کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بلا کسی جھجک کے ہنستے ہوئے کہا۔ "میری گھر والی کا دنیا میں اگر کہیں دل لگتا ہے تو صرف اپنی ماں کے گھر۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے سرکار کہ آخر میری تنخواہ میں ہزارا سب کا گزارا کیسے ممکن ہے؟"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" رام سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے گھریلو معاملات میں مداخلت نہیں کر رہا۔ میں تو مخدوش حالات کے پیش نظر کہہ رہا تھا۔ ایک لحاظ سے تم نے اچھا ہی کیا کہ۔ سرکاری ملازمین کو تو یہ لوگ معاف کرتے ہی نہیں۔ ذرا

...ہیں" جانے دو سرکار۔" سجاول نے بڑے انکسار سے جواب دیا۔

...ٹھیک ہے سرکار۔" سجاول نے بڑے انکسار سے جواب دیا۔

...اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ میجر رام سنگھ نے اس کی بیوی کے بارے میں یہ کہا ہے۔ شام کو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے جب وہ بارک میں پہنچا تو الرشید سمیت کئی اور سپاہیوں نے اسے اطلاع دی کہ آج اس کا تھانے میں رات گزارنا ضروری نہیں۔ اگر وہ چاہے تو اپنے گھر بھی جا سکتا ہے۔ "پچھلے آٹھ دس روز سے ان لوگوں کو اضافی خدوش حالات کے پیش نظر تھانے میں رہنے کا پابند کر دیا گیا تھا کیونکہ ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد بھی کسی بھی وقت کوئی ایمرجنسی پیش آ سکتی تھی۔

اکثر انہیں آدھی رات کو سوتے سے اٹھا کر "ایمرجنسی ڈیوٹی" کا طلب کر لیا جاتا تھا۔ آج جب انسپکٹر میر نے اسے رات کی چھٹی کا مژدہ سنایا تو وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ جس کی مثل اس نے پچھلے تین چار روز سے نہیں دیکھی تھی۔ ان چار پانچ دنوں میں گو کہ وہ رات کو تھانے میں سوتا رہا تھا' لیکن اس نے اپنے مہمانوں کو فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ ہر شام یا دن کے کسی بھی حصے میں کسی نہ کسی بہانے ان تک پہنچ جاتا' لیکن یہ ملاقات انتہائی مختصر ہوتی تھی۔

سجاول ضروریات زندگی انہیں مہیا کرتا' دو چار فقرے حوصلہ قائم رکھنے کو کہتا' مجاہدین اور قبائلی پٹھانوں کی سرفروشانہ یلغار کا ذکر کرتا اور رخصت ہو جاتا۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے اسے کہا بھی کہ مجھے شہر تک ہو آنے دو' بھلے رات کے اندھیرے ہی میں سہی' لیکن سجاول نے سختی سے روک دیا۔ اس نے لالہ کو صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے کبھی بھولے سے بھی اس کمین گاہ سے باہر قدم رکھا تو اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبے گا۔

☆○☆

تھانے سے باہر نکلتے ہوئے آج اچانک ہی اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ فوجی کنوائے والے میدان سے پہلے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا تھا' شاید اسے کوئی بات یاد آ گئی یا اپنے کسی لاشعوری فعل کا محتاج ہو کر اس نے یہ عمل دہرایا تو فوجی کنوائے کے نیموں کے عقب سے سپاہی منوہر لال کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دی جو اسے دیکھتے ہی دوبارہ غائب ہو گیا۔ سجاول ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے لاشعور میں دبے خدشات انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے لگے۔ "رام سنگھ کے پاس اس کی طلبی——!" وہ چونک پڑا۔

——اگرچہ اکیلے اسی کو طلب نہیں کیا گیا تھا' لیکن منوہر لال جیسے "کار خاص" کے

[illegible] کی تشریح کر رہی تھی۔ لیکن نہ جانے وہ کیا [illegible]
[illegible] کیوں قبل از [illegible] سے مطمئن ہو گئے [illegible]
[illegible] کا اعلان کر دیا۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء:

یہ صبح پاک و ہند کی تاریخ میں ایک تاریخ ساز دن کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔ [illegible] وہ دن تھے جن میں اپنے اہداف اور بھرپور فیصلے اور اقدامات ہونے تھے۔ یہ صبح [illegible] عوام کے لیے کسی دھماکے سے کم ہرگز نہیں تھے۔

مہاراجہ کشمیر جس نے یکم ستمبر کو کشمیری عوام کی قسمت کا فیصلہ کن [illegible] شروع کر دیا تھا اور جس نے گھر کے ایک کونے پر بھارت سے الحاق کی تحریر لکھ کر [illegible] دانستہ میں اپنے تئیں برادرم سنگھاسن کو منتقل ہونے سے محفوظ کر لیا تھا۔ لیکن اس نے [illegible] کشمیر کے لاکھوں شہریوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے قیام پاکستان کا اعلان ہوتے ہی مہاراجہ کے خلاف ہتھیار اٹھا کر اپنی نفرت کا کھلم کھلا اظہار تو کبھی کا کر دیا تھا لیکن وہ خوش فہمی یا خلا فہمی جس کا شکار مہاراجہ ہری سنگھ اور گروہ ہو چکا تھا' اب تک جموں کی تو قائم تھی۔ جب ریاست میں اس کے اس فیصلے سے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے عوام سڑ [illegible] آواز اٹھائی تو اور گروہ محل کی بنیادیں لرزنے لگیں۔

مہاراجہ ہری سنگھ کو شدت سے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ راج گرو کی مدد سے [illegible] جانے والی سازش اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔ وہ پچھتایا ضرور تھا' لیکن اب وہ پچھتاوا سے [illegible] تھا کہ ۲۷ اکتوبر کی صبح اپنے جلو میں ۳۳۰ فوجیوں کا ایک لشکر بھی لے کر آ رہی تھی۔ [illegible] فوج بردار طیاروں کے ذریعے سری نگر کے ہوائی اڈے پر اتر کر مورچہ سنبھال چکا تھا۔ اس [illegible] کے ساتھ ہی بھارتی فضائیہ بھی حرکت میں آ گئی۔

اسی روز سردار ابراہیم خان کی زیر قیادت کشمیر کے آزاد کرائے گئے علاقوں میں [illegible] حکومت کا قیام عمل میں آ گیا' جس کے ساتھ ہی ہندوستان کی طرح کشمیر بھی دو حصوں میں [illegible] بٹ کر رہ گیا۔

اسی روز پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خانؒ نے لاہور میں اکابرین ملت کا ایک [illegible] نمائندہ اجلاس اس ضمن میں طلب کیا کہ اب اس نئی اور سنگین پیدا شدہ صورت حال [illegible] سے کیسے نمٹا جائے۔ دیگر بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری نمائندوں کے علاوہ اس اجلاس میں جنرل طارق نے خصوصی شرکت کی۔ کشمیری مسلمانوں کو جبر و استبداد کے نوکیلے پنجوں

[illegible] سے رہائی دلانے والے [illegible] نے [illegible] [illegible] [illegible]

ی باطل ثابت کر دیا کہ محکمہ حکومت کی اجازت نہ دینے کے باوجود بھی یہ
قبائلیوں نے جموں پر خود سے حملہ کر دیا' لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ اس کے بعد باقاعدہ
باقاعدہ فوج کی جنگ بھی کشمیر کے مختلف محاذوں پر بھارتی فوج سے ہوئی' لیکن پھر بھی
پاکستان پر کھلا حملہ کرنے کی کوشش نہ کی۔

جموں ایک سلگتا ہوا سوال بن کر کشمیر کے ماتھے پر چمک رہا تھا۔

جنرل طارق نے جو آدمی اس طرف روانہ کیے تھے وہ ابتدائی دنوں ہی میں راشن
لینے کی وجہ سے وہاں سے واپس آ چکے تھے اور اس انتہائی اہم محاذ کا خالی رہ جانا بڑا المیہ تھا

☆○☆

کمانڈر حسین خان اور اشرف دونوں بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ٹیرو
نے انہیں ساری کہانی سنا دی تھی۔

——— پہلے تو ان کا یہی خیال تھا کہ شیرو خود فرار ہوا ہے' لیکن یہ خان کا اجنبی ہوا
کون تھا؟ جس کے متعلق شیرو کچھ بتانے کو بھی تیار نہ تھا۔ "وہ جو کوئی بھی ہے' ہم مر
ہے۔ ہمارے ہی راستے کا مسافر اور ہماری اگر کوئی پہچان ہے تو وہ کشمیری حریت پسند
ہے۔ اس کا بم کیا ہے؟ اگر تم بتاتے بھی تو میرے لیے یہ ضروری بات نہیں تھی۔ شیرو! اگر
ایسی طاقتور اور منظم تنظیم کا قیام عمل میں آ چکا ہے جس نے کشمیر کو آزاد کروانے کے لیے
اندر ہی اندر اور نہایت خفیہ طریقے سے تیاری مکمل کر لی ہے تو یہ میری' تمہاری اور ہم
سب کی خوش بختی کی علامت ہے۔ آج ہم سب بکھرے ہوئے ہیں۔ ٹکڑیوں میں بٹ کر لڑ
رہے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب ہم سب متحد ہو کر استعماریت سے ٹکر لیں گے اور اپنی
دھرتی کو بھیڑیوں کے شکنجے سے نکالیں گے۔" کمانڈر حسین خان نے طویل سانس لے کر اپنی
بات مکمل کی۔

اشرف نے البتہ کچھ نہ کہا۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے دوست کو
اس خوشی کی کیفیت کا اظہار کیسے کرے جو اسے اچانک شیرو کے مل جانے پر نصیب ہوئی
تھی۔

وہ رات کمانڈر حسین خان اور اس کے ساتھیوں کے لیے خصوصی اہمیت کی حامل تھی۔
انہوں نے نورولی کو تین چار روز پہلے جموں کی طرف روانہ کیا تھا تاکہ وہاں کے حالات سے
انہیں باخبر کر سکے۔

پندرہ بیس روز پہلے ہی جموں کی طرف سے تشویشناک خبریں آ رہی تھیں۔ پونچھ کوٹ جھڑا

ہی بھارتی فوجیں آ چکی تھیں اور جموں کے لیے خطرہ کی گھنٹی تھی۔
——— پونچھ کے جو فوجی چھٹی پر پاکستان کی آزادی کے بعد کشمیر اپنے گھروں کو لوٹ
رہے تھے' اپنے ساتھ بھارتی فوجوں سے متعلق بڑی اہم خبریں لائے تھے۔ کمانڈر حسین خان
تک یہ خبر بھی پہنچ چکی تھی کہ پاکستان نے جموں کے مہاراجہ کو ریاست کے وسیع تر مفاد میں
اور اب جب سری نگر میں بھی بھارتی فوج اترنے لگی تھی اور جموں کے راستے بھی وہ
پوری طرح کشمیر میں پھیل رہے تھے تو حسین خان کو بڑی شدت سے اپنے منصب کے غیر
محفوظ ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس کی واحد امید اب جموں میں اس کا ہونہار بھتیجا
اشرف نورولی کو اس نے نبی خان کی طرف ہی روانہ کیا تھا اور دوران گفتگو ہی اسے نورولی کی
واپسی کی اطلاع مل چکی تھی۔
——— گفتگو مکمل ہوتے ہی وہ اس کی طرف چل دیا۔

☆○☆

مسلسل سفر نے بوڑھے نورولی کو تھکا ڈالا تھا اور ——— وہ چٹائی زمین پر بچھائے ایک
تکیے سے ٹیک لگائے لیٹا ہوا تھا' جب اس نے حسین خان کو اس طرف آتے دیکھا۔ ایک
دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد وہ دونوں اٹھ کر باہر آ گئے اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک
گھنٹے تک دونوں دوست تنہائی میں باتیں کرتے رہے' پھر نورولی تو سونے چلا گیا جب کہ
حسین خان سوچ میں ڈوبا واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے بیٹوں خاص تو سین کے
ساتھ جن میں اشرف خان اور شیر محمد بھی شامل تھے' انتہائی اہم صلاح مشورہ کر رہا تھا۔

"میرے دوستو!" اس نے گفتگو کے اختتام پر انہیں مخاطب کیا۔ "تم سب حالات آپ کے
سامنے ہیں۔ تقدیر نے ہمیں دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ہمارے عقب سے بھارتی فوجیں
ہم پر یلغار کر رہی ہیں اور دائیں بائیں سے ہمیں ڈوگرہ فوجوں نے گھیرے میں لے رکھا
ہے۔ ہماری نظریں سامنے کی سمت اپنے پٹھان بھائیوں پر لگی ہیں جو نہ جانے کیوں ہم تک
پہنچ نہیں پائے' نہ ہی ابھی تک بھارتی فوج کے خلاف پاکستان کی باقاعدہ فوج میدان میں اتری
ہے۔ نہ جانے وہ لوگ کس روز بد کے منتظر ہیں کہ ابھی تک ہماری مدد کو نہیں آئے۔ اس
مرحلے پر اگر ہم نے پونچھ کو خالی چھوڑ دیا تو خدائے واحد کی قسم قیامت تک پھر کبھی ہم
دوبارہ یہاں قدم نہ رکھ سکیں گے۔ الا یہ کہ کوئی معجزہ ظہور پذیر ہو اور ہمیں دوبارہ یہاں
قدم جمانے کا موقع مل جائے۔ ہم نے جس بے سروسامانی کے عالم میں جہاد کا آغاز کیا تھا' وہ

HBC

آپ سب جانتے ہیں اور آج جب ہماری کوششیں رنگ لانے لگی ہیں تو ہمارا
کے لیے اپنے ہم مذہبوں کو بلا لیا ہے۔"

—— تھوڑی دیر کے لیے رک کر اس نے اپنے ہمراہیوں کے چہروں پر نظر
سب پتھر کے بت بنے اس پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔

"جموں میں جس طریقے سے خون مسلم بہہ رہا ہے' آسمان بھی اس پر لہو
ہو گا مگر یہ خدا ہماری غیرت ابھی زندہ ہے۔ کشمیر کے جیتے ابھی مر نہیں گئے کہ یوں
کی بہو بیٹیوں کو گلیوں میں رسوا کرتا پھرے —— آزمائش کی گھڑی سر پر آگئی ہے
جموں کے بے کس اور مظلوم مسلمانوں کا لہو صرف اپنی بدبختی کی دہائی نہیں دے رہا
غیرت کو بھی للکار رہا ہے۔ خدائے واحد کی قسم! ہم تعداد میں نہ ہونے کے برابر ہیں
ہمارے پاس اسلحے کے انبار نہ سہی' لیکن ہمارے سروں میں آزادی کا سودا سمایا ہوا ہے
ہمارے بازوؤں میں ابھی اتنی سکت ہے کہ وہ ان غاصبوں کا گلا گھونٹ دیں جنہوں نے
پشت میں خنجر گھونپا ہے۔" اس نے رک کر دوبارہ لمبی سانس لی اور گویا ہوا۔

"میں کل رات جموں روانہ ہو جاؤں گا۔ یہاں کی کمان نوروللی کے سپرد کرتا ہوں۔ میں
تم میں سے کسی سے اپنے ساتھ چلنے کی اپیل نہیں کروں گا' لیکن تمہیں تمہارا فرض ضرور یاد
دلاؤں گا....."

"حسین خان! واللہ ہم ابھی اتنے بے غیرت نہیں ہوئے کہ تمہیں اکیلا جانے دیں۔" شیرو نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔

اس کے ساتھ ہی تمام مجاہدین اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حسین خان نے شیرو کو بہت سمجھایا' لیکن اس کے جذبہ شوق شہادت کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اگلی رات سفر کے لیے منتخب ہوئی۔ ان لوگوں کو پہاڑوں کے بیچوں بیچ پیدل سفر طے کر کے جموں پہنچنا تھا کیونکہ تمام سڑکیں فوج کے قبضے میں تھیں۔

رات گئے تک شیرو' اشرف خان کو تسلیاں دیتا رہا۔ اس نے زبردستی شرفو کو یہاں چھوڑ دیا تھا۔ قریباً" آدھی رات کے بعد ایک شدید ذہنی کشمکش کے بعد وہ اس فیصلے پر پہنچا تھا کہ وہ اپنے دوست کو اپنی ماں اور مگیتر کے ٹھکانے سے آگاہ کر دے تاکہ کسی بھی ناگہانی صورت حال کے پیش نظر وہ ان لوگوں کو لے کر سرحد پار کر جائے۔

"تم ہمیشہ مجھے چھوٹا سمجھ کر دباتے آئے ہو شیرو ——!" اس نے قریباً" سسکیاں لیتے ہوئے روانگی کے وقت اس سے کہا۔

"شرفو! میرے بھائی میں ایک بہت بڑی امانت تمہارے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔ میری ماں کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اگر اس کا بیٹا سرخرو نہ ہوا تو کبھی اس کو منہ نہ دکھائے۔ اچھا فی امان اللہ۔" اسے یوں لگ رہا تھا کہ اگر وہ مزید تھوڑی دیر تک شرفو کے پاس رہا تو شدت ضبط سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

☆○☆

تھوڑا اندھیارے کشمیر کے مقدر کو اجالے کے لیے پہاڑوں کے دامن میں اتر رہے تھے۔

—— وہ رات کا دوسرا پہر تھا جب پچاس سرفروشوں کا ایک قافلہ اپنے ہاتھوں میں رائفلیں اور آستین کمریں تھامے' کندھوں پر بھاریں رکھے اپنے ساتھیوں سے گلے مل رہا تھا۔ حسین خان کی سرکردگی میں الگ ہو رہا تھا۔ یہ کشمیر کے وہ جیالے سپوت تھے جنہیں دشمن کی غلامی ہرگز گوارا نہ تھی۔ وہ مار دینے یا مر جانے کا سودا سروں میں سما کر یہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ احساس تفاخر ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ یہ خدا کے سرفروشوں میں سرفہرست تھے کہ وطن کی آزادی و عصمت کی پاسداری کے لیے انہوں نے موت کی شاہراہ پر آگے ہی آگے بڑھ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ دشمن کی للکار پر لبیک کہہ کر اس سے ٹکرانے چلے تھے۔ یہ پہاڑ اور چیونٹی کا مقابلہ تھا' لیکن آفرین ہے ان کے شوق جہاد پر کہ وہ کسی مصلحت کو' کسی دشواری کو خاطر میں نہیں لائے تھے۔

نوروللی کی کمان میں سو مجاہدین کا ایک دستہ انہیں رخصت کرنے کے لیے پہاڑی سلسلے کی آخری حد تک آیا تھا—— ان سب کی آنکھوں میں آنسو تھے' لیکن ان سب کے ہونٹوں پر دعائیں لرز رہی تھیں۔ پہاڑی سلسلے کی آخری حد پر پہنچ کر نوروللی کی کمان میں آنے والے مجاہدین دو رویہ قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے اکثر نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے قرآن پاک بلند کر لیے۔ وہ قرآن کے مقدس و متبرک سائے میں اپنے پیارے کو رخصت کر رہے تھے۔

پچاس مجاہد ایک ایک کر کے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے رخصت ہو رہے تھے' سب سے آگے کمانڈر حسین تھا۔

"حسین خان! روز قیامت میں خدا کی عدالت میں تمہیں ضرور کھینچوں گا۔" بوڑھے نوروللی کی آواز بھرا گئی۔ "مجھے بوڑھا سمجھ کر چھوڑ دیا ہے نا تم نے!"

"نوروللی! واللہ میرے نزدیک تم سے بہتر کوئی نہ تھا کہ جسے میں ان منتشر لوگوں کو سونپ کر جاتا۔ ہم ایک دوسرے سے انشاء اللہ اسی دنیا میں دوبارہ سرخ رو ہو کر

HBC

ہیں کہ اچانک الان اللہ۔" اور وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے
آہستہ آہستہ اندھیرے کی وسیع و عریض چادر کا حصہ بننے لگے۔

☆○☆

میجر رام سنگھ نے طاقتور دوربین اپنی آنکھوں سے لگا رکھی تھی اور وہ اس پہاڑی
کے بالکل آغاز ہی میں ایک چنار درخت کی شاخوں میں خود کو چھپائے بیٹھا تھا۔ وہ
سجاول کو تھانے کی عمارت سے نکل کر بازار کی طرف جاتے دیکھا۔۔۔۔ معمولی
ٹھیک تھا۔ خاصی دور تک اس کی نظروں نے سجاول کا تعاقب کیا اور جس لمحے
وہ مایوس ہو کر نیچے اترنے والا تھا' اس نے سجاول کو ایک جگہ سے موڑ مڑتے دیکھا۔
راستہ ویران سمت کی جانب رہنمائی کر رہا تھا۔ میجر رام سنگھ چونکا۔ "یہ کہ
اس نے سوچا اور دوربین اس پر مرکوز کر دی۔ اس کی حیرت بڑھنے لگی۔ جب سجاول
کے دیکھتے ہی دیکھتے اس درخت کے نیچے سے بھی گزر کر آگے بڑھ گیا جس پر وہ بیٹھا تھا۔
وہ اپنا سانس روکے وہیں رکا رہا اور جب وہ کچھ دور نکل کر ایک موڑ پر گھوما تو رام سنگھ
بھی درخت سے نیچے اتر آیا۔ اب وہ دبے قدموں سے بلی کی طرح بغیر آواز پیدا کیے اس کا
تعاقب کر رہا تھا۔ تعاقب کا یہ سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ اس پر جھنجلاہٹ طاری
ہونے لگی تھی' لیکن اس نے خود پر قابو پائے رکھا۔ کسی آمدہ کامیابی کی خوشی نے اسے
تھکاوٹ یا سفر کی طوالت کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ اس نے اپنا ریوالور اب مضبوطی سے
دائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ تعاقب کے لیے اس نے بڑا محفوظ طریقہ استعمال کیا تھا۔ وہ
دوربین کے ذریعے سجاول پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ جہاں کہیں اس کی منزل کے راستے
میں کوئی پہاڑی موڑ یا سلسلہ آتا' وہ فوراً ایسی جگہ تبدیل ہو جاتا جہاں سے سجاول اسے
صاف دکھائی دینے لگتا۔

پھر ایک مقام پر اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا' اس نے تو رام سنگھ کو بوکھلا کر رکھ
دیا۔۔۔۔ اس نے بجائے خود آگے بڑھ کر کھیل بگاڑنے کے وہاں سے ہٹ جانے کا فیصلہ
کر لیا۔

۔۔۔۔اب وہ قریباً بھاگتا ہوا تھانے کی طرف آ رہا تھا۔ مسلسل اور تیز رفتاری سے
بھاگنے کی وجہ سے اس کی سانس پھولنے لگی تھی' لیکن اس نے کہیں بھی رک کر سانس
گوارا نہ کیا۔ اپنی زندگی میں بھی وہ کبھی اس طرح نہیں بھاگا تھا' لیکن کامیابی کے نشے میں
چور رام سنگھ کے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ وہ تو ہوا میں تیرتا ہوا وہاں تک پہنچا

ہوں۔" میں ہوش تیار کرو۔" اس نے اپنے ناب کو دور ہی سے چلا کر حکم دیا۔

☆○☆

"کل ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔" سجاول نے بلا کا جھنجلا کر کہا۔
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن شیرو کی کوئی خبر؟" بلا نے بے چینی سے پوچھا۔
"میں تو خود حیران ہوں۔ خیر تم بے فکر رہو۔ مجھے نیند چڑھ رہی ہے۔ میں جا کر سو
جاتا ہوں۔" اس نے بلا کو تسلی دی۔
"خدا تمہارا بھلا کرے۔ نہ جانے ہم کبھی تمہارے ان احسانات کا بدلہ چکا بھی سکیں گے
یا نہیں۔" شیرو کی ماں نے احساس تشکر سے سرشار لہجے میں کہا۔
"اچھا آپ لوگوں نے تو مجھے شرمندہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔۔۔۔ خدا
حافظ!"
"خدا حافظ!" تینوں نے یک زبان اسے خدا کی حفاظت میں سونپا۔
حسب سابق وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا آ رہا تھا جب سجاول کو اپنے گرد کسی
بڑھتے خطرے کا احساس ہوا۔۔۔۔ اس کی چھٹی حس نے اس سنسنے میں اسے کبھی دھوکا نہیں
دیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس نے رک کر بغور ماحول کا جائزہ لیا۔ اپنے دائیں بائیں
درختوں پر چڑھ کر نظریں دوڑائیں' پھر مطمئن سا ہو کر چل دیا۔
۔۔۔۔لیکن ابھی وہ بمشکل پندرہ بیس گز ہی چل پایا تھا جب اچانک اس کے عقب
کی طرف "ہلن۔۔۔۔ ہلٹ!" کی آوازیں شور پیدا کرنے لگیں اور اس سے پہلے کہ وہ صورت
حال کو سمجھ پاتا' بیک وقت تین چار رائفلوں کی گولیاں اس کے جسم سے آ ٹکرائیں۔ "ہینڈز
اپ" اس نے رام سنگھ کی آواز سنی اور بے اختیار اس کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔
ابھی تک اسے رام سنگھ نظر نہ آیا تھا۔
۔۔۔۔اس سے پہلے کہ سجاول خان کی نظریں میجر رام سنگھ کو ڈھونڈنے میں کامیاب
ہوتیں' ایک زوردار ٹھوکر اس کی دائیں پسلی پر پڑی جس سے بے اختیار وہ بائیں طرف
لڑھک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہو جائے' اس کی بائیں پسلی پر بھی وہی قیامت ٹوٹ
پڑی۔ سجاول نے سنبھلنے کی ہزار کوشش کی لیکن اس پر ٹھوکروں کی بارش ہونے لگی۔ چیخنا
چاہا اس نے بزدلی سمجھا اور اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر اپنے اندر سے اٹھنے والی چیخوں
کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگا' مگر اسے زیادہ دیر تک خود سے جنگ نہیں لڑنا پڑی۔ سر پر
لگنے والے کسی رائفل کے بٹ نے اسے تھوڑی دیر کے لیے تمام لوتھوں سے نجات دلا

HBC

ای ۔ سہاول کا اس اندھیری تاریکیوں میں اٹھتا چلا گیا۔

☆○☆

لالہ اس سمت نظریں جمائے بیٹھا تھا جس طرف سے اکثر سہاول آیا کرتا تھا۔ کئی گھنٹے ہی گزرا تھا کہ لالہ کا دل گھبرانے لگا۔ آج پہلی مرتبہ اسے خوف محسوس ہونے لگا تھا' حالانکہ یہاں آنے کے بعد وہ خود کو قدرے محفوظ خیال کرتا تھا۔ اس کے وہم نے تب حقیقت کا روپ دھار لیا' جب اچانک اس سلسلے سے ذرا دور فوجیوں کو اسی طرف بڑھتے دیکھا۔ پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا' لیکن حقائق سے فرار کی کوئی بھی راہ دکھائی نہ پڑتی تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے وہ ہوش میں لوٹ آیا۔ وہ دوڑتا ہوا مختصر سی غار تک پہنچا۔ اپنی بھابی اور بچی کو اس نے وہم تیزی سے صورت حال کی سنگینی کا احساس دلا کر سنبھلنے کی تاکید کی۔ آنکھیں دونوں کی خوف اور خوف سے پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ لالہ نے انہیں جھنجھوڑا اور اس غار کی دوسری سمت سے میدانی علاقے کی طرف اترنے کی ہدایت کی۔ خدا حافظ کہا اور اپنی آستین گن لور گریبان سمیت بھاگتا ہوا اس راستے پر پہنچ گیا جس طرف سے سہاول انہیں ملنے آیا کرتا تھا۔

اس کی نگاہیں اس راستے پر ٹکی تھیں جدھر سے ان لوگوں کی آمد متوقع تھی لور خوف ہم کی کوئی شے اس کے نزدیک نہ پھٹکی تھی۔ اسے اگر کوئی ڈر تھا تو صرف یہ کہ حملہ آوروں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ اپنی جان سے گزر جانا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا پھر ـــــ سامنے سے آنے والے نمایاں ہونے لگے۔

وہ لوگ دو دو کی ٹولیوں میں بٹ کر پہاڑیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور لالہ ان سے خاصی اونچائی پر مورچہ زن تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی' لیکن آستین گن پر اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ اس لمحے کا منتظر تھا جب حملہ آور اس کی گن کی رینج میں آ جائیں لور وہ مرنے سے پہلے اپنے دل کے ارمان نکال سکے۔ بڑی بے چینی کے ساتھ وہ ان کی آمد کا منتظر تھا' لیکن اچانک اس نے حملہ آوروں کو رکتے دیکھا۔

وہ لوگ مختلف ٹیلوں اور بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں پوزیشنیں سنبھال رہے تھے۔ اچانک ایک زوردار آواز پہاڑیوں میں گونجی۔ "تم لوگ گھیرے میں آ چکے ہو' خود کو کرنلدی کے لیے پیش کر دو۔"

لالہ خاموش رہا۔ دوبارہ وہی فقرہ دہرایا گیا۔ اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس مرتبہ ای آواز نے کہا۔

"کریم لال! دونوں عورتوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ تمہیں ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ تمہارا مقصد فضل پورہ ہم تک پہنچانا تھا' وہ پورا ہو چکا۔ اب ہمیں اپنا فرض ادا کرنے دو۔ عورتوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ تمہاری صورت میں ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"ہرگز نہیں۔" لالہ چیخ پڑا۔ "تم مجھے نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ میرے جیتے جی کسی کی مجال ہے کہ وہ میری عزت کو میلی نگاہوں سے دیکھ بھی سکے۔ تم ہمت ہے تو سامنے آ کر مقابلہ کرو۔"

دوسری جانب خاموشی طاری رہی' پھر اس نے ایک ٹیلے کی اوٹ سے کسی کا ہاتھ لہرتے اپنی جانب آتے دیکھا۔ شاید دشمن کا کوئی نمائندہ اس سے مذاکرات کرنے آ رہا تھا۔ لالہ ہوشیار ہو گیا۔

آہستہ آہستہ آنے والے کے نقوش نمایاں ہونے لگے اور جب اس کی شکل مکمل نظر آئی تو لالہ کا دماغ گھوم اٹھا۔ ٹریگر پر سے اس نے بےاختیار اپنی انگلی کو الگ کیا تھا۔ یہ انسپکٹر میر تھا۔ غدار ابن غدار۔ وہ لالہ سے قریباً تیس چالیس گز دور ہی ایک جگہ آ کر رک گیا۔

"کریم لالہ" انسپکٹر میر نے گلہ پھاڑتے ہوئے کہا۔ "کیوں مفت میں جان گنواتے ہو۔ میجر رام سنگھ کو میں نے بڑی مشکل سے اس بات پر راضی کیا ہے کہ عورتوں کو پیش کر دینے کی صورت میں وہ تمہیں گرفتار نہیں کرے گا....."

"بکواس بند کر۔" لالہ نے بے قابو ہو کر اس کی بات کاٹ دی۔ "مہاراجہ کے تلوؤں کو چاٹنے والے پلے۔ بخدا تو میرے آباؤ اجداد کو جانتا ہے اور میں تیرے بزرگوں کو ـــــ" لالہ کی آواز میں غصے سے چلانے کی وجہ سے لالہ کریم ہانپنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میر یہ توہین برداشت نہ کر پائے گا اور اس پر فائرنگ شروع ہو جائے گی' لیکن انسان کس حد تک بے غیرت بن سکتا ہے؟ اس کا اندازہ لالہ کریم کو نہیں تھا۔ وہ تو سیدھا سادا کشمیری تھا۔ کشمیر کی آزادی پر مرمٹنے کا جذبہ اس کے بزرگوں نے خون میں اس کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ ایک لمبے عرصے تک اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی' لیکن اس کا سبب بزدلی ہرگز نہ تھا۔

بنیادی طور پر وہ ایک شریف انسان تھا۔ جنگ سے نفرت کرنے لور بھائی کو پھلتے پھولتے دیکھنے والا شریف النفس کریم لالہ۔ اس کے بھائی نے قربانی دے کر سدھنوں کو جینے کی نئی راہ دکھائی تھی۔ پونچھ کے لوگ کبھی کبھی اس بات پر حیرانی کا اظہار ضرور کیا کرتے تھے کہ اتنے بہادر انسان کا اتنا بزدل بھائی ـــــ! لیکن آج جب تقدیر اس کی وطن دوستی کو

آزمانے پر تلی تھی اور گردش حالات نے اسے ہمیشہ کے لیے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اپنی زمین اور بیٹی کی عزت پر مرمٹنے کو تیار تھا۔

جس طرح لالہ کریم کو وطن دوستی اور شجاعت ورثے میں ملی تھی' اسی طرح انسپکٹر میر کو غداری اور قوم دشمنی وراثت میں ملی تھی۔ اس کے باپ دادا بھی ڈوگرہ حکمرانوں کا نمک حلال کر کے بے شمار جاگیروں کا مزا لوٹ چکے تھے۔ وہ ضمیر فروش وطن دشمن محض یہ چاہتا تھا کہ کریم اور اس کی بیٹی کو زندہ گرفتار کر کے میجر رام سنگھ کے حضور پیش کرے اور خود انعام و اکرام کا حقدار ٹھہرے۔ لالہ کریم سے گفتگو کرنے کا مقصد بھی اسے صرف الجھانا ہی تھا جس میں وہ حد تک کامیاب بھی ہو چلا تھا۔۔۔۔ اس نے دوران گفتگو اپنے سپاہیوں کو ایک پوزیشن لے کی لوٹ سے دوسری طرف نکل کر اس راستے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا تھا جو کہ دامنت میں زہراں اور شیرو کی ماں کے فرار ہونے کا واحد راستہ تھا۔

☆○☆

کسی لاشعوری حرکت کے تابع ہو کر ہی لالہ کریم نے اس طرف گردن گھمائی۔ اسی لمحے اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک خیال جاگزیں ہوا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر دراصل فرار کے امکانات کا جائزہ لینا چاہا تھا اور جیسے ہی اس کی نظر اپنی بائیں سمت والے ٹیلے کی طرف گئی تو وہ ٹھٹھر کر رہ گیا۔ چار ڈوگرے ایک دوسرے کے تعاقب میں مختلف پتھروں اور جھاڑیوں کی اوٹ لیتے اس گزرگاہ کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں سے تھوڑی دیر پہلے زہراں اور شیرو کی ماں کو اس نے فرار کروایا تھا۔

کریم لالہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ "تو یہ مکار مجھے گفتگو کے جال میں الجھا کر یہ گھناؤنا کھیل کھیلتا چاہتا تھا؟" اس نے لمحہ بھر سوچا اور ساتھ ہی گن کا رخ کراسنگ کرتے ڈوگرہ سپاہیوں کی طرف کر دیا۔ ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھا اور پہلے ہی برسٹ میں اس نے گن نے اپنے انجام سے بے خبر رینگتے ہوئے ڈوگرہ سپاہیوں میں سے دو کو چاٹ لیا۔

دونوں نے بھی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر لالہ کریم کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا تھا۔ باقی دو کو بھی گولیاں تو لگی تھیں' لیکن ضرب کاری نہ ہونے کے باعث کسی نہ کسی طرح رینگ رینگ کر محفوظ آڑ میں چلے گئے۔

فائرنگ کی آواز سنتے ہی میجر رام سنگھ کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے دل ہی دل میں انسپکٹر میر کو کوسنوں سے نوازا جو اسے یہ کہہ کر گیا تھا کہ ایک گولی بھی ضائع کرائے بغیر۔۔

کریم لالہ اور شیرو کی ماں کو گرفتار کر لے گا۔

انسپکٹر میر کی بدقسمتی نے لالہ کریم کو ہوشیار کر دیا تھا اور اب اگر وہ اسے گھیر کر مار بھی ڈالتے تو زہراں اور شیرو کی ماں کو ڈھونڈنا بڑا مشکل ہو جاتا کیونکہ لالہ کریم کی یہ ذہانت تھی کہ جب تک اس کے پاس اسلحہ ختم نہ ہو جاتا' کسی کے اس کے سامنے سے گزر کر اس کی پشت تک پہنچنے کے امکانات باقی نہیں تھے۔

میجر رام سنگھ نے انسپکٹر میر کو گالیاں بکتے ہوئے اپنی آنکھوں سے اوجھل کر دیا اور اپنے پہلے سے تربیت شدہ حوالداروں کو "چارج" کا حکم دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک وقت ڈوگرہ سپاہیوں کے تین یونٹس مختلف اطراف سے فائرنگ کرتے ہوئے لالہ کریم کی طرف بڑھنے لگے۔ لالہ کریم کے تین سامنے' لیکن قدرے نیچی پوزیشن پر تھی مشین گن نے لالہ کریم کے مورچے پر آگ اگلنا شروع کر دی۔ فائرنگ اتنی تیز ہو رہی تھی کہ اسے سر اٹھانے کی مہلت بھی نصیب نہ تھی۔

اس تیز رفتار فائرنگ کی آڑ میں میجر رام سنگھ کے خصوصی دستے کے تربیت یافتہ فوجی اس کی طرف گولیاں برساتے بڑھ رہے تھے۔ لالہ کریم کو اپنی موت کا تو پکا یقین ہو چکا تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے کسی نہ کسی طرح زہراں اور شیرو کی ماں کو ظالموں کی دستبرد سے بچا لے اور زیادہ سے زیادہ ڈوگروں کو مار ڈالے۔

تیز فائرنگ اور اس کی طرف ایڈوانس کرتے فوجیوں کے "بے کاروں" نے اسے رتی بھر بوکھلایا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دماغ کو حاضر رکھا اور مشین گن کی گولیوں سے محفوظ رہتے ہوئے اپنی طرف بڑھتے فوجیوں پر فائرنگ شروع کر دی۔

انسپکٹر میر نے فوجیوں کو یلغار کرتے دیکھا تو یہی جانا کہ کھیل اس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن اتنی جلدی ہار ماننے والا وہ بھی نہیں تھا۔۔۔۔ اس نے فائرنگ کرنے والوں سے ہٹ کر ایک لمبا چکر لگا کر کریم لالہ کے پہلو میں پہنچنے اور اس پر حملہ کر کے گرفتار کرنے کا عزم کیا اور اپنا ریوالور سنبھالتا اس طرف چل دیا۔

کریم لالہ آخری میگزین لوڈ کر رہا تھا جب اچانک اس کے سامنے سے تین چار سر نمودار ہوئے اور اس سے پہلے کہ وہ گن کو فائرنگ کی پوزیشن میں لاتا۔ ایک ڈوگرہ سپاہی کی گولی اس کا دایاں کندھا بری طرح چھید گئی۔

کریم لالہ تیورا کر الٹ گیا' لیکن سنبھلا اور اس نے میگزین فٹ کر لی۔ اس کو اپنے دائیں کندھے پر چنگاریاں سلگتی محسوس ہو رہی تھیں اور چند ہی لمحوں میں شانے میں پیدا

ہونے والی آگ اس کے سارے بازو میں خون کی گردش کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ لیکن ابھی وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا—— اس نے ایک جست لگائی اور اس کی اگلی ٹریگر پر دبتی چلی گئی۔ لیکن—— اچانک ہی مشین گن کی برسٹ اس کے جسم پر پڑا۔

——اور دم توڑتے کریم لالہ کی نگاہوں نے جو آخری منظر دیکھا اس نے اس کے سکرات کے عالم کو مسہل کر دیا۔

دم توڑتے انسپکٹر میر کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کریم لالہ کے پہلو سے نمودار ہوا تھا اور اپنی دانست میں اس نے بڑی صحیح سمت میں فائر کیا تھا۔ لیکن بے دم ہوتے کریم لالہ نے زمین پر گرتے گرتے بھی اپنا دبلا پتلا اسٹین گن کو پر برقرار رکھا تھا اور گولیاں قطار کی صورت انسپکٹر میر کے جسم میں سوراخ بناتی چلی گئی تھیں۔

☆○☆

اشرف خان پچھلے دو دن سے عجیب و غریب ذہنی کشمکش کا شکار تھا—— شیرو سے معمولی ذے داری نہیں ڈالی تھی۔ دوسری طرف اس کی معروفیات بھی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ مجاہدین نے اب زیرزمین کارروائیوں کے بجائے دشمن کے سامنے آ لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ہر روز وہ لوگ کسی نہ کسی مہلت پر جاتے، لیکن آج صبح ناشتے شرفو کو اک بے کلی سی لگی ہوئی تھی۔ وہ کسی کو بتائے بغیر شیرو کے گھر والوں کی خبر گیری طرف روانہ ہو گیا۔ اپنے جسم پر لپٹی ڈھیلی چادر میں وہ اسٹین گن چھپانا نہیں بھولا تھا۔ ہینڈ گرنیڈ بھی اس نے احتیاطاً ساتھ رکھ لیے تھے۔

زہراں تک پہنچنے کے لیے شرفو نے کافی لمبا اور پیچ دار راستہ اپنایا تھا۔ شیرو نے اسے اپنی ماں اور منگیتر تک پہنچنے کے کئی راستے سمجھا دیئے تھے۔ شرفو نے وہ راستہ اختیار کیا جس طرف سے اس کے نظر آنے کے امکانات بہت کم تھے۔

وہ اس تار کی پشت پر تقریباً دو فرلانگ دور تھا جب اس نے زوردار فائرنگ کی آواز سنی۔ شرفو کا دل دھک سے رہ گیا۔ دن کی روشنی میں ایسے دھماکوں کی آوازوں کا سوائے اس کے اور کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ "اس کے سمان کسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ فوجیوں نے حملہ کر دیا ہے؟" اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کے پیر جیسے زمین سے چپک گئے تھے۔

شیرو کا چہرہ سامنے آ گیا کہ وہ کیا کرتے اور کیا نہ کرتے؟ بھاگ جاتے؟ لیکن کہاں؟ ان کی مدد کو پہنچتے؟ یہ بھی سمجھ نہ آتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ بھاگ جاتے؟ لیکن کہاں؟ ان کی مدد کو پہنچتے؟ اس بات کا اسے بخوبی احساس تھا کہ وہ اکیلا ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ شیرو نے اسے بتایا تھا کہ ان کے مقابلے میں فوجی دستہ کی صورت نہیں کر سکتا۔ شیرو نے اسے بتایا تھا کہ ان کے مقابلے میں فوجی دستہ کی صورت میں ہے۔ ان کے پاس خودکار ہتھیار اور گولیاں دی ہوئی ہیں اور اس فائرنگ سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر رہا تھا کہ شاید ان لوگوں کے مقابلے میں وہ ڈٹ گیا ہے۔

وہ اکیلا کیسے اس کی مدد کرتے؟ یہ سوال بار بار اسے اٹھ رہا تھا۔ پہلے تو اس نے یہ کیا ارادہ کیا کہ وہ واپس ہو جائے اور ساتھیوں کی کمک لے کر یہاں پہنچے۔ اس ارادے کے تحت اس نے ابھی بمشکل دو تین قدم ہی اٹھائے تھے کہ جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کا ضمیر اس کے راستے کی سد سکندری بن کر اس کے سامنے بازو پھیلائے کھڑا تھا۔

"شرفو!" ایک آواز اس کے اندر سے بلند ہوئی۔ "تیرے واپس آنے تک یہاں کیا بچے گا؟ اپنے دوست سے کیسے آنکھیں ملا پائے گا تو——؟ یہ صلہ ہے اس کی دوستی کا؟"

"نہیں——!" شرفو کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ دیوانہ وار پہاڑی کی طرف دوڑنے لگا—— اپنی گن کو اس نے بھاگتے بھاگتے فائرنگ پوزیشن میں کر لیا تھا۔ لوچ دے دے کر پہاڑی سلسلے پر تیز رفتاری سے دوڑنے پر وہ دو تین مرتبہ ٹھوکر کھا کر گرا بھی، لیکن اس کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی۔

اچانک وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے پہاڑی سے نیچے آنے والے راستے پر دو عورتوں کو اپنی طرف بھاگتے دیکھا۔ شرفو بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ زہراں اور شیرو کی ماں ہی ہیں۔ اب ساری بات خود بخود اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ لالہ نے فائرنگ کی آواز میں انہیں پچھلے راستے سے فرار کروا دیا ہے۔ شرفو سے ان کا فاصلہ بمشکل تیس چالیس گز تھا لیکن انہوں نے شاید اسے دیکھا نہیں تھا۔ شرفو نے اپنا رخ بدلا اور ان کی مدد کو لپکا۔

شیرو کی ماں نے اپنی جانب آتے ہوئے شرفو کو پہچان لیا—— زہراں نے اگرچہ اس سے پہلے دو تین مرتبہ ہی اسے دیکھا تھا، لیکن وہ بھی اسے پہچان گئی۔ دونوں عورتیں اسے ہمدرد جان کر اس کی طرف لپکیں، لیکن اچانک ہی اگر شرفو نے ان سپاہیوں کو دیکھ کر ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں چھلانگ نہ لگا دی ہوتی تو رائفل کی گولیاں اسے چاٹ لیتیں۔

ڈوگرہ فوج کا ایک سیکشن جو تین چار سپاہیوں پر مشتمل تھا، پتا چلتا کسی نہ کسی طرف

پکر کھا کر پہاڑی کے ایک پہلو پر ایسی پوزیشن میں آ گیا تھا جہاں سے وہ لوگ اور
راستے پر نظر رکھ سکتے تھے۔

——انہوں نے تو اپنی دانست میں دونوں عورتوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے
کی تھی تاکہ وہ سہم کر رک جائیں اور گرفتاری کے لیے خود کو پیش کر دیں' لیکن نیزہ
ماں فائرنگ کی رینج میں آ گئی اور تھری ناٹ تھری رائفل کی دو طاقتور گولیاں اس کے پہلو
پشت میں گھستی ہوئی پار نکل گئیں۔ وہ زمین پر گری ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی تھی
فائرنگ کرنے والوں کو شاید اپنی بیوقوفی کا احساس ہو گیا تھا یا کورٹ مارشل کا خوف
گیر تھا کہ انہوں نے فائرنگ روک دی۔ ان کی نظر اب تک شرفو پر نہیں پڑی تھی جو
آنکھوں میں شیرو کی ماں کو گولیاں کھا کر گرتے ہوئے دیکھ کر خون اتر آیا تھا اور جس کا
بڑی عجلت میں اپنے پہلو سے لٹکتے کینوس کے تھیلے میں رینگ گیا تھا۔ وہ شاید گرنیڈ نکال
ان لوگوں پر پھینکنا چاہتا تھا' لیکن اچانک اس نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ حملہ آور عورتوں
اتنا قریب آ گئے تھے کہ گرنیڈ پھٹ کر عورتوں کو بھی ان کے ساتھ ہی اڑا دیتا۔ ہوش
زیادہ ہوش کی ضرورت تھی۔ اس نے بڑی پھرتی سے ہاتھ باہر کھینچا اور دوسرے ہی لمحے
حملہ آوروں سے نمٹنے کے لیے تیار تھا جو اپنی گنوں کے سلنگ کندھوں سے لٹکائے
چلے آ رہے تھے اور ابھی وہ زہراں سے بمشکل پانچ چھ گز دور ہی تھے جب شرفو اچانک چٹا
اوٹ سے نمودار ہوا۔ زہراں شیرو کی ماں پر جھکی ہوا سے سنبھالا دے رہی تھی۔

"بزدلو——!" نفرت اور غصے سے شرفو پھٹ پڑا۔ اس کی گن کی سرخ لپکی زبان باہر
لپکی اور قبل اس کے کہ حیرت زدہ اور بھونچکے حملہ آور اپنی رائفلیں کندھوں سے اتار کر
سیدھی کرتے' ان کے خون میں نہائے ہوئے لاشے ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے—— لیے
اور نفرت سے کھولتے ہوئے اشرف خان نے پوری میگزین ہی ان پر خالی کر دی تھی۔ ان
مناظر نے زہراں کو لرزا کر رکھ دیا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ اس کا
حلق خشک ہو چلا تھا۔ اس نے چلانا چاہا' لیکن نطق نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

"ماں جی—— ماں جی!" شرفو نے جھکتے ہوئے شیرو کی ماں کا کندھا آہستہ سے ہلا کر
اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

کشمیر کی دم توڑتی آنکھوں نے آخری منظر اس کے ذہن کو منتقل کر دیا تھا۔

——اور ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر خود بخود پھیل گئی۔ اور کشمیر نے بہ
سے پہلے دیکھ لیا تھا کہ اس کی مٹی کے ایک سپوت نے اس کے جیتے جی اس کے قاتلوں

ہیرو کردار تک پہنچا دیا ہے۔ اس میں کہاں اتنی طاقت کہ
دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں رکھ کر
اور پھر کشمیر کے ہونٹ اکھڑتے انگاروں کی طرح شرفو کی پیشانی پر ثبت ہو گئے۔
"شرفو——! میرے بچے تو آ گیا—— شیرو کہاں ہے؟" ڈوبتی اور ابھرتی ہوئی
سے کہنے لگی۔
"وہ بھی ابھی آ جائے گا ماں جی——! ابھی تھوڑی دیر میں—— بس آتا ہی ہو
گا۔"
—— شرفو کے منہ سے بے اختیار یہ فقرے نکل رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ
رہا تھا کہ ماں کو کیا بتائے۔ کیسے بتائے کہ اس کا بیٹا تو یہاں سے بیسیوں میل دور موت کی
اس شاہراہ پر اپنے سفر کا آغاز کر چکا ہے جہاں سے لوٹ کر آنا اب شاید اس کے بس میں بھی
نہ ہو۔

اس اثناء میں زہراں کے حواس بحال ہو چکے تھے۔ اس نے لرزتے ہوئے گلے سے
"چاچی" پکارا تو شیرو کی ماں نے کمال ضبط سے اس کے دائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر
اپنے سینے پر رکھ لیا۔

"بہت دیر ہو گئی بیٹا۔ اس نے بہت دیر کر دی——!" بمشکل اس کی زبان لڑکھڑائی۔
"ہاں جی! میں آپ کے لیے....."
—— شرفو نے کچھ کہنا چاہا' لیکن ماں نے اس کی بات کاٹ دی۔
"بیٹا!" اس کی آواز لرزی۔ "اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"
——اس لمحے اس کی آنکھیں شرفو اور زہراں سے ہٹ کر آسمان پر گڑی ہوئی تھیں
جیسے وہ کسی کھوئی ہوئی انمول شے کا سراغ لگا رہی ہوں—— اور اس کے ہونٹ لرز رہے
تھے۔ "مولا! میرے مولا—— میرا بچہ..... میری زہراں..... کشمیر....." اس نے
ہچکی لی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

☆○☆

"چاچی" زہراں کی دلدوز چیخ سے شرفو کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ وہ اس کے سینے پر سر
رکھے سسکیاں لے رہی تھی۔ خود شرفو کو یوں لگا جیسے کسی نادیدہ ہستی نے اس کے اندر
داخل ہو کر اس کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر زور سے مسل دیا ہے۔ اس کے منہ کا ذائقہ
کڑوا ہونے لگا۔ ایک سنسناہٹ سی اس کے خون میں دوڑ کرنے لگی تھی—— کشمیر کی

واسطن حرت کا ایک درخشندہ باب اس کے سامنے کھلا تھا۔ ایک لمبی اور تھکا دینے والی دوڑ کے بعد بلور کشمیر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی تھی۔ وہ جس سے آزادی کی بیعت چھڑا دیا تھا' اب اپنے بچے کو آزادی کی شاہراہ گزار پر روانہ کر کے سرخرو ٹھہری تھی۔

جلد ہی شرفو پرسکون ہونے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گرد و پیش پہاڑوں اور سبزے کا سارا حسن ماں میں سمٹ آیا ہو۔ کشمیر کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سورج کی کرنوں کا ہالہ بلور کشمیر کے چہرے کے گرد پھیل گیا اور اس میں سے ایک عجیب قوت خارج ہو کر شرفو کے تن بدن میں سرایت کرنے لگی۔ ایک ولولہ تازہ اسے سیر کرنے لگا۔

ماں کی موت نے اس کے دم توڑتے ارادوں میں بجلیاں سمو دیں۔ ایک کوندا سا لپکا۔ اسے قوت ارادی کی دولت سے مالا مال کر گیا۔ شیرو کی ماں نے مر کر اسے جینے کی راہ دکھائی تھی۔

اس لیے اس نے بلور کشمیر کی لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر عہد کیا تھا کہ وہ اس کے عظیم مشن کو زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رکھے گا۔ اس نے جھک کر ماں کی پیشانی کا بوسہ لیا' پھر اس کے چہرے کو اس کی خون آلود چادر سے ڈھانپ کر سسکیاں لیتی زہراں کو بازو سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔

پہاڑی کی دوسری طرف فائرنگ کی آواز اب کم پڑتے پڑتے ختم ہو چکی تھی۔ شاید غیر ملکی درندوں کے سامنے اب کوئی مدافعت باقی نہیں بچی تھی۔ شرفو جانتا تھا کہ اب وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح زہراں کو بو سونگھتے اس طرف آئیں گے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ پہلے اس نے ماں کی لاش کو دفن کرنے کا ارادہ کیا' لیکن پھر اسے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

"چلو زہراں" اس نے زہراں کے بازو کو ہلکا سا اپنی سمت کھینچا تو وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح اس پر آ رہی۔ اس کی سسکیوں اور سینے کا زیر و بم شرفو کے خون میں چنگاریاں دوڑانے لگا تھا۔

چند لمحے ---- اس نے شاید کسی لاشعوری خواہش کے تحت اس محل سے چھٹکارا پانا مناسب نہ جانا' پھر جیسے وہ اچانک گہری نیند سے جاگ اٹھا۔ یہ زہراں تھی ---- اس کے دوست کی الفت۔ وہ شیرو کی ماں کو تو بچا نہیں سکا تھا لیکن زہراں ---- خدانخواستہ زہراں غم کے سنگ چلی گئی تو وہ کبھی خود کو معاف نہیں کرے گا۔ "وہ لوگ اب اسی طرف"

بچے ہیں زہراں۔ وقت بہت کم ہے بلو۔" میں نے روایں کو اس سے الگ کیا اور اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ لیا۔ "ہمیں یہاں سے اسے قریب کھینچتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ اچانک وہ رک گیا۔ زہراں کی چیخ اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ اس کی طرف لپکا۔ اس کے نزدیک پہنچتے پہنچتے وہ اچانک ہی چپ ہو گئی تھی۔ وہ خوف سے آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے روتے روتے وہ اچانک ہی چپ ہو گئی تھی۔

"تم یہیں واپسی تک یہیں بیٹھی رہنا۔"

اس نے خوفزدہ زہراں کو ایک محفوظ جگہ میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

زہراں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ وا کیے' لیکن اس کا گلہ خشک ہو رہا تھا۔ شرفو حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ مختلف ٹیلوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے شرفو کو اپنی سمت آنے والے راستے میں ایک بلند ٹیلے کے پیچھے چھپتے دیکھا۔ ---- خوف کے مارے اس کی ہتھیلیاں پسینے میں نہا رہی تھیں۔ اس قدر جیسے اپنے سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آ گرے گا۔ ایک ایک لمحہ قیامت خیز تھا۔ اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی' پھر اچانک جیسے اس کی شریانوں میں دوڑتا خون رک گیا۔ اس نے راستے کے اسی موڑ پر ایک دوسرے کے تعاقب میں آتے پندرہ بیس خونخوار سپاہیوں کو دیکھا۔ ---- جونہی وہ لوگ اس مقام پر پہنچے جہاں شرفو فرشتہ اجل بنا ان کا منتظر تھا' کیے بعد دیگرے دو زوردار دھماکے ہوئے اور گویا تمام آوازوں کے لیے حشر بپا ہو گیا ---- ان کے سروں پر قیامت ٹوٹی اور زہراں نے ان کے جسموں کے خون میں نہاتے ہوئے پتھروں اور گرد و پیش فضا میں اچھلتے دیکھے۔

---- اور لمحہ بھر بعد اس گرد اور خون کے پس منظر سے اس نے شرفو کو ہنستے ہوئے اپنی سمت آتے دیکھا۔ ایک پرسکون سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔ بالکل اس مزدور کی طرح جسے دن بھر کی محنت کا صلہ خلاف توقع بہت زیادہ مل گیا ہو۔

"آؤ زہراں۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ سائے پہاڑی سلسلوں میں لرزتے دھبوں سے دور بہت پیچھے جا رہے تھے۔

☆○☆

۲۹ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح جنرل طارق اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تازہ ترین صورتحال کا

HBC

ی ایک اپل اور کمانڈی انہیں نظر آئی۔ اڑیوں میں سے قبائلی مجاہدین بھی
شرکت کرنے کے لیے سری نگر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ تازہ کمک تھی جو
کر جنگ میں شمولیت اختیار کرنا اور وہاں پہلے سے موجود مجاہدین کا ساتھ
سے قریباً" پچاس میل دور اوڑی کے نزدیک پل ٹوٹا ہوا تھا۔

یہ پل پسپا ہوتی مہاراجہ کی فوج نے پٹھانوں کی یلغار کی رفتار سست کرنے کے لیے
تھا' لیکن مقامی مجاہدین نے فوراً" اس کا حل تلاش کر لیا۔ انہوں نے پہاڑوں سے
قریباً" ڈیڑھ میل لمبی پکی سڑک بنا کر پیش قدمی کرتے مجاہدین کی یہ مشکل حل کر دی۔
اس راستے سے نکل کر قبائلی مقبوضوں کی طرح مہاراجہ کی (اپنی والیست میں محفوظ)
پر پہنچے اور وہاں بمشکل ہی کوئی خوش قسمت فوجی جان بچا کر بھاگ پایا تھا۔ ان کی
یہ عالم تھا کہ ان کے محاذ پر پہنچنے سے پہلے ہی ڈوگرہ فوج وہاں سے پسپائی اختیار کر لیتی تھی
ڈوگرہ فوجی "مقابلہ" نہیں "مدافعت" کر رہے تھے تاکہ وہ محفوظ طریقے سے پسپا ہوتے
ہوئے سری نگر تک پہنچ جائیں اور ان کا کم از کم جانی نقصان ہو اور وہاں سے تازہ کمک
حاصل کر کے وہ دوبارہ پوری شدت سے قبائلی مجاہدین پر حملہ آور ہوں۔

مظفر آباد سے قریباً" اسی میل دور "وادی کشمیر کا دروازہ" بارہ مولا واقع ہے جس کا زیادہ
تر رقبہ میدانی ہے۔ یہ شہر سیاحوں کی جنت تھا' لیکن بھارتی فضائیہ کی پچھلے دو روز کی بمباری
اور پسپا ہوتی ڈوگرہ فوج نے اسے آثار قدیمہ کے کھنڈرات میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ مجاہدین
یہاں ۲۶ اکتوبر کو پہنچ گئے تھے اور ۳۵ میل دور واقع مہاراجہ کا محل سری نگر میں دریائے
کنارے بائیں پھیلائے ان کا منتظر تھا۔ بھاگتی ہوئی خونزدہ ڈوگرہ افواج میں ہرگز اتنا دم خم باقی
نہ تھا کہ وہ ان کے آڑے آئیں۔ منزل نظروں کے سامنے تھی' حوصلے مضبوط' مورال بہت
ہوا اور دشمن پر کاری ضرب لگانے کا بہترین موقع میسر تھا' لیکن جاہ و منصب کی خواہش کا برا
ہو کہ اس نے ان سربلندوں کے بڑھتے قدم وہیں روک لیے۔

تاریخ حریت کا وہ سیاہ باب ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام یہاں لکھا گیا جو ہمیشہ آزادی پسندوں
کو خون کے آنسو رلائے گا۔

میجر خورشید انور نے جو قبائلی مجاہدین کا کمانڈر تھا' جب سری نگر کو پکے ہوئے پھل کی
طرح قبائلی مجاہدین کی گود میں گرتے دیکھا تو کمزور انسانی فطرت کا شکار ہو کر خود غرضی کی
دلدل میں پھنس گیا۔ اس نے مجاہدین کو وہیں منصوبہ بندی کا بہانہ کر کے روک لیا اور خود
قبائلی سرداروں کو یہ پیغام بھیج کر وہیں بلایا تاکہ وہ اسے آ کر بتائیں کہ نو آزاد مملکت کی

بنیاد رکھنے میں اسے کتنا حصہ ملے گا اور کشمیر کی سونے کی کان میں اس کی حیثیت کیا ہو گی؟

وہ دن اس سودا بازی اور سیاست گری کی نذر ہو گئے اور ۲۷ اکتوبر کو جب اسے ہوش
آیا تو ایک ۔۔ ہزار بردار بہاڑوں میں چھپی بھارتی فوج اس سے تصور ہی کی پہنچ سے دور بارہ مولا سے
ہو چکی تھی۔

مجاہدین نے حسب روایت جان توڑ حملہ کیا۔ یہ حملہ ۲۷ اکتوبر کی شام کو ایئرپورٹ
اب مقابلے پر بہترین اور جدید ہتھیاروں سے لیس مستعد فوج تھی جسے زبردست تحفظ حاصل تھا۔
حاصل تھی۔ حملہ پسپا کر دیا گیا اور پٹھان اپنے زخمی اور لاشیں ساتھ لے کر پیچھے ہٹ آئے
جب جنرل طارق سری نگر پہنچے تو لڑائی اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھی۔ ہمارا فائرنگ کے دھماکوں سے گونج رہا تھا' لیکن معرکہ ابھی دور تھا۔ انہوں نے اپنی جیپ کی ہیڈلائٹس بجھا دیں اور اس سڑک پر آگے بڑھتے گئے جو سری نگر کو جاتی ہے۔

یہ خدشہ ان کے ذہن میں پھن پھیلائے کھڑا تھا کہ اس سڑک پر بھارتی فوج بھی قابض ہو سکتی ہے کیونکہ ابھی صورت حال واضح نہیں ہو رہی تھی۔ ان کو آخری اطلاع یہی ملی تھی کہ شہر کے باہر دور اوپر کے پہاڑوں میں جنگ جاری ہے۔ وہ جیپ کی چھیں بجھائے ہوئے اب آہستہ آہستہ چلتے بارہ مولا سے ۱۰ میل آگے آ چکے تھے' پھر ایک تنگ درے کے اندھیرے میں جلتے الاؤ کی روشنی نے انہیں رک جانے پر مجبور کر دیا۔

تجدید عہد

رات کے دوسرے پہر لالٹین کی مدھم لو اس نے بڑھا دی تھی اور سب سے پہلے سے تیار تھا۔ بالآخر وہ لمحہ بھی آگیا: جب اسے دروازے پر مخصوص دستک سنائی دی۔ نووارد نے دروازے کو ایک خاص انداز سے تین مرتبہ بجایا تھا۔

"کون؟" محمد گوجر نے دروازے کی جھری سے منہ لگاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"صمد" جواب میں ایک لفظ کے سوا اسے اور کچھ سننے کو نہ ملا۔

دل کی بے قابو دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اس نے اگلا کوڈ دہرایا۔ "کہاں سے آئے ہو؟"

"جموں۔" دوسری طرف سے پھر ایک ہی لفظ پر اکتفا کیا گیا۔

محمد نے دروازے کی کنڈی کرا دی۔

"صاعقہ۔" نووارد نے کہا جس کا سارا چہرہ سیاہ رنگ کے کپڑے میں ڈھکا تھا۔

"صاعقہ۔" محمد گوجر نے پکارا اور آنے والے نے "السلام علیکم" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اپنا چہرہ ننگا کر دیا۔

"امیر خان۔" بے اختیار محمد کے منہ سے نکلا۔

"محمد ---- میرے یار!" امیر خان اس سے بغل گیر ہو گیا۔

---- دونوں ہی اس حسن اتفاق پر خدا کے شکر گزار تھے۔ آج تقریباً سال بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی ---- آخری ملاقات محمد کو کل کی طرح یاد تھی۔ دونوں انڈین آرمی سے اکٹھے فرار ہو کر برما میں سبھاش چندر بوس کی "آزاد فوج" میں شامل ہوئے تھے جہاں جاپانیوں نے ٹریننگ دے کر انہیں واپس ہندوستانی فوج کو سپوتاژ کرنے اور وہاں سے اطلاعات حاصل کر کے "جاف" (جاپان انٹیلی جنس) کو پہنچانے کا فریضہ سونپا گیا تھا۔

دونوں نے اپنا کام کلکتہ کی گودی میں کام کرنے والے مزدوروں کا بھیس بدل کر بڑے شاندار طریقے سے انجام دیا تھا۔ یہیں سوئے اتفاق سے نبی خان سویداروں سے ٹکرا گیا جو

گھر گھر گھوم کر بہاش چندر بوس کی طرز پر مسلمان افسروں کی مدد سے ایک انقلابی
تشکیل دینے کے خبط میں مبتلا تھا۔

نبی خان جموں کا رہنے والا تھا۔ جلد ہی وہ آپس میں گھل مل گئے۔ نبی خان کی
نظروں نے جانے ان میں کیا دیکھ لیا تھا کہ وہ انہی کا ہو کر رہ گیا۔

ہر روز شام کے بعد وہ لوگ ایک پارسی کے چھوٹے سے ہوٹل کے مخصوص
اکٹھے ہوتے جہاں ایک عالم کی سیاست زیر بحث آتی۔ دونوں دوست یہ بات شدت سے
محسوس کرتے کہ نبی خان جب عالم اسلام کا ذکر کرتا تو حد سے زیادہ جذباتی ہو جاتا۔ برصغیر
برصغیر کے مسلمانوں کی دگرگوں حالت زیر بحث آنے پر تو اس کی حالت دیدنی ہوتی۔
——اس کے اسی "جذبۂ دلنشیں" سے متاثر ہو کر ایک روز جب امیر خان نے
کے سامنے "آزاد ہند فوج" کا ذکر چھیڑا تو نبی خان کے لیے جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔
اس نے دو تین ملاقاتوں ہی میں دونوں کے جذبہ آزادی کو ایک واضح سمت کی
کر دی اجور ایک روز جب اس نے کھل کر اپنے مقاصد ان کے سامنے بیان کیے تو
نے بے اختیار اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اس پر اپنی طرف سے بہت بڑا انکشاف کیا
ان کا تعلق آزادی ہند فوج سے ہے' لیکن یہ کہہ کر تو نبی خان نے ان کے ارمانوں پر
اوس ہی ڈال دی کہ وہ انہیں روز اول سے جانتا ہے—— اس نے اپنی بات کی
ثبوت میں جب انہیں ان کے پچھلے آٹھ دس روز کے معمول سے آگاہ کیا تو دونوں اس
خداداد ذہنی صلاحیتوں کے گرویدہ ہو کر رہ گئے۔

نبی خان نے ان کا باقاعدہ تعاقب کر کے نہ صرف کلکتہ میں ان کا "رنگ" ڈھونڈ لیا
بلکہ یہاں ان کے "ذرائع" بھی اس کی نظر میں آ چکے تھے۔

اس روز وہ تینوں پارسی کے تندور نما ہوٹل سے اٹھ کر ایک "کھولی" میں آن بیٹھے جو
نبی خان کی ملکیت تھی۔ یہاں آ کر ان پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ نبی خان یہاں منو
لال سوامی جی کے نام سے مشہور ہے اور اردگرد کی قریباً سبھی "کھولیوں" میں اس کے چیلے
رہتے ہیں۔ وہ لوگ اس کی پوجا ایک گرو کے سمان کرتے تھے۔

"کسی بات پر حیرت کا اظہار نہ کرنا—— یہ بھی اپنی عادت بنا لو۔" نبی خان بولا۔ "میں
تو تم بھی سابقہ رائل انڈین آرمی انٹیلی جنس (I N I) اور موجودہ چلپانی محکمہ جاسوسی کے زبردست
یافتہ ہو' پھر بھی ممکن ہے کچھ باتیں تمہارے لیے چونکا دینے والی ہوں۔"

——یہ تھا وہ پہلا آوزار جو مستقبل میں کشمیر کو ڈوگرہ اور انگریز سامراج کی ریشہ

دوانیوں سے نجات دلانے کا عزم لے کر میدان عمل میں اترنے والی ہمہ گیر "تنظیم" کے
پہلے سپاہی نے انہیں دیا تھا۔

وہ ساری رات تینوں نے گفتگو اور بحث و تمحیص کی بعینہٖ چھاؤنی۔ نبی خان نے
انہیں اس بات کا قائل کر لیا تھا کہ انگریزوں کے برصغیر سے چلے جانے کے بعد بھی تنہا
کے مسلمان کبھی آزادی کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہو سکیں گے۔ لہٰذا یہ کہ وہ آزادی کے
حصول کے لیے ہتھیار نہ اٹھالیں۔

"میں نے پندرہ سرفروش اکٹھے کر لیے ہیں۔" نبی خان نے انہیں بتایا۔

"کون ہیں وہ؟" دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہیں——!" نبی خان نے ایک لمبا سانس لیا۔ "میں تمہیں کیا بتلاتے جا رہا تھا کہ
ہماری تنظیم کی بنیادیں اس اصول پر رکھی جا رہی ہیں کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے تعارف
حاصل نہیں کریں گے—— جہاں ایک دوسرے سے تعارف ناگزیر ہو' وہاں البتہ دوسری
بات ہے۔ پھر اصل بات تو ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد ہے۔ اس کے
لیے کیا طریق کار اختیار کیا جائے کہ کچھ کرنے سے پہلے ہی تنظیم اپنی موت آپ نہ مر
جائے؟ یہ سوچنا میری ذمے داری ہے کیونکہ جن لوگوں کے خلاف ہم نبرد آزما ہونے جا رہے
ہیں' میں نے یہ فن جاسوسی اور تخریب کاری انہی کے درمیان انہی کی سرزمین پر رہ کر انہی
سے سیکھا ہے۔"

——دونوں ہونقوں کی طرح نبی خان کا چہرہ تک رہے تھے جو اس لمحے انہیں کسی اور
ہی دنیا کا پراسرار بندہ نظر آ رہا تھا۔

"ہاں دوستو! ہم چونکہ مستقبل میں ایک نیا اور انوٹھا رشتہ قائم کرنے جا رہے ہیں' اس
لیے تمہیں کسی حد تک اپنا تعارف ضرور کرواؤں گا۔ میں نے گنیچو ایم۔ آئی اور رائل
انڈین انٹیلی جنس سبھی کے لیے کام کیا ہے' لیکن خدا جانتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے تھا
کہ میں دشمن کا داؤ اسی کے خلاف استعمال کرنے کے فن سے آگہی حاصل کر سکوں اور
آج جب مجھے قدرت نے کسی قابل کیا ہے تو جان سے گزر جانے کا عزم لے کر——
برصغیر کی گلی گلی کوچے کوچے میں ان طالع آزماؤں کی تلاش کر رہا ہوں جو اپنوں اور پرایوں
کی ریشہ دوانیوں کے شکار ہیں مگر جن کے دل تو زندہ ہیں' لیکن جن کی تلواریں زنگ آلود
اور بازو شل ہو چکے ہیں۔"

رخصت کے وقت جب تینوں نے خدا کو حاضر ناظر جان کر اپنا تن من دھن اور کشمیر

کے لیے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ لے کر نذر کرنے کا عہد اختیار کر لیا۔
گورنر نے انہیں کہا تھا۔

"آج کے بعد میں تمہیں اس بستی میں کبھی نظر نہیں آؤں گا۔ تم تینوں بھائی ہو۔ نبی خان نام کا کوئی آدمی تم سے کبھی ملا تھا۔ بس فی الوقت تمہیں اسلحہ حاصل کرنا ہے۔ کے حصول کی ترکیب سے میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے اور آئندہ تم جہاں کہیں بھی ہو گے میں خود ہی تم سے رابطہ پیدا کر لیا کروں گا۔"

پھر تینوں نے ہاتھ پھیلا کر خدائے بزرگ و برتر کے حضور کامیابی کی دعا کی اور ایک دوسرے کو "فی امان اللہ" کہہ کر اپنی اپنی راہ لی۔

☆○☆

دوسری جنگ عظیم اور آزاد ہند فوج کے خاتمے تک نبی خان نے صاعقہ کے جانبازوں کی صرف ذہنی اور جسمانی تربیت ہی کی تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ عملی میدان میں کود پڑے۔ اس نے صاعقہ کے مختلف کمانداروں کو مختلف ذمے داریاں سونپ کر انہیں ملک کے کونے کونے کی طرف روانہ کر دیا۔

تقسیم ہند کے اعلان تک صاعقہ کے مٹھی بھر سرفروش سارے کشمیر میں پھیل کر اپنے قدم مضبوطی سے جما چکے تھے۔ فی الوقت انہیں "انتظار کرو اور دیکھو" کی پالیسی اپنانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس کے بعد انہیں اپنی اصلیت کو چھپائے رکھتے ہوئے مقامی آزادی پسندوں کے ساتھ عملی جدوجہد میں شامل ہونے کا حکم ملا۔ یہ ان لوگوں کی تربیت تھی جس نے انہیں جلد ہی مجاہدین کے نزدیک ممتاز کر دیا۔

انہی سربلندوں میں سجاول اور حسین خان بھی شامل تھے۔

ممدو کو جب پونچھ میں قیام کرنے اور ڈوگرہ چھاؤنی کو دودھ سپلائی کرنے کا حکم ملا' تب اسے علم ہوا کہ مجاہدین میں حسین خان کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے' لیکن ابھی تک اسے حسین خان سے براہ راست ملاقات کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسے یقین تھا کہ حسین خان کو بھی اس کی موجودگی کا علم نہیں ہے۔ اسے تو صرف سجاول کا پتہ تھا یا پھر اس درخت کی سیدھ میں شمال کی جانب رکھے بڑے سے پتھر کا' جو شہر سے باہر جنگل کو جانے والے راستے کے ایک کونے میں تیز رو نالے کے کنارے تن تنہا جانے کب سے کھڑا اپنے گرد کے کیکروں کے بے بسی کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ سجاول کی طرف سے اسے جو پیغام زبانی یا تحریر کی صورت میں ملتا' ممدو اسے بڑے سے پتھر کے نیچے دبا کر چلا آتا اور اگلے روز وہیں سے دوسرا حکم وصول

کر لیتا۔ انتہائی خفیہ طریقہ تھا وہ لیکن بیشتر کی جنگل سے لے کر استعمال کرتے تھے۔
نبی خان نے ہی انہیں بتایا تھا۔

نبی خان بھی تو پراسرار طریقہ سے ابھرا تھا۔ لیکن جب اس نے ہوش سنبھالا تو اس کی ساری جھنجلاہٹ اور الجھن ختم ہو گئی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ پوری طرح کی شیبہ کر اپنے کام میں جت جاتا۔ اسے نبی خان سے ایک سچے ہمدرد اور مخلص ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔ اور عقیدت کا یہ رشتہ ہر نئی صبح بیدار ہونے پر ممدو کو پہلے سے زیادہ توانا اور اپنے اندر نئی امنگ محسوس ہمت دلا رہا تھا۔

پچھلے دو ڈھائی سال میں اس کی ملاقات نبی خان سے بمشکل تین چار مرتبہ ہو پائی تھی۔ لیکن اسے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے نبی خان کی پراسرار اور طلسماتی قوت کی مالک آنکھوں نے مسلسل اسے اپنی زد میں رکھا ہوا ہے۔

سجاول بنیادی تھانے کا سپاہی تھا اور کبھی کبھی ممدو کو جب تین دن وہ جاتا تھا کہ آخر سجاول نبی خان سے کیسے ٹکرا گیا۔ پھر وہ یہ سوچ کر خود بخود مطمئن ہو جاتا کہ ظاہر ہے نبی خان کے لیے کسی دوسرے عالم کی مخلوق سے کوئی تعلق پیدا کر لینا بھی کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔

اعلان آزادی سے پہلے ہی کشمیر کی سیاست کے دھارے نے جو اچانک پلٹا کھایا اور جس طرح انگریز اور ہندو کی ملی بھگت نے اسے کچلے ہوئے پھل کی طرح بھارت کی جھولی میں ڈال دیا تھا' اس بات نے اس کی نظروں میں نبی خان کی اہمیت کئی گنا بڑھا دی تھی۔ اسے وہ رات یاد آنے لگتی جب کلکتہ کی ساحلی آبادی کی وہ کھولی یاد آنے لگتی جہاں کبھی گورو منوہر لال نے اسے اور امیر خان کو ہو بہو مستقبل کی یہی تصویر دکھائی تھی۔

"نبی عالم کے اندازے کتنے صحیح تھے ـــــ!"

☆○☆

پچھلے دنوں جب وہ سجاول کا ایک خط رات کے اندھیرے میں اس پتھر کے نیچے رکھ کر آیا تھا تو اس کا جواب اسے تین روز بعد ملا تھا۔ اس دوران سجاول کی طرف سے "رپورٹ" بند ہو گئی تھی۔

ـــــاور اس خبر نے ممدو گوجر کو خاصا پریشان کر دیا تھا کہ سجاول گرفتار ہو چکا ہے۔ سجاول کی گرفتاری کے بعد سے اسے اپنے گرفتار ہونے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ گو کہ سجاول کو اس کی قیام گاہ کا علم نہیں تھا' لیکن پونچھ کوئی ایسا بڑا شہر بھی نہیں تھا کہ اسے ڈھونڈا ہی نہ جا سکے ـــــ ان کی تنظیم کے کسی باقاعدہ رکن کی یہ پہلی گرفتاری تھی۔

ممدو کو امید یہی تھی کہ اب اسے یہاں سے کہیں اور چلے جانے کا روپیل ہوسکے گا۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ کچھ حیران اور پریشان بھی ہوا کہ اسے امیر خان کی آمد کا مقصد اور کر اس کو بتائے گئے طے شدہ منصوبے پر عمل کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

اور آج امیر خان آگیا۔

"کہاں غائب رہے اتنے دن؟" قہوے کی پیالی میں تیسری مرتبہ قہوہ انڈیلتے ہوئے اس نے اپنے دیرینہ دوست کو مخاطب کیا۔

"یہیں سری نگر میں——! پھر یکایک مجھے ٹھکت پہنچنے کا حکم ملا۔ لمبی کہانی ہے پھر کبھی سناؤں گا۔" اس نے گہری سانس لی اور یوں بیزاری کا اظہار کیا جیسے اس موضوع پر بات کرنا پسند نہیں کرتا۔

ممدو نے یہ بات محسوس کر لی تھی۔ اسی لیے اس نے نہایت غیر محسوس انداز میں گفتگو کا رخ بدل کر ٹھکت کی باتیں شروع کر دیں۔ رات کا دوسرا پہر ہو چلا تھا' لیکن نیند دونوں کی آنکھوں سے غائب تھی اور دونوں ہی ایک دوسرے سے "مطلب کی بات" شروع ہونے کی توقع لگائے ہوئے تھے' لیکن دونوں ہی جیسے گفتگو کا آغاز کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ بالآخر ممدو گوجر نے ہی ہمت کی۔ "مجھے مرکز کی طرف سے بڑی غیر مبہم سی ہدایات ملی ہیں۔ تم شاید بہتر بتا سکو۔" اس نے امیر خان کو مخاطب کیا۔

"ممدو——!" امیر خان نے پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے الٹا ہاتھ مونچھوں پر پھیرا۔ اس کی پرانی عادت تھی جسے وہ اب تک ختم نہیں کر سکا تھا۔ "میرے ساتھ یہاں دس پندرہ آئے ہیں۔ آٹھ مقامی ہیں اور دو سری نگر سے۔ کل تم مجھے بھی اپنے ساتھ چھاؤنی لے جاؤ۔ مقامی ورکر سے یہی اطلاع ملی ہے کہ رام سنگھ سجاول کو چھاؤنی میں لے آیا ہے۔

——بظاہر تو وہ مسلمانوں پر احسان کرتا ہے' لیکن اصلیت کا علم اسے ہو چکا ہے۔ اسے اس بات کا یقین ہو چلا ہے کہ پولیس میں موجود نوے فیصد مسلمانوں کے دل مجاہدین کے ساتھ اور زبانیں مہاراجہ کے ساتھ ہیں۔ خصوصاً" زہراں اور شیرو کے فرار کے بعد سے اس کا انسپکٹر میر پر بھی اعتبار اٹھ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی موت کے بعد یہاں ہندو انسپکٹر کو لایا گیا ہے۔ حالانکہ عموماً" یہاں مسلمان انسپکٹر ہی رہتا ہے اور اگر رام سنگھ اسے تھانے میں رکھتا تو ہمارے لیے معاملہ زیادہ مشکل نہیں تھا' لیکن اب بات دوسری ہے۔" وہ رک کر لمبا سانس لیا اور اپنی کہی باتوں کا ردعمل ممدو کے چہرے پر تلاش کرتا ہوا بولا۔ "ہمیں اصل میں دو کام کرنے ہیں ممدو بھائی۔"

ممدو بے اختیار ہی ایک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

وہ ایک تو سجاول کو ان حوالیوں کے پیچھے سے ٹالنا چاہتا تھا اور حسین خان کی بات پوری نہیں

"کون سی بات؟" ممدو نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس نے میجر رام سنگھ کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ پونچھ سے جانا ہی نہ چاہتا تو وہ لوگ اسے واپس لے۔"

"لیکن اس کے لیے یہ کام اتنا مشکل....."

"ہاں اس کے لیے یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی۔" امیر خان نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن حالات اتنی تیزی سے بدل گئے ہیں کہ اس کے لیے اس معاملے کی طرف توجہ دینے کا وقت نہیں رہا۔ اچانک ہی بھارتی فوج نے مداخلت کی اور نہتی خان نے اسے ہمیں واپس لانے کا حکم دیا۔"

"ٹھیک ہے امیر خان۔" ممدو کی آواز اس لمحے کچھ بدلی بدلی دکھائی دے رہی تھی۔ "پھر تم ہمیں پیچھے نہ پاؤ گے۔ میں اس راستے پر پیش آمدہ قیامتوں سے خبردار ہونے کے بعد ہی اس پر چلا تھا۔"

"میرے خیال سے اب تھوڑا آرام کر لیں' صبح اٹھ کر تم نے بھینسیں بھی دوہنی ہیں اور شاید آٹھ بجے تک دودھ بھی پہنچانا ہے۔" امیر خان نے بالآخر کہا۔

"نیند تو اب ہے نہیں اور رات بھی بمشکل ایک پہر باقی ہو گی۔ خیر تم کہتے ہو تو کمر سیدھی کر لیتا ہوں۔" اس نے اپنا دیوار سے ٹکا سر چارپائی پر رکھے سرہانے پر دھر لیا اور رضائی اوڑھ لی۔ اس کی مخالف سمت ویسی ہی ایک چارپائی پر بیٹھے امیر خان نے بھی یہی عمل دہرایا تھا۔

☆○☆

پونچھ سے بڑی سڑک کے ذریعے بارہ مولا کی طرف سے کشمیر جانے کے بجائے انہوں نے ایک ذیلی راستہ اپنایا تھا اور اب وہ لوگ گلمرگ کے راستے سری نگر جا رہے تھے جہاں سے انہیں ایک خصوصی بندوبست کے بعد جموں کی طرف سفر کرنا تھا۔

اس خصوصی "بندوبست" کا علم سوائے حسین خان کے اور کسی کو نہیں تھا اور ابھی تک نبی خان کی طرف سے اسے ایسی کوئی ہدایت بھی نہیں ملی تھی کہ وہ "صاعقہ" کو مجاہدین سے متعارف کروائے۔ بسا اوقات اسے نبی خان کی جانب سے ایسے احکامات خاصی تفتیش بعد میں

بتلا کر دیتے تھے۔ لیکن ایک تو اس نے نبی خان کی "مساوات" کے کمانڈر کی تنبیہ وفاداری کا صاف اظہار تھا اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ آج تک اس نے نبی خان کے فیصلے کو اپنی دانست میں غلط سمجھا' وہ خلاف توقع صحیح ثابت ہوا تھا۔

کبھی کبھی تو حسین خان کو اپنی سوچ سے وحشت ہونے لگتی تھی اور آج بھی اس پر ایسی ہی کیفیت سوار تھی۔ اس نے خیالات کی یورش سے بچنے کے لیے اپنی سوچ کو اور اپنی ساتھیوں پر نظر دوڑائی۔ وہ لوگ پچھلے تین دن سے متواتر سفر کرتے آ رہے تھے سری نگر کے باہر مقیم تھے۔ اپنا اسلحہ انہوں نے تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح اپنے گرم کپڑوں میں چھپا رکھا تھا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے تعاقب میں سفر کرتے یہاں تک پہنچے تھے۔ حسین خان کا ذہن نہ چاہتے ہوئے بھی "شیرو" پر اٹک جاتا تھا۔ اک خلش سی اسے کبھی کبھی کچوکے دینے لگتی۔ وہ یوں محسوس کرنے لگا تھا جیسے شیرو کو اپنے ساتھ لا کر اس نے شیرو کی ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

رات خاصی بیت چلی تھی اور انہیں اپنے عقب سے کبھی کبھی رائفل یا اسٹین گن سے فائر ہونے کی آواز سنائی دیتی۔ رائفل کا دھماکہ اس امر کی نشاندہی کے لیے کافی ہوتا تھا کہ رات کی تاریکی میں بھی پٹھان اپنے شکار سے غافل نہیں اور گشت پر موجود سپاہیوں میں سے جو بدقسمت بھی ان کی رینج میں آ جاتا' اسے قید حیات سے نجات دلائے بغیر نہیں رہتے تھے۔

دور کہیں کسی بھارتی فوج کے یونٹ نے "روشنی راؤنڈ" فائر کیے۔ شاید انہیں سری نگر کی آبادیوں کی کسی "پٹرول پارٹی" کا شک گزرا ہو گا۔ اگرچہ وہ لوگ میدان سے خاصی بلندی پر اور بالکل محفوظ' پھر بھی حسین خان نے اشارے سے سب کو کسی آڑ میں ہو جانے کے لیے کہا تھا۔ اس نے شیرو کو اپنے پاس بلا لیا۔۔۔۔ دونوں اپنے ساتھیوں سے قدرے ہٹ کر بیٹھ گئے۔

سری نگر کی سردی ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی' لیکن مستقبل کے خدشات اور آنے والے حالات کے متعلق سوچ نے وہاں سردی گرمی کا احساس ختم کر دیا تھا۔ ان لوگوں کو یہاں آ کر علم ہوا تھا کہ انہیں یہاں سے بھیس بدلا کر مختلف ٹولیوں کی شکل میں سفر کرنا ہو گا۔

ان کا بھیس کیا ہو گا؟ کون سا روپ دھارنا ہو گا انہیں؟ اس بات کا علم سوائے حسین خان کے اور کسی کو نہ تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" حسین خان نے اس کے چہرے پر سرسری نظر دوڑائی۔ "گرمی یاد آ رہی ہے؟"

شیرو نے اس کی شفقت سے شیرو کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"نہیں چاچا۔۔۔۔ میں ایسی اتنا بزدل نہیں ہوا کہ۔۔۔۔"

"میرا مطلب ہے۔۔۔۔ نہیں تھا شیرو۔ میں تمہیں نہیں تمہارے اسباب کو بھی جانتا ہوں۔" حسین خان نے بڑی چیزی سے اس کی بات کاٹی۔

شیرو محسوس کر رہا تھا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ واقعی سری نگر پہنچنے تک اس کا اس کا پختہ زہراں سے کہنا "جا رہا ہے" تھا۔ اس کا احساس اسے اب ہوا تھا۔ شیرو نے سوچا۔ اس کا پختہ زہراں سے ایسی باتیں نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ آخر وہ ایک عورت ہے اور ایسی عورت جو بدقسمتی سے شیرو سے محبت کرتی تھی۔"

"ہم لوگ جموں کب جائیں گے؟" شیرو نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی غایت

"شاید کل رات کو روانگی ہو۔" حسین خان نے اس کا فرار محسوس کر لیا تھا۔

"سنا ہے جموں کے پورے صوبے میں بڑا ظلم ہوا ہے۔ ہزاروں بے گناہ مسلمان مارے گئے۔" شیرو نے بڑی کڑوی سی بات کہہ دی۔

"ہاں۔۔۔۔! بدقسمتی سے وہاں ہمارے ساتھی منظم نہیں تھے اور ڈوگروں نے بھی ہماری کم تعداد سے فائدہ اٹھایا۔۔۔۔ پاکستان کی طرف سے آنے والے سکھوں نے۔۔۔۔" حسین خان نامکمل بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔

اس نے شہر کی سمت سے آنے والے راستے پر ایک مارچ کو تین مرتبہ مخصوص انداز سے جلتے بجھتے دیکھ لیا تھا۔ "تم ذرا یہیں ٹھہرو۔۔۔۔ میں ابھی آیا۔"

۔۔۔۔ وہ شیرو کو شش و پنج میں مبتلا چھوڑ کر تیزی سے اندھیرے کی چادر میں غائب ہو گیا۔

حسین خان نے پستول کو فائرنگ پوزیشن میں کر کے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا لیکن اس کا یہ ہاتھ اس کمبل میں چھپا ہوا تھا جس نے اس کے سارے جسم کو ڈھانپ کر سردی کا زور خاصا توڑ دیا تھا۔

دوسری جانب اس کی آمد کو شاید محسوس کر لیا گیا تھا کیونکہ اس نے اپنے سامنے تقریباً پندرہ گز دور دوبارہ اسی مارچ کو جل کر بجھتے دیکھا۔ اس مرتبہ طرفین سے اسے بائیں سمت

استادہ کیا گیا تھا۔

اچانک وہ بجلی اس کڑی کے پیچھا تعاقب اس کے عقب میں ایک جو کڑکڑاہٹ

"ہالٹ!"

حسین خان اپنی قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے فرنٹ کرنے کی بجائے کڑے تھے۔

"کون ——؟" وہی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"مسافر ——!" حسین خان نے زیر لب کہا۔

"کہاں ——؟" سوال ہوا۔

"معلوم ——!" اس نے الگا کوڈ دہرایا۔

"ساتھ ——؟" اس کے عقب میں بولنے والا مطمئن ہو کر اس کے ساتھ آ

ہوا۔

"ساتھ ——!" حسین خان نے پستول جیب میں رکھ کر اپنا ہاتھ ملانے کے لیے بڑ

بڑھایا۔

دونوں چاند کی نقلی روشنی میں ایک دوسرے کی شکل بآسانی دیکھ سکتے تھے۔ ان سے

عقب میں اب فائرنگ کی آوازیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔ شاید قبائلیوں نے رات سے

اندھیرے ہی میں سری نگر کے مضبوط دفاع پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سری نگر کا بے قاعدہ اور کچی سیل لمبا دفاعی پوسٹ بھارتی فوج کی مکمل گرفت میں تھا

اور اس کی ابتدائی تین پلٹنوں نے جو اپنے ساتھ بھاری توپ خانہ لے کر آئی تھیں، بارہ مولہ

سے اس سمت آنے والی سڑک پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکاوٹیں کھڑی کر کے مورچے

مورچے قائم کر لیے تھے۔ ان مورچوں کا محاذ بھارتی توپ خانے کی فائرنگ کنٹرول کر رہی

تھیں۔

نوواردحسین خان کے لیے اجنبی تھا۔ اسے اس بات کی خوشی ہوئی کہ "ساتھ" اپنے

قدم مضبوط کر رہی تھی اور اب ہاتھ ملانے بھی اس میں گرمجوشی آنے لگی تھی۔

"میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ پونچھ کے دیہاتیوں نے جس دلیری کا مظاہرہ کیا ہے

اس نے سارے کشمیر کے مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔" نووارد نے حسین خان سے

مل کر کہا۔

"یہ تو ہے۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ اپنی اپنی جگہ والی بھی ہی ہیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پنڈتوں اور ڈوگروں کا پلیدان دیا جائے' جو ظالم ہوتے ہوئے بھی مظلوم تھے۔

علی الصبح جب کشمیر کے ننگے حسن پر چھائے بدبختی کے کہرے کی چادر میں سے سورج کی لہو رنگ کرنیں اپنا راستہ بنانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھیں اور کسی ذبح کیے ہوئے گھنٹہ دور زور سے بج کر فضا میں پھیلی نحوست کو چار چاند لگا رہا تھا تو گنجان آباد علاقے بری سنگھ بلڈنگ اسٹریٹ میں بظاہر ایک بیکری کی دکان کے باہر کھڑے تین کشمیری مجاہد اپنے سر بلند عزائم کو عملی روپ دینے کے انتظامات کو حتمی شکل دینے میں مصروف تھے۔ دکان کے دروازے پر بنا ایک چھوٹا سا چوکور لکڑی کا تختہ اپنا جگہ سے ہلکا سا کسی پر ٹکرماتے پر پھیلی ہوئی گہری لکیروں تلے گھنی بھنوؤں میں دھنسی دو تیز آنکھوں نے باہر بیرونی ماحول کا جائزہ لیا۔ "نوواردوں" سے خفیہ الفاظ کا تبادلہ کیا اور مطمئن ہونے کے چند لمحے بعد دروازہ کھول کر انہیں نگل لیا۔

☆○☆

پونچھ مجاہدین کے مکمل محاصرے میں تھا اور عملاً شہر میں انہی کی حکومت قائم تھی۔ صرف دفاعی نوعیت کے اہم مقامات اور جیل تھانے وغیرہ ابھی تک ڈوگرہ سامراج کی گرفت میں تھے۔

——— شہر کے عین وسط میں قائم ایک عارضی چھاؤنی کے باہر دو کشمیری گوجر جن کے کندھوں پر دودھ کے پیتل کے بڑے بڑے برتن رکھے تھے' آ کر ٹھہر گئے۔

"سلام صاحب جی———!" ممدو گوجر نے بیل کے سامنے اونگھتے سکھ حوالدار کو مخاطب کیا۔

"او سنا بھئی ممدو۔ کیا حال ہے؟ دودھ میں پانی ڈالا یا ابھی ڈالے گا؟" پرسے پر ممدو حوالدار نے حسب معمولی رٹے رٹائے فقرے دہرائے۔

"مہاراج جی! ساری زندگی حرام نہیں کھایا۔ اب تو قبر میں ٹانگیں لٹک رہی ہیں۔" ممدو نے ہمیشہ والا جواب دہرایا۔

"اوئے یہ کون ہے تیرے ساتھ" حوالدار نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اپنی اہمیت جتلائی۔

"رشتے دار سردار جی اپنا۔ ادھر جموں میں تھا بے چارہ۔ میری طرح اکیلا ہی ہے۔ ذرا کر میرے پاس بھاگ آیا ہے۔"

ممدو نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔

حوالدار نے ادھر ہی کہیں مرکب جاتے۔ ماں بہن تمہارا پاکستان جن تو گیا ہے' کہ یہ تمہارے یہاں کیوں مرنے آ رہے ہیں۔ سیالکوٹ کیوں نہیں چلے جاتے؟" حوالدار کے مذاق نے سنتری کے حواس معطل کر دیئے۔

ممدو نے محسوس کیا کہ اس کی بات سن کر حوالدار کو بہت غصہ آیا ہے۔ وہ کب تک یہاں رہے گا' کیا کرے گا۔ فوجی بن جائے اور اسلام سنگھ۔ جب اس سے بات کر رہے ہوں تو بیچ میں بکواس نہیں کیا کرتے——— میں نے بھی پندرہ سال فوجی نوکری کی ہے' جب تمہیں ماری ہر تیری سیاست بند نہ ہو گئی تو سالے پنو گنوا دوں گا۔ یاد رکھ———" حوالدار نے سنتری کو اس بری طرح ڈانٹا کہ اس کی گھگھی بندھ گئی۔

"شاکر دو حوالدار جی۔" اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ باندھے۔

"جا یار ممدو۔ اس سالے برہمن کی اولاد نے تو سارے موڈ کا صبح ہی صبح بیڑا غرق کر دیا۔ جانے باقی سارا دن کیسے بسر ہو گا؟" سکھ حوالدار نے ممدو کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

"شکریہ سردار جی۔" امیر خان نے جو اس کے پیچھے تھا حوالدار کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا جو سنتری کو رائفل سیدھی کر کے فوجیوں کی طرف پہرہ دینے کا حکم دے رہا تھا۔

ان کا رخ چھاؤنی کے میس کی طرف تھا۔ راستے کے دونوں اطراف میں فوجی ٹرک کسی بھی خطرناک اور ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار کھڑے تھے۔ ان کے گرداگرد سردی سے ٹھٹھرتے ڈوگرہ فوجی اپنی رائفلیں دونوں ہاتھوں کے درمیان کھڑی کیے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ زور زور سے رگڑتے ہوئے ان میں سے تھکی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

میس کے باہر ہی انچارج دوار کا داس اس کا منتظر تھا۔ "آؤ میاں۔ رات کیا چڑھا لی تھی؟ آنکھیں بڑی چڑھی ہوئی ہیں۔" اس نے بغیر دعا سلام کے ممدو پر حسب سابق طنز کیا۔

"توبہ توبہ۔ مہاراج جی!" ممدو نے دودھ کا برتن برآمدے میں رکھتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "کس حرام شے کا نام لے دیا صبح ہی صبح۔ وہ تو بھلی ہوں سے آیا تھا بے چارہ۔ ادھر حالات ذرا خراب ہی ہیں۔ ہم دونوں رات گئے تک پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ بڑی دیر بعد ملے ہیں نا۔" ممدو نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے امیر خان کے تعارف کے مرحلے سے بھی جان چھڑا لی۔

"ابے کیا بات کرتا ہے جموں کی؟ کس کی مجال ہے کہ وہاں سر اٹھائے؟ اپنی بھارتی سینا آ گئی ہے وہاں۔ وہ تو یہاں سالے مسلے اکڑتے پھرتے ہیں ورنہ تو سارے کشمیر میں———"

HBC

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر عمدو کے کندھے پر حسب عادت زور سے ہاتھ مارا اور کہا ہوا۔ "بس بیٹا! دو چار روز ہی کی بات ہے۔ پھر دیکھنا یہاں بھی فرنٹ کے پیچھے کی سی سہولتیں ٹھیک ہو جائیں گی۔"

ان لوگوں کو علم تھا کہ عمدو گوجر مسلمان ہے۔ وہ اسے کمز نیشنلسٹ سمجھتی کیونکہ اور بلا تکلف اس کے سامنے راز کی باتیں کر جاتے تھے۔ دوارکا داس نے بھارتی فوج کی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ان لوگوں کو علم تھا کہ مارو مار کرتی بھارتی میکانائزڈ پونچھ اور راجوری کے دروازوں پر دستک دے رہی تھی۔ وہ لوگ راستے میں اپنی پوزیشن مستحکم کرتے اور گوریلا یورش کو کچلنے کے امکانات پر مکمل نظر رکھنے کے بعد ہی آگے بڑھتے تھے تاکہ ان کا مجاہدین کے حملوں سے محفوظ رہے۔ جہاں کہیں بھی بھارتی فوج پہنچتی، سب سے پہلے وہ مقامی مسلمانوں میں سے سرکردہ اور پاکستان کے حمایتی افراد کو کسی نہ کسی بہانے ساتھ لے جاتی۔ اس کے بعد مضبوط مورچہ بندیاں قائم ہوتیں۔ مقامی نظم و نسق کا کنٹرول بھارتی فوج کا افسر سنبھالتا اور وہاں "مارشل لاء" کی سی صورت قائم کرنے کے بعد ہی وہ لوگ آگے بڑھتے تھے۔

دودھ ماپنے والا پیمانہ اور خالی برتن وہ لوگ کچن کے باہر برآمدے ہی میں لے آئے تھے۔ عمدو گوجر تو ان کے ساتھ باتیں کرنے لگا جب کہ امیر خان کی بے قرار نظروں نے ماحول کا گہرا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کی بے چین نظروں کا فوکس جلد ہی کچن سے دس بارہ گز دور بنی کوٹھڑیوں کی اس قطار پر مرکوز ہو گیا جہاں مغتوب فوجیوں کو رکھا جاتا تھا۔ "اگر سجاول یہیں زیر عتاب ہے تو اسے اس وقت ان ہی کوٹھڑیوں میں سے کسی ایک میں ہونا چاہیے۔" اس نے سوچا۔

نکھرا اور سما ہوا سورج اب پونچھ کی پہاڑیوں اور مرغزاروں پر کرنیں بکھیرنے لگا تھا۔ برآمدے کے سامنے سورج کی پہلی کرنوں کا رقص جاری ہو چکا تھا۔

"بھائی صاحب——!" عمدو گوجر نے اچانک گھوم کر امیر خان کو مخاطب کیا۔ "یہاں پالے میں کھڑے کیوں اپنی قلفی جما رہے ہو، وہاں سامنے دھوپ میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ ابھی لالہ جی چائے پلاتے ہیں۔ وہیں دھوپ میں بیٹھ کر پئیں گے۔ بڑا لطف رہے گا کیوں لالہ جی——!" اس نے دوارکا داس کی طرف دیکھ کر خوامخواہ دانت نکال دیئے۔

"تم لوگوں کی مانگنے کی عادت نہ گئی۔" دوارکا داس نے باورچی خانے میں کسی کو آواز دے کر ان کے لیے چائے لانے کو کہا۔ اس کے لہجے کا کلف بڑی کمی تھی، لیکن کیا مجال ہے

کہ اس میں کسی عمدو یا امیر خان کے سامنے کوئی دراڑ پیدا ہوئی ہو—— دونوں "بے ضرری" کے راستے نکال رہے تھے۔

پھر عمدو تو لالہ دوارکا داس کے ساتھ چائے پیتا گپ شپ کرنے لگا اور امیر خان آہستہ آہستہ قدموں کے آگے بیٹھتی دھوپ کی طرف چلتے لگے۔ ان کا ابا پہلے اور "ہاشمے" کا وقت ہونے کی وجہ سے اسے اپنے قرب و جوار میں کہیں کوارٹر گارڈ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ شاید ان لوگوں کو کم از کم یہاں کسی "غیر معمولی صورت حال" کے وقوع پذیر ہونے کا یقین نہیں تھا۔

کوٹھڑیوں سے کچھ فاصلے پر فوجی ضرور آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے، لیکن اس طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ امیر خان بڑی بے تابی سے اس احاطے میں گھسنے کے مواقع تلاش کر رہا تھا، لیکن کوئی بہانہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ کسی بھی وقت کسی کے اس طرف آ نکلنے سے اندر داخل ہونے اور کوٹھڑیوں میں جھانک کر دیکھنے کے تمام مواقع ضائع ہو جاتے اور تیزی سے بدلتی صورت حال کے پیش نظر کسی بھی گھڑی کچھ بھی وقوع پذیر ہو سکتا تھا۔ "پھر خدا جانے ایسا موقع میسر بھی آئے گا یا نہیں۔" وہ بڑی شش و پنج میں تھا۔

سامنے برآمدے میں اسے عمدو گوجر کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ اپنی توجہ تر صلاحیتیں دوارکا داس کا دھیان اسی طرف لگائے رکھنے پر صرف کر رہا تھا۔ محض ایک لمحے کے لیے امیر خان نے کچھ سوچا، پھر اس کے قدم بے اختیار اسی کوٹھڑیوں والے احاطے کی طرف اٹھ گئے۔

اس احاطے کے تین اطراف میں کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ سامنے کی سمت اندر جانے کا راستہ ہونے کی وجہ سے خالی تھا اور وہاں دروازہ نام کی کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ پہلے شاید یہ کوٹھڑیاں گھوڑوں کے اصطبل کا کام دیتی ہوں گی، لیکن اب ڈوگرہ فوج نے انہیں "کوارٹرز" میں بدل دیا تھا اور یہ سیل سزا یافتہ قیدیوں کے لیے مخصوص ہو گئے تھے۔

امیر خان نے ازار بند ڈھیلا کر لیا تھا اور بظاہر وہ پیشاب کرنے کے ارادے سے اس طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے دونوں طرف بنے دس سیلوں میں سے نو خالی تھے، آخری سیل جو ایک قطار کے کونے پر بنا تھا، وہیں امیر خان کی مراد بر آئی، جب سجاول کو اس نے کوٹھڑی کے ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر سر جھکائے بیٹھے دیکھا۔

——اس کے ہونٹ تشدد کی وجہ سے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے اور ہونٹوں کی سطح پر بعض جگہ اب بھی سیاہ رنگ کے خون کے دھبے جمے صاف نظر آ رہے تھے—— چہرے

پر پڑے نیل اب سرخی مائل سے سیاہی مائل ہو رہے تھے اور چہرے کی سوجن اب کم ہو رہی تھی۔ کہ اسے اپنی آنکھیں بھی زور لگا کر کھلی رکھنی پڑتی تھیں۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس کا جسم بھی پر تک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی وحشت پر نظریں ٹھہرتی نہیں تھیں۔ لیکن اس کی آنکھوں کی چمک ابھی ماند نہیں پڑی تھی' جوں کی توں باقی تھی۔

"جلال!" امیر خان کراہا۔

جلال اس کی آواز پر چونکا اور اسے یوں آنکھیں مل کر دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر کسی نہ کسی طرح گھسٹتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ "خدائے بزرگ و برتر کی قسم، میجر رام سنگھ پر ایسی "صاعقہ" گرے گی کہ اس کے گھٹوں نے عزائم سمیت اسے بھسم کر ڈالے گی۔" اس نے جلال کے نزدیک آتے ہی کہا۔ "صاعقہ" دشمن کا مقدر ہے جلال کے لہجے کا وقار بھی اس کے عزم کی طرح قائم دائم تھا۔

بمشکل ایک منٹ کے بعد ہی دونوں میں ایک معاہدہ طے پا چکا تھا۔

——— گھٹنے کے خاتمے تک امیر خان نے شلوار کا ازار بند ہاتھوں میں پکڑے رکھا تو پھر وہ اسی پوزیشن میں آگے بڑھ گیا اور جب وہ فراغت پا کر کھڑا ہوا تو ایک سنتری اس کی طرف رائفل تانے اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

☆○☆

جنرل طارق رکنے یا افسوس کرنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ رات کے دوسرے ہی پہر بارہ مولا سے روانہ ہو گیا۔ اس کی گاڑی کا رخ سری نگر کی طرف تھا جہاں اب قبائلیوں نے لوٹ مار شروع کر دیئے تھے' لیکن بہت وقت ضائع کرنے کے بعد۔

بریگیڈیئر حبان کی قیادت میں بھارتی پلٹنیں دھڑا دھڑ کشمیر میں اترنا شروع ہو گئی تھیں۔ کشمیر تک زمینی راستے سے آنے کا معاملہ ہوتا تو شاید وہ لوگ کبھی اتنی جلدی کامیابی حاصل نہ کر پاتے' لیکن پاکستان کے برعکس بھارت کے حصے میں ایک مضبوط' منظم اور کھلی ایئرفورس آئی تھی۔

رائل انڈین ایئرفورس بظاہر تو برطانوی ہوائی فوج کا بیڑہ تھا' لیکن ۱۹۴۵ء کے بعد سے ہندوستان کی حد تک اس پر عملاً حکمرانی بھارتی غیر مسلموں کی تھی۔ مسلمان کے نعرۂ پاکستان نے جب حقیقت کا روپ دھارنا شروع کیا تو چانکیہ کی روحانی اولاد نے اسی وقت سے اس مسلم مملکت کی بیخ کنی کا سامان کرنا شروع کر دیا تھا جو ابھی وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔

ایک سازش کے تحت جس میں ان لوگوں کو فرنگیوں کی مکمل آشیرواد حاصل تھی'

ہندوستان بھر کے قریباً تمام ایئربیسز، ایئرفیلڈز، سگنلز اور برطانوی افسران بھارتی ہاتھ میں دے دیئے گئے۔ تمام بھارتی افسروں نے اس بات کا عزم کر رکھا تھا کہ کسی مسلمان کو پائیلٹ نہیں بننے دیں گے۔ اگرچہ افسران تک تقسیم کا فارمولا طے ہونے تک ایئرفورس کے تمام تعینات میں ایسا نہیں تھا۔ ۱۹۴۶ء میں جب مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو ایک ہی کابینہ وزارت حاصل ہو کر آتا تھا' لیکن ۱۹۴۶ء میں جب مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو بھی اس بات کا یقین ہو گیا کہ پاکستان بن کر رہے گا تو انہوں نے مختلف حیلوں بہانوں کی دھمکی دے کر اپنے لیے "ہلکے" کا قلمدان "منگوا" شروع کر دیا۔ اس بات پر احتجاج کرنے والے مسلمان ایئرمینوں کا کورٹ مارشل ہوا اور ان میں سے بیشتر کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے۔

برصغیر میں فضائی تربیت کے لیے دو مراکز قائم کیے گئے۔ ابتدائی تربیت کے لیے امبالہ اور اعلیٰ تربیت کے لیے جودھ پور۔ تقسیم ملک کے بعد یہ دونوں فضائی تربیتی مراکز بھارت کو مل گئے جہاں ٹریننگ سے متعلق تمام ضروری اور جدید ترین تھلات موجود تھے۔

ایک سازش کے تحت قریباً تمام اہم اسکواڈرن بھارتی ہوائی اڈوں پر منتقل کر دیئے گئے تھے۔ ابتدا میں پاکستان کو چند ٹیسٹ طیارے دے کر ٹرخا دیا گیا۔ نئی اسٹاف نہ ہونے کے برابر تھا۔ پاکستان کے حصے میں آنے والے ایئرفورس کے ملازمین کی زیادہ تعداد کو بنگلہ بنگ کے دور دراز اسٹیشنوں پر ڈسپوز کر دیا گیا تھا اور جنگ تقسیم ہوتے ہی ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ پاکستان تک زندہ سلامت پہنچنا بھی ان کے لیے مسئلہ بن گیا تھا۔

سوائے پشاور کے جہاں مسلمان افسران زیادہ تعداد میں تھے' باقی تمام فضائی اڈوں مثلاً ہلوارا' ڈوگرک روڈ' چک لالہ' رسالپور وغیرہ ویران پڑے تھے۔ وہ ATC (ایئر ٹریفک کنٹرول) بلڈنگیں یا ایک آدھ ناکارہ طیارہ ہی چند ایسی نشانیاں رہ گئی تھیں جو ان کے "ایئرفورس اسٹیشن" ہونے کی نشاندہی کرتی تھیں۔ روانگی کے وقت غیر مسلم ایئرمین طیاروں کے سپیئر پارٹس نکال کر انہیں اپنے ساتھ ہی بھارت لے گئے تھے۔ اس طرح انہوں نے یہاں بچ جانے والے جہازوں کو عملاً ناکارہ کر دیا اور جو انجن صحیح سلامت بچے' انہیں وہ لوگ جاتے جاتے کباڑیوں کے ہاتھ فروخت کر گئے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ مضبوط ہوائی اڈے' تربیتی مراکز' ہوا باز اور طیارے منظم اور مضبوط نظام کے ساتھ بھارتی فضائیہ کے پاس موجود تھے۔ کشمیر میں "مداخلت" کا بہانہ ہاتھ آتے ہی ونگ کمانڈر مہر سنگھ تمام بھارتی فضائیہ کو حرکت میں لے آیا اور وہ بیکل ڈوگرہ

جہازوں میں بھر بھر کر بھارتی ہوا باز اپنی آری کو سری نگر اور جموں پہنچانے لگے۔ ان فرنٹ بردار طیاروں کی حفاظت کے لیے اس دور کے لڑاکا طیارے ہری کین اور اسپٹ فائر بھی ان کے ساتھ ساتھ پرواز کیا کرتے تھے۔

ایک طرف تو ایئرفورس نے باربرداری کا ذمہ اٹھایا اور دوسری طرف وہ لوگ اپنی تمام تر قوت کے ساتھ میدان جنگ میں کود پڑے اور ان کی "ناقابل علاج" بمباری نے قبائلیوں کے قدم روک دیئے۔ ان کی دیدہ دلیری کا یہ عالم تھا کہ یہ لوگ اکثر گجرات کے نواحی علاقوں بلکہ مری تک پر بمباری کر کے چلے جاتے تھے۔ ہمارے پاس اول تو ان کے مقابلے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اگر پاس کچھ تھا تو پاکستان ایئرفورس ان کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ نہیں لے سکتی تھی کیونکہ اس سلسلے میں حکومت کے دو ٹوک اور سخت احکامات موجود تھے۔

جنرل طارق کی موجودگی بارہ مولا میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ انہیں علم تھا کہ مقامی غداروں نے یہ اطلاع آگے پہنچا دی ہو گی اور صبح ہوتے ہی بھارتی فضائیہ کے طیارے چیلوں کی طرح آسمان کو بھر دیں گے اور وہ جنرل کو مارنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے، لیکن سری نگر تک پہنچنا ان کے لیے بہت ضروری تھا کیونکہ ابھی تک محاذ کی صورت حال صرف کانوں سنی تھی، آنکھوں سے وہ اب دیکھنے جا رہے تھے۔

رات کے دوسرے پہر وہ سری نگر سے دس میل دور مجاہدین کی ایک چوکی کے پاس رک گئے۔ جہاں قبائلی مجاہدین اگلے روز علی الصبح حملے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ یہیں پہنچ کر جنرل کو "اندرون خانہ" حالات کا علم ہوا اور اس تلخ حقیقت کا ادراک بھی کہ اب قبائلی مجاہدین کا مقابلہ ڈوگرہ فوج سے نہیں بلکہ بھارتی مسلح افواج سے ہے جس نے ہوائی اڈے اور سری نگر پیٹر کے گرداگرد مضبوط مورچہ بندیاں کر لی ہیں۔

جنرل نے وہاں رک کر وقت ضائع کرنے کی بجائے آگے سفر کرنے کا قصد کیا اور صبح طلوع ہونے سے پہلے وہ چوتھے سنگ میل پر کھڑے تھے جہاں سے سری نگر صرف چار میل دور تھا۔

سڑک کے گرداگرد بھارتی فوج نے مورچے سنبھال لیے تھے۔ ان لوگوں نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر کے مورچے قائم کر لیے تھے۔ بڑا خطرہ انہیں سری نگر کے اندر سے تھا، لیکن اس طرف سے شیخ عبداللہ نے انہیں مکمل اطمینان دلا رکھا تھا اور اپنے عقب کے اس طرح محفوظ ہونے سے بھارتی فوج کا مورال آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا تھا۔

قبائلیوں نے سری نگر پر بجائے سامنے سے حملہ کرنے کے دائیں بائیں پہلو سے داخل

ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اور انہوں نے یہ طریقہ آزمایا بھی، لیکن قدرے بعد بھی شاہ ہمدان کی سری نگر کے مضافات میں کمزے پانی نے ان کا راستہ روک لیا۔ اس طرح دشمن کو ایک زبردست آڑ میسر آ گئی۔ مجاہدین پیچھے ہٹ گئے اور انہوں نے ایک اضافی قدم اٹھایا۔ وہ بھارتی فوج کے بائیں سامنے سے حملہ آور ہوئے، لیکن سامنے سے آنے والے ٹینک اور پیچھے سے آنے والے توپ خانے کی گولہ باری نے ان کی وادی مشین گن کے فائر نے اور اس حملے کو بری طرح ناکام بنا دیا۔

جنرل طارق آنکھوں سے دوربین لگائے ایک قدرے محفوظ جگہ میں کمزے میدان کارزار کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے قبائلی مجاہدوں کے پٹنے اور پسپا ہونے کے کئی مناظر اس سے پہلے بھی دیکھے تھے، لیکن آج ان کے انداز ہی نرالے تھے۔ اپنے اسلاف کی روایت دہرانے کے لیے وہ جان سے بھی گزر رہے تھے۔

عین ان لمحات میں جب قبائلی مجاہدین پسپائی اختیار کر رہے تھے اور سورج سری نگر کی پہاڑیوں پر ابھی بکھیر رہا تھا، ہوائی اڈے کی طرف سے "ٹیپسٹ" اور "اسپٹ فائر" طیاروں نمودار ہوئے۔ ونگ کمانڈر مہر سنگھ بذات خود اس حملے کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ جنرل طارق کی موجودگی کی اطلاع بھی آ چکی تھی اور اس بات کا علم بھی اسے تھا کہ جنرل کے اپنے بھی اس کی مدد کو نہیں آئیں گے اور یہاں موجود قبائلیوں کی تھری ناٹ تھری کی رائفلیں یا ایک آدھ مشین گن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔

اس نے فتح کے نشے کو دوآتشہ کرنے کے لیے بیک وقت قبائلیوں اور جنرل طارق کے مشترکہ شکار کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے باقی ساتھیوں کے ہمراہ حملہ آور ہوا تھا۔ جنرل طارق نے کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کے لیے وہیں سے بارہ مولا کی طرف لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ابھی وہ اپنی جیپ کے نزدیک ہی پہنچے تھے جب آسمان بھارتی طیاروں کی چنگھاڑ سے لرزنے لگا۔

ونگ کمانڈر مہر سنگھ نے شاید ان کی جیپ پہچان لی تھی اور وہ پیش آمدہ فتح کے نشے سے سرشار اب خاصی نیچی پرواز کرتا جیپ پر راکٹ پھینکنے آ رہا تھا۔

جنرل کے لیے یہ کوئی نیا کھیل نہیں تھا۔ محض چند لمحوں میں وہ تیار ہو چکے تھے۔ انہوں نے طیاروں کی آواز سنتے ہی جیپ سے باہر چھلانگ لگائی اور ڈرائیور کو جیپ بھگا لے جانے کا حکم دیا۔ خود وہ لڑھکنیاں کھاتے نزدیکی درختوں کی طرف جا رہے تھے۔

ونگ کمانڈر مہر سنگھ کا طیارہ اپنے پیچھے گولیوں کی قطار بناتا جیپ پر آ رہا تھا۔ ڈرائیور نے

اسے نزدیک آنے کا موقع دیئے بغیر ایک جھٹکے سے موڑ کاٹا اور جیپ کو انتہائی بائیں طرف لہرا دیا۔ مرسنگھ چکرا گیا۔ اس کو سامنے کی بائیں جانب دیوار کی اونچائی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے بائیں ہاتھ کی اسٹک کو اس نے یک دم گھما کر سامنے کی طرف جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔ ہیلی کاپٹر کا منہ اوپر کو اٹھا اور اٹھا ہی رہ گیا۔ پہاڑی کی چوٹی سے ایک قبائلی مجاہد جانے کب سے اس "ساعت" کا منتظر تھا۔ اس کی رائفل کی نالی ٹھیک وقت اسکرین سے ٹکرائیں، جن سے دو اسکرین کو توڑ کر مرسنگھ کے جسم میں گھس گئیں۔

دماغ میں پہنچنے والی گولی نے اس کا سر توڑ دیا اور بھارت کا مایہ ناز و تگ کمانڈو کشمیر پر ایئر فورس کا سایہ کر کے اسے مظلوموں کے ہاتھ جانے سے بچا لیا تھا۔ گولی اپنا انجام دیئے بغیر اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ "لیڈر" کی موت نے "فارمیشن" کے باقی طیاروں کو نوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل طارق چھلانگ لگا کر جیپ میں جا بیٹھے۔ انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھالی تھی اور روانگی سے پہلے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر کسی بھی طرح وہ چند بکتر بند گاڑیاں یہاں تک لے آئیں اور ان میں سوار ہو کر مجاہدین کو سری نگر میں داخل کر دیں تو شاید تاریخ کا دھارا اپنا رخ بدل لے۔ انہیں اس صورت میں یہ بکتر بند گاڑیاں حاصل کرنا تھیں اور یہی ارادہ لے کر وہ راولپنڈی کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔

☆○☆

نبی خان نے بذات خود ان کا استقبال کیا تھا۔ اس نے ان پچاس مجاہدین کو "ہوم گارڈ" کے لبادے میں جموں تک پہنچانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس سلسلے میں ایک پیغام اس نے حسین خان کے سامنے رکھ دیا۔ ان لوگوں کو اب دو حصوں میں بٹ کر سفر کرنا تھا۔

نبی خان کی مسحور کن شخصیت کا جادو شیرو پر چل چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ادھورے تک نیند کا غم و نشان بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نبی خان نے بالآخر اسے "صاحبہ" سے مخاطب کروا دیا تھا اور تین گھنٹے کی مسلسل گفتگو کے بعد جب دوسری طرف حسین خان ایک بھرپور نیند سے لطف اندوز ہو کر اب بیدار ہو چکا تھا، شیرو نے "صاحبہ" کے پیر چھونے کا شرف حاصل کر لیا تھا۔ اسے مرعوب کرنے کے لیے یہی بات کافی تھی کہ حسین خان نظریہ پاکستان پر جان نثار ہے جس نے آج تک اپنی وابستگی کا کسی کو شک بھی نہیں ہونے دیا تھا۔ "صاحبہ جی اب تم آرام کرو۔" نبی خان نے اسے کہا۔ "ہوم گارڈ شاہ نے جو

بھی کہا ہو، امراء الدل" تک ہو آؤں۔ آپ کو یہ کمرہ بہت پسند آیا ہے۔ میں آپ کی خدمت میں کچھ اور بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ حسین خان نے نبی خان کی طرف دیکھا۔ نبی خان کی آنکھوں میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ حسین خان نے کوئی مزید سوال نہیں کیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ نبی خان اس بات کا خواہش مند ہے کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں شیرو سے تنہائی میں کچھ باتیں کر لے۔ اس کی یہ خواہش بہر صورت میں پوری ہونی تھی۔

نبی خان نے یہ کہہ کر حسین خان کو باہر بھیج دیا۔

ان دنوں امراء الدل کے بازاروں میں یہ بات عام تھی کہ شیخ محمد عبداللہ کی رہائی اور کشمیر میں وزارت مقننہ کے عوض کشمیر کو بھارت میں ضم کرنے کی شرط بھارتی حکومت نے پیش کی تھی۔ شیخ کی کوشش تھی کہ شیخ کے لیے ۶ اگست کی کابینہ کی میٹنگ سے پہلے پہلے اس کی رہائی عمل میں آ جائے۔

حسین خان امراء الدل کے قہوہ خانے میں بیٹھا ریڈیو پاکستان کی نشریات سن رہا تھا۔ مسلمانوں کے لیے اب اس کے سوا اور کوئی مشغلہ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ بڑے شوق سے خبریں سن کر اپنا دل بہلایا کرتے۔

ریڈیو سے خبریں سن کر اپنا دل بہلایا کرتے۔

خبروں کے خاتمے پر حسب معمول قہوہ خانہ سیاسی آماجگاہ بن گیا۔ چائے کی چسکیوں کے درمیان لوگوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ لیکن اس کا دھیان لوگوں کی گفتگو کی طرف تھا۔ وہ چوکنا ہو کر ہوٹل کے دروازے سے اس کا دیرینہ رفیق قاسم احمد داخل ہو رہا تھا جسے اس نے ہی آبادی کے لیے اچھے خاصے کارنامے انجام دیئے تھے اور جو حسین خان کی اصلیت سے بھی واقف تھا۔

حسین خان جانتا تھا کہ یہاں ہوٹل میں بھی یقیناً اس کے مخالف موجود ہوں گے خصوصاً سری نگر میں ایسے حالات پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ اس نے چاہا کہ قیوم سے نظریں بچا کر نکل جائے اور اس ارادے سے وہ اٹھا اور ہوٹل کے کاؤنٹر کی طرف چل دیا لیکن ابھی وہ کاؤنٹر پر پیسے دے کر گھوما ہی تھا کہ قیوم کی نظریں اس سے ٹکرا گئیں۔

"تم یہاں بھی آ گئے۔" حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے قیوم مغلوب ہوا۔ "اب زیادہ چالاکی نہ دکھاؤ۔" اس نے اپنے ہولسٹر پر ہاتھ ڈالتے ہوئے حسین خان کو حکم دیا۔

حسین خان کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ محض ایک لمحے کی غفلت بھی اسے مہنگی پڑ سکتی ہے۔ اس نے قیوم کو ہولسٹر میں ہاتھ ڈالتے دیکھ لیا تھا۔ یہاں بھی وہ سرعت دکھانے سے رہا۔

HBC

——— بجلی کی سی پھرتی سے حسین خان نے اپنی چادر میں ہاتھ ڈالا اور حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں' جب اس نے اپنے سینے کی طرف پستول کی نال اٹھی دیکھی۔ دوسرے ہی لمحے یکے بعد دیگرے دو شعلے اس کی طرف لپکے۔ حسین خان کے ذہن کو متعلق دم توڑتے قیوم کو کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ خود حسین خان بھی جانتا تھا کہ ایک گولی اس کے انجام کو کافی ہے' لیکن وہ قیوم کو اتنی مہلت بھی دینے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ مرتے مرتے بھی اس کا نام لینے کے قابل رہ جائے۔ اس نے قیوم کے دل کا نشانہ لیا تھا اور یکے بعد دیگرے دونوں گولیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں ایک دوسرے سے محض دو انچ دور لگی تھیں۔ آخری میز کے کونے میں بیٹھے قیوم بٹ کے دونوں ساتھیوں نے ریوالور نکالے' لیکن انہیں اپنے ریوالور استعمال کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا کیونکہ اسی کمرے میں داخلے کے دروازے سے لگے ایک شخص نے کسی میکانکی عمل کے تحت ایک ساتھ ہی ان پر گولیاں برسائیں تھیں۔ دونوں کچھ کرنے کی حسرت دل ہی میں لیے ٹھنڈے پڑ گئے۔ "قتلِ گراں" حیرت زدہ اور سہمے ہوئے لوگوں کو کچھ سوچنے یا کرنے کا موقع دیئے بغیر بڑی پھرتی سے باہر نکلا اور ہجوم میں غائب ہو گیا۔

یہ نبی خان تھا جو حسین خان کی مسلسل نگرانی کر رہا تھا۔

فائرنگ کی آواز پر لوگ ادھر متوجہ ہوئے۔ انہوں نے پستول ہاتھ میں پکڑے کسی کو بازار میں بھاگتے دیکھا——— لیکن یہ سارا معاملہ پلک جھپکتے——— ہی رونما ہو گیا تھا اور ان پر اتنی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ کسی نے قاتل کا تعاقب کرنا تو ایک طرف رہا ی۔ آئی۔ ڈی کے دم توڑتے انسپکٹر——— قیوم تک پہنچنے کی زحمت تک گوارا نہ کی اور پھر ہوٹل کا مالک ہی جرات کر کے اٹھا۔

وہ قیوم کی سرکاری حیثیت سے واقف تھا۔ اس نے مزید ہمت کا مظاہرہ کیا اور مخدوب پر جھک کر اسے اٹھانا چاہا۔ قیوم کی نیم مردہ آنکھوں نے جب ایک سائے کو خود پر جھکتے دیکھا تو اس کے منہ سے بمشکل "ح..... ح....." ہی نکل پایا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

حسین خان اس کا انجام دیکھنے کے لیے وہاں رکا نہیں تھا۔ قہوہ خانے کے گرداگرد بڑھتے ہوئے ہجوم میں سے وہ بڑی تیزی سے راستہ بناتا بیکری کی دکان کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا اور جب وہ بیکری کی دکان تک پہنچا تو نبی خان اور شیرو کو اپنا منتظر پایا۔

"تمہاری خبر تم سے پہلے ہی تیز رفتاری سے چل کر ہم تک پہنچ گئی حسین

خان———!" نبی خان نے اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا۔

"الحمد للہ کہ——— ایک غدار تو اپنے انجام کو پہنچا۔" حسین خان نے اپنے کندھے پر دھری چادر کو ایک طرف رکھا اور سکون کی لمبی سانس لی۔

"انسپکٹر قیوم ہماری لسٹ میں تھا حسین خان۔" نبی خان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "جلد یا بدیر اس کو اپنے انجام تک پہنچنا ہی تھا۔"

"آؤ کم جہاں پاک۔" شیرو قریب ہی سے بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب یہاں سے اٹھنا چاہیے۔ ی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر کی موت ان لوگوں کو چوکنا کر دے گی۔ ایک لحاظ سے تو یہ اچھی بات ہے کہ دشمن خوف زدہ ہو جائے' لیکن اس طرح بھارتی فوج ہوشیار ہو جائے گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" حسین خان بولا۔

تھوڑی دیر بعد ہی تینوں ایک دوسرے کے تعاقب میں بیکری کی دکان سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے اپنے چہرے سردی کے بہانے قریباً ڈھانپ رکھے تھے۔ ان کی منزل سری نگر ہی کا ایک اور محلہ تھا جس کے ایک محفوظ مکان میں "کشمیر ہوم گارڈز" کے السرین کی وردیوں میں ملبوس تین سرفروش ایک پلانگ کے تحت حسین خان اور شیرو کا انتظار کر رہے تھے۔

سورج ڈھلنے سے پہلے ہی وہ لوگ ایک فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پونچھ سے آنے والے مجاہدین مختلف ٹولیوں کی شکل میں ہوم گارڈز کا روپ دھارے اپنے کمانڈر کے حکم کے منتظر سری نگر شہر میں موجود تھے۔

ان لوگوں کو تین مختلف ٹولیوں میں بٹ کر جموں کی طرف سفر کرنا تھا۔ وہ ہوم گارڈز کی جس کمپنی میں شامل ہوئے تھے' اسے جموں سے کچھ پیچھے ہی بٹوٹ ناہی ایک صحت افزا جگہ میں پہنچ کر اپنی ذمے داریاں سنبھالنی تھیں۔ یہاں سے ان لوگوں کو "امن و امان" قائم کرتے ہوئے جموں تک پہنچنا تھا۔

اگلے روز علی الصبح شیرو اپنے دس ساتھیوں کے ہمراہ ایک ٹرک میں بانہال کے سلسلہ ہائے کوہ کی طرف جا رہا تھا——— ان کی کمانڈ ایک ڈوگرہ صوبیدار کے ہاتھ میں تھی اور ان لوگوں کو بٹوٹ جا کر اپنی ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں۔ حسین خان اس سے الگ ایک گروپ کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

جیپ بڑی تیزی کے ساتھ ان کے قریب سے گزری تھی اور ہارن کی
پر برانے کی آواز سے دونوں ہی اچھل کر رہ گئے۔ انہوں نے جیپ کو رکتے اور
سواروں کو اترتے اور اپنی طرف آتے دیکھا۔

اگر امیر خان اپنے ہوش و حواس قائم رکھ کر اچانک ہی پیچھے نہ ہٹ جاتا تو
اسے کچل کر رکھ دیتا۔ اس نے دونوں کے ہاتھ آگے جیپ لا کر اس طرح کھڑی کی کہ
ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے میجر رام سنگھ سے ان کا فاصلہ بمشکل دو تین گز ہی رہ گیا تھا۔
رام سنگھ کی شکل پر نظر پڑتے ہی مدو گوجر کا ہاتھ پہلے تو ماتھے تک گیا پھر
دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"ست سری اکال سردار صاحب۔" وہ میجر رام سنگھ کو سردار صاحب ہی کہا کرتا تھا
خان نے بھی اس کی تقلید میں یہی عمل دہرایا۔

"یہ کون ہے؟" میجر رام سنگھ کی آواز میں نہ جانے کیا بات تھی کہ مدو گوجر کی ریڑھ
کی ہڈی میں ایک سنسناہٹ تیزی سے دوڑ گئی۔

"بھائی ہے میرا سردار صاحب۔" اس نے اپنا لہجہ حتی المقدور ہموار کرکے نارمل رکھنے
کی کوشش سے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ جموں میں رہتا تھا میجر صاحب جی۔" مدو گوجر کے حواس قائم تھے۔ "سب کچھ
کے بعد میرے پاس آگیا ہے۔ اب یہی دودھ لے کر آیا کرے گا مہاراج جی۔ میں تو اور
ڈنگر کی سیوا ہی کیا کروں گا۔ اسی لیے اسے لنگر خانہ دکھانے لایا تھا۔"

-----میجر رام سنگھ کے متوقع سوالوں سے بچنے کے لیے مدو نے اپنی دانست میں پیش
بندی کر لی تھی۔

"ہوں-----!" رام سنگھ نے ہنکارا بھرا۔ "اس کے بیوی بچے کہاں ہیں؟"

"میری طرح چھڑا چھانٹ ہے مائی باپ۔ ہم غریب لوگ شادیاں کہاں کر سکتے ہیں
حضور۔ دو وقت کی اپنی ہی روٹی پوری ہو جائے تو لاکھ شکر ادا کرتے ہیں مولا کا۔" مدو کی
زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

میجر رام سنگھ نے ٹھنکی باندھ کر اسے گھورا' پھر کچھ کہے سنے بغیر اسی آندھی اور طوفان
کی سی رفتار سے جیپ آگے بڑھا لے گیا۔

[illegible] بیٹا۔" مدو نے [illegible] کہا۔
[illegible] لاشریک کی قسم آج کے بعد پھر کبھی [illegible] اس کی زندگی میں کبھی آئے
[illegible] اس کی [illegible] ناک ہو گی کہ بھول جاؤ کے [illegible] کی [illegible]
[illegible] ہو جائے گا۔"

[illegible] کا بھرپور [illegible] ہو گیا تھا اب اسے [illegible] کی ضرورت نہ رہی تھی۔
[illegible] نے شدت سے امیر خان کا ہاتھ دبائے ہوئے کہا۔

دونوں اب جیپ کے دروازے سے باہر نکل آئے تھے اور اس [illegible] مدو کو لے کر
[illegible] کی طرف چلے۔

سُلگتی آہیں

دونوں ایک تہہ خانے میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ لالٹین کی روشنی نے ہول کی پُراسراریت کو دوچند کر دیا تھا۔

پچھلے دو روز سے زہراں نے بمشکل اس سے دو تین فقرے ہی کہے تھے۔ اس نے مسلسل خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور شرفو سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیسے بہلائے۔

اس کے دوست نے زہراں کی ذمے داری سونپ کر دراصل شرفو کو زبردست امتحان میں ڈال دیا تھا۔ پہاڑی سلسلے سے یہاں تک کا سفر اس کے لیے طلسمات کا سفر تھا۔ اس مختصر سے سفر میں اس کو اسرار و رموز کے کئی جہانوں سے آگاہی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے اس کی زندگی کا مقصد صرف تعلیم حاصل کرنا اور پھر کشمیر کو آزاد کروانا ہی تھا۔

لیکن آج----!

آج جب اس نے زہراں کو اتنے قریب سے دیکھا تو لاکھ ضبط کے باوجود وہ بے خودی کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے بہت عرصہ پہلے ایک دفعہ زہراں کو دیکھا تھا' تب تو وہ ایسی نہیں تھی۔ نہ اسے دیکھ کر یوں کبھی شرفو کو اپنے خون کی گردش رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے اس جذبے کو کن معنوں سے تعبیر کرے۔

کیا وہ زہراں کی محبت کا اسیر ہو گیا ہے؟ یہ خیال ہی اس کے لیے اتنا وحشتناک تھا کہ اس کے لیے اس مفروضے پر سوچنا ہی عذاب وہ تھا۔ شرفو نے چاہا کہ کسی طرح بھی اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر باہر نکال دے' لیکن جب کبھی اس نے یہ ارادہ کیا' ایک صدا اس کے اندر سے اٹھتی جو اسے منافق اور جھوٹے ہونے کا طعنہ دینے لگتی۔

----زہراں اس کے دوست کی منگیتر تھی۔ وہ دوست جس نے شرفو کے لیے کبھی بخل سے گزر جانے میں بھی بخل کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ ایک ایک کر کے اسے تمام گزرے واقعات یاد آنے لگے تھے اور یہ کوئی بہت پرانی بات بھی نہیں تھی' کل ہی کی بات تو تھی۔

"کیا میں اتنا کمزور انسان ہوں کہ انسانیت کی سطح سے بھی نیچے گر کر رہ گیا ہوں؟" اس

نے سوچا اور اسے خود پر رحم آنے لگا۔ — اسے خود سے ایک بھی اور کل لڑنا ہی تھا لیکن وہ اپنی
من تھا کہ اسے کسی پل چین ہی نہیں لینے دیتا تھا۔

"میں مر جاؤں گا' خود کو کوئی مار لوں گا لیکن یہ شیطانی جذبہ کبھی مجھ پر غالب نہ آسکے
گا۔" اس نے اپنے آپ کو کوسا اور وہاں سے اٹھ کر باہر آگیا۔

"یہاں ان لوگوں کا قیام تھا جو جنگ ابھی تک اس لیے محفوظ تھی کہ جنگ کا دائرہ ابھی
محدود تھا' لیکن کسی بھی لمحے زلزلہ یہاں تک پھیل سکتا تھا۔ نوردلی نے حسین خان کی
خصوصی ہدایت کے پیش نظر اس بات کا خیال رکھا تھا کہ شرفو کو کسی "حساس مقام" پر جانے
سے بچایا جائے۔ اس نے زہراں کی حفاظت کے لیے ایک بوڑھی عورت کو بھی وہاں رکھا ہوا
تھا جو زہراں کا خیال اپنی بیٹیوں کی طرح رکھ رہی تھی —— لیکن زہراں.....

زہراں تو جیسے اس عالم میں تھی ہی نہیں —— لالہ اور شیرو کی ماں کی موت نے اس
کو اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگر شیرو یہاں ہوتا تو کوئی اور بات تھی۔ شاید وہ اس
کے زخموں پر اپنی محبت کا پھایا رکھ سکتا۔ یہاں کون تھا جو اس کے دکھ کو جان پاتا؟ ایک
بوڑھی مجاہدہ تھی اور دوسرا شرفو اور جس طرح دن رات شرفو نے اس کا دل بہلانے کے
لیے اپنے سے بتن کر ڈالے تھے' اس پر وہ دل سے شرفو کی عزت کرنے لگی تھی۔ اسے یہ
نوجوان واقعی غیر معمولی نظر آرہا تھا۔ چپ چاپ سا تنا سا۔ "یہ جنگ و جدل اس کے بس کا
روگ کہاں تھا؟" زہراں سوچتی لیکن پھر خود ہی اسے جواب مل جاتا کہ آج کشمیر کا جو سپوت
ہتھیار نہیں اٹھا سکتا' وہ بے غیرت ہے۔ اس نے پچھلے دو روز سے یہاں درجنوں ایسے
زخمیوں کو آتے جاتے دیکھا تھا جن کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا محال تھا' لیکن لڑ رہے
تھے۔

یہ شاید مجاہدین کا کوئی خفیہ مرکز تھا جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے بعد انہیں دوبارہ
محاذ پر روانہ کر دیا جاتا تھا۔

☆○☆

شرفو جب خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا تو اس غار نما کوٹھڑی کا سناٹا اسے ڈسنے کو
آنے لگا۔ وہ بوڑھی عورت جو اس کی خدمت پر مامور تھی' تھوڑی دیر پہلے ہی حسب
معمول زہراں کے لیے دودھ لینے چلی گئی تھی۔ ماحول کی یکسانیت سے اسے اب ہول آنے
لگا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آگئی۔ اس وقت عموماً نوردلی وہاں اس کی خیریت دریافت کرنے آیا
کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نوردلی شیرو کے متعلق بھی اسے سنا دیا کرتا اور اتنے وثوق سے

وہاں دل رکھنے کے لیے جھوٹ بولتا کہ وہ اسے بالکل اچھا جانتے تھے۔
وہاں کی نظریں اور اس راستے پر کئی خیمے تھے جہاں سے وہ گزرا تھا۔ ہر ایک
نظر ایک لمحے کو ادھر دیکھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں سلام کر کے اس
نظر جھالی تو لمحے نے مجاہدین کے متبادل کمانڈر نوردلی کی قابل اختیار کر لی۔
وہاں نے دل کی دھڑکنوں نے اس کے ساتھ ہی اپنی رفتار تیز کر لی۔
"کیسی ہو بیٹی؟" اس نے زہراں کے سلام کے جواب میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے
ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں چاچا۔" زہراں نے آج پہلی مرتبہ اسے روتے ہوئے جواب دیا تو نوردلی کو
ایک گونہ اطمینان سا ہوا۔

"شیرو جلد ہی ہوں سے لوٹ آئے گا۔ ابھی ابھی اس کے بستے کی طرف سے ایک
مجاہد ایک خبر لے کر آیا ہے۔ بس تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے بیٹی۔ پھر تم دیکھنا۔ ہم سب
آزاد ہوں گے۔ یہ ہمارے پہاڑ' دریا' درخت' وادیاں' یہ فضائیں' ہمارا کشمیر ہمیں واپس مل
ہو گا۔"

—— نوردلی نہ جانے جوش میں اور کیا کیا کہہ جاتا' لیکن جلد ہی اسے اپنی بے توفی کا
احساس ہو گیا اور وہ خاموش ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ شرفو اسے اس طرف آتا دکھائی
دیا۔ اس نے راحیل اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور گولیوں کے پٹے ایک دوسرے کو کراس
کرتے ہوئے اس کے سینے پر نمایاں تھے۔

"میں اب یہاں نہیں رہوں گا چاچا۔" اس نے نوردلی کو ایک طرف لے جاتے ہوئے
کہا۔

"خیریت ——؟" نوردلی نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے وحشت ہونے لگی ہے اس ماحول سے۔ یوں بے عملوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ
دھرے آخر میں کب تک بیٹھا رہوں گا —— میرا یہ مقام نہیں چاچا نوردلی۔"

جانے اس کے لہجے میں کیا بات تھی کہ نوردلی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں سمجھتا ہوں بیٹا۔" اس نے شرفو کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب
کیا۔

"تمہارے جذبات مجھ سے چھپے نہیں' لیکن ابھی تمہیں اس لڑائی کے جہنم میں' جو ختم
ہوتے نظر نہیں آرہی' جھونکنے کا وقت نہیں آیا۔ یقین جانو جب کبھی ایسا موقع آیا

تمہارے سارے ارمان نکل جائیں گے۔ ابھی انتظار کرو اور دیکھو۔"

"لیکن یہ ظلم ہے چاچا۔ میرے ساتھی موت پر مر رہے ہیں اور میں یہاں روئیں تو رہا ہوں۔ میرا دوست شیرو سینکڑوں میل دور جنوں میں دشمن سے برسرپیکار ہے اور میں یہاں....."

وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ شدت جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا۔ لورلی نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا' پھر اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر آگے بڑھ گیا۔

☆○☆

شرفو نے اپنی دانست میں یہ باتیں تخلیئے میں کی تھیں' لیکن وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ جس پتھر کی اوٹ میں وہ دونوں محو گفتگو تھے' اس کے ایک کونے سے ٹیک لگائے زہراں نے ان کی ساری باتیں سن لی تھیں۔

"شرفو یہاں سے کیوں جانا چاہتا ہے؟" اس نے سوچا۔ "شاید میری وجہ سے' میری مسلسل سوگواری سے تنگ آ کر۔" وہ خود کو قصوروار گردانے لگی۔ "اسے کیا حق حاصل تھا کہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ رلاتی پھرے' لیکن اگر شرفو بھی چلا گیا تو کون اس کی غم گساری کرے گا۔ یہاں اس بھرے پرے پونچھ میں وہی تو اس کا سب سے نزدیکی عزیز تھا۔ باقی سب تو ایک ایک کر کے ختم ہو چکے تھے---- ایک جو تھا اس کی خبر بھی نہیں تھی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی کسی بلیدہ طاقت کے انتہائی مجبور کرنے پر وہ خواب کی سی حالت میں چلتی ہوئی شرفو کے سامنے آن کھڑی ہوئی جو پہاڑی کے دامن میں بہتے چشمے کے کنارے ایک درخت سے ٹیک لگائے اپنی گود میں رائفل رکھے پتھروں سے ٹکرا کر جھاگ اڑاتے پانی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"کیا مجھ سے بہت تنگ آ گئے ہو شرفو؟" اس کی آمد سے بے خبر شرفو اچانک اس کی آواز پر چونکا۔

اس نے گردن دوسری طرف موڑی تو زہراں کو اپنے سامنے پایا جس نے اپنے بکھرے بالوں کو سینے سے باندھ کر خود کو ایک بڑی سی چادر میں ڈھانپ رکھا تھا' لیکن جس کے جسم سے خارج ہوتی ہوئی برقی رو چادر کا پردہ چاک کرتی ہوئی باہر نکل کر شرفو کے دل و دماغ میں [illegible] گھستی چلی جا رہی تھی۔ وہ پل دو پل سے زیادہ اس کے چہرے پر نظریں نہ جما [illegible] اس نے گردن جھکا لی۔

[illegible] نے جھیں تک بھی تو بہت کیا ہے۔" زہراں نے اور بھی وہ سبھی بات بھی کہہ کر سر [illegible] شرفو نے جواب میں کچھ کہنا چاہا' لیکن اس کا تو جیسے حلق سوکھ کر رہ گیا تھا۔ اسے یوں [illegible] وہ اب کبھی بول ہی نہیں پائے گا۔ "بتا تو شرفو! کیا بات ہو گئی ہے میں نے تمہیں؟ ایک [illegible] اور یہاں کون ہے میرا؟"

---- شرفو کو زہراں کی اس بات نے لرزا کر رکھ دیا۔ وہ زہراں کو کیسے بتاتا کہ پچھلے دو [illegible] سے جو اذیتناک جنگ اس کے اندر چھڑی ہوئی ہے' اس سے کہیں بہتر تھا کہ وہ سچ [illegible] ہوا شہید ہو جاتے۔

"نہیں زہراں۔" اس نے حوصلہ کیا۔ "اگر تم ایسی بات سوچو گی تو مجھے بہت دکھ ہو گا۔ میں تو صرف اس لیے کہہ رہا تھا کہ یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہوں۔ میرا ضمیر ملامت کرتا ہے۔ مجھے شرم آنے لگی ہے خود سے۔"

زہراں نے دوبارہ اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں اب نمی تیرنے لگی تھی۔ "شاید بے چارے کو میرے دکھ نے غمگین کر دیا ہے۔" اس نے سوچا۔ وہ اس سے زیادہ بہتر جواز بھی [illegible] نوں کا اور کیا تلاش کر سکتی تھی۔ "دیکھو شرفو! تم شیرو کے دوست ہو اور مجھے بے حد عزیز، لیکن میں تمہارے لیے کوئی مجبوری نہیں بننا چاہتی۔ اگر تمہیں میری حفاظت کے خیال سے یہاں رکھا گیا ہے تو مطمئن رہو۔ تمہارے دوست کی غیرت پر کوئی جیتے جی ہاتھ نہ ڈال سکے گا۔ جاؤ اور غاصبو کو بتا دو کہ تمہاری رگوں میں بھی بلوچ غیرت مند خون دوڑ رہا ہے اور تم آزادی کے لیے بہت کچھ قربان کر سکتے ہو' حتیٰ کہ اپنے دوست کا پیار بھی۔"

اس لمحے زہراں جوالا مکھی بن چکی تھی---- اس کی آنکھوں سے اٹھنے والے شعلوں کی لپٹیں شرفو کے دامن دل تک آ پہنچی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولے' زہراں پروقار چال چلتی وہاں سے واپس ہو گئی۔

---- شرفو میں اتنی ہمت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ واپس جاتی زہراں کو نظر بھر کے دیکھ بھی سکتا۔

وہ چپ چاپ اٹھا' اپنی رائفل سنبھالی اور مجاہدین کے نزدیکی ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆○☆

پونچھ خاصا بڑا شہر اور مہاراجہ کے دور میں "پونچھ جاگیر" کا دارالخلافہ بھی تھا۔

ایک سایہ وہاں موجود تھا۔

نزدیک پہنچ کر جب اس نے نوادرد کو پہچان لیا تو ہاتھ کے مخصوص اشارے سے اپنے ساتھی کو متنبہ کیا۔ "دیا اور اس کے ساتھی اٹھ کر قریب آ گئے' پھر وہ سب نیم دائرے کی شکل میں نوادرد کے گرداگرد بیٹھ رہے۔ امیر خان کی نظریں جب اس کے چہرے پر پڑیں تو اسے یاد آ گیا کہ اس نے آج صبح ہی جب وہ عمدو گوجر کے ساتھ چھاؤنی میں دودھ لے کر گیا' اسے دیکھا تھا لیکن کس روپ میں؟ یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

"قریباً" پچاس ساٹھ سپاہیوں کی ایک کمپنی میجر رام سنگھ کی قیادت میں وہاں موجود ہے۔ مجاول بھی وہیں ہے۔ میں نے اس تک منصوبہ پہنچا دیا ہے۔" اس نے سرگوشیوں میں مخاطب کیا۔ پھر وہ انہیں فوجیوں کی پوزیشنیں سمجھانے لگا۔

"ٹھیک ہے دوست۔ اب تم چلو۔" امیر خان بولا۔

"خدا حافظ۔" کہہ کر نوادرد جس طرح آیا تھا' اسی طرح غائب ہو گیا۔

☆○☆

اس کی روانگی کے بمشکل دو تین منٹ بعد ہی وہ لوگ بھی وہاں سے اٹھ کر چل دیئے۔۔۔ ان کی کمان امیر خان نے سنبھال لی تھی۔ مسلسل اندھیرے میں چلتے رہنے کی وجہ سے اب ان کی آنکھیں کسی قدر دور دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔

چھاؤنی سے کچھ ہی دور وہ رک گئے۔ ان میں سے ایک نے جس کے ہاتھ میں ڈسچارجر تھا' وہاں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ یہ جگہ چھاؤنی سے بمشکل پندرہ بیس گز دور تھی اور یہ امر ان کے لیے باعث رحمت تھا کہ یہاں سرچ لائٹ موجود نہ تھی' نہ ہی چار دیواری میں کوئی "چیک پوسٹ ٹاور" بنایا گیا تھا۔ رک جانے والے کو امیر خان نے ہاتھ کے مختلف اشاروں سے سمجھایا اور باقی ساتھی اسے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

روانگی سے پہلے امیر خان نے اپنے پستول پر سائیلینسر فٹ کر لیا تھا اور وہ ان سب کے آگے چل رہا تھا۔ ان کا رخ اس دروازے کی طرف تھا جو ایک طرح سے چھاؤنی کا عارضی دروازہ تھا اور جس کے باہر لگے بیریئر کے ایک کونے پر بنے لکڑی کے ایک کیبن میں دو سنتری سگریٹ سلگائے بیٹھے تھے۔ انہیں اصولاً" تو اٹھ کر گشت کرنا چاہیے تھا' لیکن انہوں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کر لی تھی کہ جب سے شیرو فرار ہوا ہے' میجر رام سنگھ لاکھ چوکنا اور محتاط ہونے کے باوجود کبھی رات کے وقت چھاؤنی کے بیرونی دروازے تک آنے کا حوصلہ نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے ذہن پر ایک ہی بات سوار تھی کہ۔۔۔۔ اگر وہ رات کو

ہی اپنی حفاظت کا انتظام کر لیتا تو مجاہدین اپنی دھمکی پر عمل کر گزریں گے۔

چاروں طرف زمین سے نیچی چیزوں کی طرف رینگ رینگ کر اس طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے رینگنے کا انداز بھی بالکل کمانڈو جیسا تھا' پھر ان میں سے وہ تو کمال کر ایک ہو گئے تھے جو امیر خان اور عمدو اس لکڑی کے کیبن کی طرف رینگنے لگے جہاں آنے والی قیامت سے بے خبر دونوں سنتری رم کی اس بوتل سے پی رہے تھے' جو ان میں سے ایک کسی طرح جیب میں چھپا کر یہاں لے آیا تھا۔

دونوں دوست ایک دوسرے کی متضاد سمت میں لیٹے تھے۔۔۔۔ امیر خان کی نظریں لکڑی کے کیبن پر جمی ہوئی تھیں اور دائیں ہاتھ میں پکڑے پستول کی نال اس طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اسکیم کے مطابق جب عمدو گوجر نے کیبن کی اپنی سمت والی دیوار کو آہست سے ٹھوکر لگائی تو اندر بیٹھے دونوں سنتری یوں بدکے جیسے انہیں کسی بچھو نے ڈس لیا ہو۔

"کچھ سنا؟" ایک نے دوسرے کو مخاطب کیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں! کچھ بات ضرور ہے۔" دوسرے کی خوفزدہ آواز سنائی دی۔

"لیکن یار۔۔۔ یہ اس وقت یہاں کون ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"کہیں میجر صاحب ہی نہ ہوں۔" دوسرے نے اندیشہ ظاہر کیا۔

دونوں کا خیال چھاپہ ماروں کی طرف نہ گیا کیونکہ ابھی تک ان کی دانست میں وہ لوگ اس چل نہیں ہوئے تھے کہ اس طرح چھاؤنیوں پر بھی گھات لگا سکیں۔ دونوں اسی خیال سے سہم گئے کہ میجر رام سنگھ تک ان کی ڈیوٹی سے غفلت کی رپورٹ پہنچ گئی ہے اور وہ خود اچانک چھاپہ مارنے آیا ہے۔

دونوں ایک کونے میں رکھے لکڑی کے بکس میں رم کی بوتل چھپا کر دونوں ہی اپنی اپنی رائفلیں سنبھالتے افراتفری میں باہر نکلے کہ اپنی ڈیوٹی پر مستعد ہو جائیں۔ امیر خان کو بس اتنا ہی کافی تھا کہ ہدف نظر آ جائے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کا نشانہ کبھی خطا ہوا ہو۔ وہ اندھیرے میں صرف آواز پر نشانہ لگانے کا ماہر تھا۔ محض دو سیکنڈ کے وقفے سے دو گولیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں لپکیں اور بوکھلائے ہوئے سنتری باری باری اپنے سینوں کے بائیں طرف ہاتھ رکھے کوئی آواز نکالے بغیر زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ صرف ٹریگر دبنے کی ہلکی سی آواز دو مرتبہ امیر خان کے پستول سے برآمد ہوئی تھی۔

دونوں بجلی کی سی پھرتی سے دم توڑتے سپاہیوں کے سروں پر پہنچ گئے تھے اور اس خطرے کے پیش نظر کہ مبادا ان کے منہ سے کوئی آواز نکلے' انہوں نے دونوں کے منہ پر

اپنے ہاتھ روک دیئے تھے۔

——پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ چاروں دیواروں سے چھٹے اندر داخل ہو رہے تھے اور
ان میں سے ایک مشین گن والے کو ایک محفوظ پوزیشن میں لگا کر آگے بڑھ گئے۔
مشین گن مین اس بیرک کے سامنے نصب کی گئی تھی' جہاں سپاہی سو رہے تھے اور
انہیں یہاں گشت پر موجود پہرے داروں سے خطرہ تھا۔

امیر خان ان سے الگ ہو کر ان کوٹھڑیوں کی طرف نکل گیا جہاں سجاول کو اس نے
بند دیکھا تھا۔ مدد گوجر اور اس کے دوسرے ساتھی نے بھی مشین گن والے سے مل کر
اپنی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں اور اب ان سب کو محض اپنے اس ساتھی کے اشارے کا انتظار
تھا جو انہیں اطلاع دے کر واپس یہاں آ گیا تھا۔

——بالآخر وہ ساعت سعید بھی آ گئی۔ بیرک کے دروازے کے سامنے لگے "الارم"
کے پاس انہوں نے ایک سائے کو کھڑے دیکھا۔ یہ الارم آگ لگنے کے خطرے کے پیش نظر
بجایا جاتا تھا۔ سائے نے الارم کا بٹن دبایا اور انتہائی تیز ہوٹر بجنے لگا۔

——بیرک میں آگ لگنے کی اطلاع سے افراتفری پھیل گئی۔ سپاہی ہوٹر کی آواز پر
چیختے چلاتے باہر لپکے جہاں ہلکی مشین گن نے انہیں چاٹنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ان
پر مختلف اطراف سے پوزیشنیں بدل بدل کر پھینکے گئے دستی بموں نے قیامت ڈھا دی۔
مجاہدین کے اس دلیرانہ شب خون نے ان کے اوسان خطا کر دیئے۔ صرف ڈیوٹی پر موجود
سپاہی ہی ایسے تھے جو کارروائی کر سکتے تھے' لیکن انہیں ابھی تک یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ
آخر یہ حملہ آور ہیں کدھر؟ وہ گولی چلائیں تو کس پر؟

☆○☆

امیر خان دیوار سے چمٹا اس طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے فائرنگ اور مرنے والوں کی چیخ
پکار سے گھبرا کر باہر نکلتے گارڈ کو دیکھ لیا تھا اور اب وہ بے چینی سے اس لمحے کا منتظر تھا جب
یہاں موجود پہرے دار اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے یہاں سے باہر نکلے' لیکن اس کم بخت
نے شاید باہر نہ نکلنے کی قسم کھا رکھی تھی یا پھر اسے میجر رام سنگھ کی طرف سے بڑی سختی سے
ہدایت کی گئی تھی کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں' وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

امیر خان کے اعصاب انتظار کی شدت سے تڑخنے لگے تھے۔ اس نے مزید انتظار کا
عذاب سہہ لینے کی بجائے آگے بڑھ کر کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا اور دیوار کے ساتھ
ساتھ چلتا وہ ان کوٹھڑیوں کے کنارے تک آ گیا جہاں اس کا غازی مرد--- سجاول خان

[illegible] کی سرحدوں پر لڑتا اپنے جیالے ساتھیوں کا لشکر تھا۔
[illegible] امیر خان کو یہاں موجود پہرے دار نظر نہیں آ رہا تھا' پھر جیسے خود بخود وہ
[illegible] کی تہ تک پہنچ گیا اور گارڈ کی چالاکی کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اندازہ لگا لیا
[illegible] یہاں موجود پہرے دار مضبوط اعصاب کا مالک ہے اور اپنے ساتھیوں کی طرح بوکھلا کر
[illegible] بھاگنے اور حملہ آوروں کی گولیوں کا شکار بننے کی بجائے وہ یہاں چھپ کر حملہ آوروں کا
[illegible] تھا تاکہ اچانک اندر گھس آنے والوں پر نشانہ آزما سکے۔ اسے شاید سجاول خان کی
[illegible] کا احساس تھا اور یہ اندازہ بھی اس نے لگا لیا تھا کہ حملہ آوروں نے یہ سارا
[illegible] محض سجاول خان کو دشمن کی قید سے رہا کروانے کے لیے پھیلایا ہے۔
[illegible] خان جیلان اتھلی جنس کا تربیت یافتہ اور پیشہ ور کمانڈو تھا۔ اس نے اچانک اپنے
[illegible] بڑھائے اور اپنے سامنے دو تین گز کے ایریا میں تیزی سے پاؤں زمین پر مارے
[illegible] یہ تاثر ابھرنا تھا کہ کوئی بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا ہے۔ اس کی یہ تدبیر کارگر ثابت
[illegible] دوسرے ہی لمحے اسے ایک سیل کے سامنے سے بھاگ کر دوسری طرف جاتا ہوا
[illegible] اور دکھائی دے گیا۔

[illegible] خطرناک حد تک چالاک تھا۔ گو کہ وہ امیر خان کے دھوکے میں آ گیا تھا' لیکن اس
[illegible] بھی ایک چال چلی تھی اور ایک طرف سے دوسری طرف بھاگ کر تیزی سے اس طرح
[illegible] کیا جیسے وہ بھی اپنی موجودگی کا دھوکہ دے کر وہاں آنے والے کو سامنے آنے پر آمادہ کر
[illegible]

[illegible] ان دونوں میں ایک دوسرے کو دھوکا دے کر مارنے کا مقابلہ شروع ہو گیا اور دو ہی
[illegible] بعد اس مقابلے کا اختتام امیر خان کے پستول سے نکلی گولی نے کر دیا۔ گارڈ کے کندھے
[illegible] طرف دو گولیاں ایک دوسرے سے محض تین چار انچ کے فاصلے پر لگیں اور وہ
[illegible] انجام کو پہنچ گیا۔

اس کے ساتھ ہی پستول امیر خان کے ہاتھ سے جیب میں پہنچ گیا اور اس نے اشین گن
سنبھال لی۔ بلی کی سی پھرتی سے وہ اس کوٹھڑی کے سامنے جا پہنچا جہاں اس کے خیال میں
سجاول کو موجود ہونا چاہیے تھا' لیکن اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا جب اس نے سجاول
کو وہاں سے غائب پایا۔ امیر خان دیوانہ وار ایک ایک کوٹھڑی میں جھانکتا پھرا اور ہلکان ہوتا
رہا۔ آخر ایک کوٹھڑی کے فرش پر اسے گوشت کا ایک ڈھیر سا پڑا نظر آیا' لیکن اس کے جسم
میں جنبش نہیں ہو رہی تھی۔

ملاحظہ کرتے ہوئے قدرے جھک کر اس کی طرف گھسنے کی بھرپور کوشش کی تھی
اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا لیکن وہ ایک ایسا شخص تھا جو کسی بھی
اچھا خاصا اطمینان کن کھیل پر بھی بدمزہ ہو جاتا تھا۔ بدمزگی نے اسے بھی اس ناپسندیدہ کھیل
آنے والے کو تنبیہ یا آواز لگانے کی مہلت بھی میسر نہ آئی۔ امیر خان نے آگے بڑھ
کر زمین پر آنکھیں پھیلتے ہوئے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"میجر رام سنگھ" وہ بڑبڑایا۔ "بلاشبہ تم اسی کی موت کے مستحق تھے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد وہ سجاول کو میجر رام سنگھ کی اس جیپ میں پھیل سیٹ پر لٹائے ہوئے
احتیاط سے بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔۔۔۔ دھماکوں اور چیخوں کی آوازیں رفتہ رفتہ
مدھم پڑنے لگی تھیں۔

اس کے ساتھیوں نے بھی "شکار کھیلنے" میں کسی بخیلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

۔۔۔۔جیپ اس نے بیرونی دروازے کے ایک طرف کھڑی کر دی اور خود اس سے بہت
کر اسٹین گن تان کر کھڑا ہو گیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اور تین چار منٹ بعد ہی
باقی تینوں ساتھی بھی اس تک پہنچ گئے۔ واپسی کا سفر الٹوں نے اسی جیپ میں کیا۔

جیپ "ڈاچار جر کیپ" والے ساتھی کے نزدیک جا کر ٹھہر گئی' جس نے انہیں دیکھتے ہی
اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ "کیپ" سے نکلنے والے بم بڑی نفاست سے ایک ترتیب کے ساتھ
پہلے سے مقرر کردہ مارکٹ پر گر رہے تھے۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ "چاند ماری" کی
مشق کر رہا ہو۔

ان کے دیکھتے ہی دیکھتے چھاؤنی سے شعلے بلند ہو کر آسمان کو چھونے لگے۔ انہی شعلوں
کی روشنی نے ماحول کو روشن کر دیا تھا اور وہ جلد از جلد اس "بربادی" سے نجات پانا چاہتے
تھے۔

جیپ بڑی تیزی سے واپس بھاگ رہی تھی۔ "صاعقہ" کے جانباز' میجر رام سنگھ کو موت
کی نیند سلا کر اور اس کی "چھاؤنی" کو نیست و نابود کر کے اپنے ساتھی کو اس کے خونی پنجوں
سے چھین لائے تھے۔

امیر خان نے اسے آواز دے کر مخاطب کرنے کی بجائے اٹھین گن کی نال
کو نرمی کا بھی کھلا اور اندر جاگزیں ہونے کا پیغام دیا۔ لیکن وہ ناہنجار ساتھی بدستور گھورتا رہا۔
امیر خان نے جھک کر دیکھا اس کی آنکھیں تو کھلی تھیں' لیکن چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔
بری طرح سوج چکا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ کر سیاہ ہو گئے تھے۔
اس لیے وہ کریہاک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی' اس نے امیر خان
جسم میں چنگاریاں دوڑا دیں۔ اس کی آنکھوں کی تیزی سے بدلتی رنگت نے امیر خان
اندھیرے میں بھی سجاول خان محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے زمین پر گرنے سجاول کو
اٹھایا اور باہر کو لپکا' لیکن ابھی وہ کوٹھڑیوں والے احاطے کے بیرونی دروازے
اسے ایک جیپ جس کی ہیڈلائٹس بجھی ہوئی تھیں' بڑی تیز رفتاری سے اس طرف آتی
دکھائی دی۔ اتنے اندھیرے میں اتنی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرنا کسی عام آدمی کا کام نہیں
تھا یا تو یہ شخص پاگل ہے یا پھر جیپ اس کے کنٹرول سے باہر ہو چکی تھی۔
"کہیں میجر رام سنگھ ہی نہ ہو؟" اس نے سوچا کیونکہ اس افراتفری کے عالم میں
ایک شخص تھا جو اپنے "شکار" کی فکر کر سکتا تھا۔ اپنی دانست میں شاید وہ اس لیے
آ رہا تھا کہ حملہ آوروں کے سجاول تک پہنچنے سے پہلے پہلے یا تو وہ اسے کوئی مار دے یا
یہاں سے چپ چاپ نکل کر کسی محفوظ مقام پر لے جائے۔
میجر رام سنگھ کا خیال دل میں آتے ہی ایک مسکراہٹ خود بخود امیر خان کے ہونٹوں پر
گئی۔ اس نے بڑی احتیاط لیکن پھرتی سے سجاول کو ایک کوٹھڑی کے آگے سیدھا کر آہستہ سے
اس طرح لٹا دیا کہ نزدیک آنے پر ہی وہ نظر آ سکتا تھا اور خود وہ اس احاطے میں داخل
ہونے والے دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اسٹین گن پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور
دھڑکتے دل سے انگلی ٹریگر پر جمائے وہ آنے والے کا منتظر تھا۔
۔۔۔۔دوسرے ہی لمحے جیپ کے بریک دور سے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ اور
ساتھ ہی امیر خان کو جھٹکے سے جیپ رکنے کا احساس ہوا اور اس نے اپنی سمت آنے والوں
کی آواز سنی۔۔۔۔ آنے والا ہر قسم کی احتیاط کو بالائے طاق رکھ کے جیپ سے اتر کر برق رفتاری
سے داخل ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پکڑا ریوالور امیر خان کو بخوبی نظر آ رہا تھا۔
۔۔۔۔اور جیسے ہی وہ اس سے چند گز آگے نکلا۔ امیر خان پکارا۔
"ہالٹ!"
"فائر!" سننے والے کے منہ سے نکلا اور اپنی دانست میں اس نے اطمینان بھرا

لہو کا چراغ

جنرل طارق نے اس واضح حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا کہ جب تک توپخانوں کو بکتر بند گاڑیاں نہ دی گئیں، ان کے لیے اس قیامت کی گولہ باری سے گزرنا ناممکن ہو گا کہ بھارتی فوج نے سری نگر کے اردگرد اپنی قلعہ بندیاں مستحکم کر لی تھیں اور ان کی ایمونیشن تک کر میدان میں آ چکی تھی۔

قبائلی حملہ آوروں نے دشمن کی پشتوں پر سامنے سے بڑا تیز اور جان توڑ حملہ کیا تھا کیونکہ دشمن کے پہلو یا بارش کی وجہ سے کھڑے ہو جانے والے پانی نے بالکل محفوظ کر دیئے تھے، لیکن اپنی لاکھ جواں مردی کے باوجود وہ سری نگر کا دفاعی حصار نہ توڑ سکے کیونکہ ان کی توقعات کے بالکل برعکس شہر کے اندر سے کوئی مداخلت نہیں ہوئی تھی اور سری نگر میں موجود بھارتی افواج کو شیخ عبداللہ کی مہربانیوں کے طفیل بالکل محفوظ "عقب" میسر آ گیا تھا۔

جنرل طارق بڑی تیز رفتاری سے بھاگم بھاگ راولپنڈی پہنچا تاکہ کم از کم دو بکتر بند گاڑیاں ہی مجاہدین کے لیے حاصل کر سکے۔ اس کی پہلی ملاقات کرنل مسعود سے ہوئی جنہوں نے اپنے جذبہ جہاد سے سرشار جنرل طارق کو پوری بکتر بند رجمنٹ دینے کی یقین دہانی کروا دی۔ اس حوصلہ افزائی نے جنرل طارق کا سیروں خون بڑھا دیا، لیکن یہ خوشی بالکل عارضی ثابت ہوئی کہ ایک طرف تو رجمنٹ کو خفیہ طور پر تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا جب کہ دوسری طرف وقت قیامت کی چال چل گیا۔ جب ——— "سیاست کے فرزانوں" تک ان "دیوانوں" کی تازہ واردات کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے سر پیٹ لیا اور فوراً شور مچاتے جنرل طارق کی طرف دوڑے۔ ان سب کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا

"انڈیا ہم پر حملہ کر دے گا——— انڈیا ہم پر حملہ کر دے گا۔"

بے چارے جنرل طارق کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ میدان جنگ کا جیالا جرنیل حیرت اور افسوس سے کار پردازان سیاست کے منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس نے لاکھ کوشش کر ڈالی

☆○☆

— تمام صبح خاتمہ جنرل طارق کے سامنے تھے اور ہزار طرح کی سوچیں بھی ——!

— لیکن اسی شام ان کے مکان پر ۶ نومبر کی رات کو کشمیر کی جنگ آزادی کے لیے جذباتی لیڈر بڑی امیدیں لے بیٹھے تھے۔ یہ لوگ ہر صورت جہاد جاری رکھنا چاہتے تھے جب کہ حکومت کی فوج کو سختی سے غیر جانبدار رہنے کی ہدایات بھی پیش نظر تھیں۔

ان کشمیری لیڈروں کو کسی ایسے فوجی کی تلاش تھی جو اپنی جان اور مستقبل داؤ پر لگا کر ان کے مظلوم مسلمان بھائیوں کی مدد کو آگے بڑھے اور پہاڑوں کے خلاف گوریلا جنگ سنبھالے۔ یہ لوگ اس سے پہلے آرمی کے قریباً سب ہی سینئر کمانڈروں سے مظلوم کشمیریوں کی مدد کرنے کی اپیل کر چکے تھے اور اب ہر طرف سے مایوس ہو کر اس بخت آور جنرل کے پاس آ گئے تھے جو اپنے خون جگر سے تاریخ کے اوراق پر وہ لہو رنگ کہانی لکھ رہا تھا جو نسلیں اپنی آنے والی نسلوں کو تحفہ نقل کیا کرتی ہیں۔

وہ سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے —— اور آخر ہوا کی لہروں میں ارتعاش ہوا۔

"میں جاؤں گا وہاں —— میں لڑوں گا —— میں اکیلا ہی لڑوں گا۔ خدا کی قسم! جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے' بھارتی فوج کو آزاد کشمیر پر قبضہ نہیں کرنے دوں گا۔" جنرل طارق نے چٹان کے سے مضبوط عزم سے انہیں مخاطب کر کے ان کے مردہ چہروں پر زندگی کی لہر دوڑا دی۔

اور پھر ۷ نومبر کی شام ایک اسٹیشن ویگن جو جنرل طارق کا ہیڈ کوارٹر بھی تھی اور جس میں ایک وائرلیس سیٹ' دو رضاکار سگنلر اور کیپٹن تسکین الدین موجود تھے' تاریخ حریت کا نیا باب رقم کرنے کے لیے مکھ کی طرف روانہ ہو گئی۔

—— ان کے سنگ سنگ ان ہزاروں لاکھوں مجبور اور بے کس انسانوں کی دعائیں بھی تھیں جو اپنے پیاروں کو شہید کروا کے جانے کب سے کسی طارق بن زیاد کے منتظر تھے۔

HBC

[illegible]

[illegible] رات کے بعد پہنچے تھے۔ فضا میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ [illegible] بھاری توپ خانے کو [illegible] میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ ایک مکان بھی ایسا نہیں تھا جس کی [illegible] کی دیواریں چھلنی نہ ہو چکی ہوں۔ ایک جگہ جنرل طارق کو [illegible] کی [illegible] کی [illegible] دیں۔ قریب ہی جھاڑیوں میں [illegible] ٹینک جنرل کو میجر خورشید کی [illegible] بھی سیالکوٹ سے [illegible] کا حکم دیا تھا۔

[illegible] پہنچ کر [illegible] ترین اطلاع ملی کہ دشمن رات ایک بھارتی بریگیڈ بارہ مولا پہنچ گیا ہے [illegible] سے بمشکل ۳۰ میل تھا لیکن یہ ۳۰ میل مکمل پہاڑی علاقہ تھا جس کے [illegible] میں درمیان سے ایک سڑک گزر کر اوڑی تک آتی تھی۔ ایسا علاقہ قبائلی جنگجوؤں کے لیے [illegible] موزوں تھا۔ سڑک دونوں اطراف سے بند تھی۔ ایک طرف تو درختوں اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں تھیں جب کہ دوسری طرف تیز رفتار جہلم کی سرکش موجیں۔

[illegible] پر ایک پل اوڑی سے قریباً پندرہ سولہ میل دور بنا ہوا تھا' لیکن پیدل گزر کر فوجی گاڑیوں اور بھاری اسلحہ یہاں سے پار نہیں اتارا جا سکتا تھا۔ سڑک نیزمی میزمی تھی اور راستے میں جگہ جگہ دشمن کے بنے ہوئے جھولا نما پل موجود تھے۔

[illegible] پر دشمن کے لیے رکاوٹ کھڑی کی جا سکتی تھی۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر "پکٹوں" کے ساتھ لیڈ وانس کرتا بھارتی لشکر کے بس کا روگ نہیں تھا کیونکہ قبائلیوں کی موجودگی میں "پکٹیں" بنانا ممکن نہیں تھا۔ اس کے لیے بے تحاشا نفری درکار تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ جوانوں کو بھرتا کر لیڈ وانس کیا جا سکے۔

جنرل نے یہاں رک کر وقت ضائع کرنے کی بجائے فوراً" اور راتوں رات آگے بڑھ کر راستے میں آنے والے ایک اہم پل کو اڑانے کا پروگرام بنایا تاکہ دشمن کی پیش قدمی رک جائے اور انہیں دفاعی مورچہ بندیاں قائم کرنے کی مہلت نصیب ہو۔

یہاں ڈائریکٹ ٹرانسمیشن کا رابطہ پہاڑ کے چند کنستر اور کینٹیلیں ہاتھ لگ گئیں۔ جنرل نے کسی نہ کسی طرح وہاں رابطہ قائم کیا۔ ایس-ایس-اے (ایئر سپیشل آرمی) کے رضاکار جو جملہ کمانڈو تربیت کے حامل تھے اکٹھے کیے اور بے سروسامان رضاکاروں کے اس مختصر سیکشن کے ساتھ [illegible] طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ راتوں رات دشمن کے گشتی دستوں کی آنکھوں میں دھول

[illegible] کے ساتھ ہی باقی مجاہدین کمپنیاں [illegible] کے ساتھ ہی پل پر آ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی باقی مجاہدین کمپنیاں [illegible] کے ساتھ ہی پل پر آ گئیں۔ [illegible] سے پہلے پہنچ کر ایک کمپنی اصل

میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں واپس جانے کے لیے نہیں آیا۔" اس نے غصے
بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"ہم سب یہیں ایک ساتھ مر جائیں گے۔ ہم سب ——" اس سے آگے
بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

☆○☆

ان کا یکشن کمانڈر پھن داس مہاراجہ کی فوج کا سابقہ صوبیدار آگے ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ باقی تمام یکشن پیچھے سکری کنی بیٹھی تھی۔ شیرو کے پہلو میں موجود غلام محمد بھی مہاراجہ کی فوج کا سابقہ حوالدار تھا' لیکن تھوڑے ہی عرصے کی ملازمت میں اس نے شیرو کو اپنا معتقد کر لیا تھا۔ وہ بظاہر تو ان پڑھ نظر آتا تھا' لیکن اس کی باتیں بڑے پڑھے لکھے مالوں جیسی تھیں۔

"میں پچھلے ہفتے جموں سے واپس آیا ہوں۔" اس نے خاموشی کو توڑا۔

"پھر؟" شیرو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ تم ہو کہاں کے رہنے والے؟" اس نے اچانک ہی شیرو سے پوچھ لیا اور شیرو کا خیال نبی خان کی طرف چلا گیا جس نے روانگی کے وقت اسے اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ اپنے پونچھ کے ساتھیوں کے علاوہ اور کسی کو اپنا رازدار نہ بنائے۔

"میں پونچھ سے آیا ہوں۔" شیرو نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

"پونچھ سے؟" غلام محمد کو حیرت ہوئی۔ "تم سے کس گدھے نے کہا تھا یہاں کری گڑھ آنے کے لیے؟ ادھر مظفر آباد کی طرف نکل جاتے۔" اس کے لہجے میں حقارت اور طنز نمایاں تھا۔

"نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔" شیرو نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

"پھر تو تم بہت مطمئن ہو گئے ہو گے یہ نوکری پا کر؟" اس کے لہجے کی کاٹ بڑی گہری تھی۔

"تم جموں کی کیا بات کر رہے تھے؟" شیرو نے چاہا کہ موضوع بدل کر اس سے جان چھڑا لے۔

"ہاں جموں ——" اس نے لمبی سانس بھری۔ "ادھر جموں کے سارے صوبے میں شاید ہی کوئی مسلمان زندہ بچا ہے۔ جموں' کٹھوعہ' ادھم پور' رام گڑھ اور ریاسی کے علاقوں میں ہندوؤں نے بھارتی فوج کی مدد سے انہیں چن چن کر مار ڈالا ہے۔ وہ مظفر آباد

وہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ ہیں جو انہیں اپنے مسلمان بھائیوں سے صلح صفائی کی تلقین کرنے جا رہے ہیں۔ سنو!" اس نے شیرو کی طرف جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "یہاں بھی ہم صلح صفائی اور بھائی چارے کے لیے اب ہندوؤں کے درمیان کوئی مسلمان باقی نہیں رہنے دیں گے۔ کھوکھلا اور بے بنیاد امن پیدا ہے۔ نیشنل کانفرنس کے سیاسی مقبوضے میں بھی ہم نے بہت سے کام کیے ہیں جہاں شیخ عبداللہ سادہ لوح مسلمانوں کو اسلام کے نام پر بیوقوف بنا کر ان کی ہمدردی کی لہر جس طرف چاہتے' ٹیک کر لے جاتے۔ وہاں جموں میں امن امن کی رٹ لگی ہے۔"

"چاچا غلام محمد۔" شیرو نے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کیا۔ "میں سیدھا سادا سپاہی ہوں' کوئی سیاسی لیڈر نہیں کہ تمہاری باتوں کی تہ تک پہنچ سکوں۔ میرا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے اور بس۔ جموں میں کیا ہوا؟ ہوٹ میں کیا ہو گا؟ مجھے ان باریکیوں کا کیا پتہ!"

"اور ہاں" حوالدار غلام محمد نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ "یاد رکھو نفرت کا ردعمل صرف نفرت ہوتا ہے —— نفرت! جب ہوٹ پہنچ کر یہ مسلمان بے چارے اپنے بھائیوں کا حال دیکھیں گے تو ہندوؤں کے لیے ان کے دل میں نفرت کا جذبہ اور مستحکم ہو جائے گا اور یہ نفرت صرف جموں یا ہوٹ کے نہیں' سارے کشمیر کے ہندوؤں کے لیے ہو گی۔ تب کیا کرے گا یہ شیخ عبداللہ —— شیر کشمیر؟" آخری الفاظ اس نے خاصے طنزیہ اور حقارت سے ادا کیے تھے۔

"تم یہ سب کچھ مجھے ہی کیوں سنا رہے ہو؟" شیرو بالآخر چیخ پڑا۔ یکشن کے باقی تمام ہوم گارڈز انہیں چونک کر دیکھنے لگے۔

"سنو ——" حوالدار غلام محمد کی آواز خاصی بلند تھی۔ وہ اپنے انجام سے بے خبر نظر آ رہا تھا۔ "تم سدھن ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ وہاں تمہارا قبیلہ ہندوؤں کے ساتھ زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہا ہے اور تم یہاں منہ اٹھا کر امن قائم کرنے آ گئے ہو۔" شیرو مسکرا کر چپ ہو رہا۔

ناسری نالے کے پاس پہنچ کر ٹرک رک گیا۔ شاید ان کا یکشن کمانڈر پل کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

"وقت وقت کی بات ہے۔" غلام محمد پھر بولنا شروع ہو گیا۔ "میں ۲۵ اکتوبر کو مہاراجہ کو بھی جو سری نگر سے بھاگ کر جموں جا رہا تھا' رکنا پڑا تھا۔ اس نے شاید اسی جگہ کھڑے ہو

کر پہاڑ سے آنے والے سکھوں سے کہا تھا "خالصہ! راج پاٹ سے جا رہا ہے تو بچاؤ۔" اور جانتے ہو خالصہ کی نے راج دربار کو بچانے کے لئے کیا کیا؟" اس نے شیرو کے کندھے پر ہاتھ مار کر قریب کو ایک طرف ہٹا کر باہر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔ "انہوں نے اس وقت بونت میں پہلا قدم رکھا اور یہ خبر اور نہتے مسلمانوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ مظفر آباد اور راولپنڈی کے سکھوں نے اپنا سارا غصہ بونت کے نہتی بھر پر نکالا۔ اب وہاں کیا رہ گیا ہے؟" نوالدار غلام محمد خاموش ہو گیا۔ اس نے گہری نظروں سے مسلمانوں کی طرف آتا دیکھ لیا تھا۔ شاید وہ ان لوگوں کو تازہ ہدایات دینے آ رہا تھا۔

"تم لوگ ذرا "توام اپ" کر لو۔ ہم یہاں پانچ دس منٹ ٹھہریں گے۔"

تمام لوگ ایک ایک کر کے نیچے اتر آئے اور ہاتھ پاؤں ہلا کر اپنے تھکے ہوئے اعصاب اور جسموں کو حرارت پہنچانے لگے۔

——اس یکشن میں صرف یہی تین آدمی 'ڈرائیور' مچھن داس اور غلام محمد ان کے اپنے تھے' باقی تمام لوگ وہی تھے جو پونچھ سے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر آئے تھے۔ وہ سب شیرو کے صرف ایک اشارے پر کسی بھی لمحے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھے۔ شیرو نے بونت سے پہلے ہی کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر غلام محمد ان کے ساتھ نہیں تھا تو وہ ان کی مخالفت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

انہیں یہی مشن سونپا گیا کہ ٹرک پر قبضہ کر کے اپنی اصلیت چھپاتے ہوئے وہ لوگ بونت میں موجود بھارتی فوج پر نقب لگائیں۔

یہ دس منٹ شام کو پورے ہوئے۔ بعد میں بونت پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ پہلی خصوصی ہدایت کے تحت روکا گیا تھا کیونکہ ابھی مقامی ہندوؤں اور سکھوں کے لیے بونت کے نواحی دیہاتوں میں "شکار" موجود تھا اور وہ لوگ دوران شکار بوم گارڈز کے اس یکشن کو جس میں زیادہ تعداد مسلمان سپاہیوں کی ہے' یہاں بلا کر کباب میں ہڈی بنانے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

☆○☆

شام کے گہرے سائے بونت کی نحوست کو چار چاند لگانے کے لیے اب آہستہ آہستہ اسے اپنے دامن میں سمیٹ رہے تھے۔

۔۔۔۔ابھی ان لوگوں نے ناشری جگہ عبور کیا ہی تھا جب اچانک ٹرک ایک دھچکے سے ۔۔۔ کے ٹوٹے کا احساس ہوتے ہی تمام سپاہی پھرتی سے چھلانگیں لگا کر نیچے از

[illegible] ہم کہانی میں ایک دہشتناک موڑ آ گیا تھا۔ ٹرک [illegible] سڑک سے نکلے ہوئے [illegible] میں [illegible] ایک [illegible] ہوا تھا اور ایک نیم پاگل عورت کو ایک بوڑھے شہری نے اپنی گرفت [illegible] اور مچھن داس یہ جھپٹ رہی تھی۔ ان دونوں کی آنکھوں سے [illegible] شاید [illegible] ہو رہی تھی۔

[illegible] نوالدار غلام محمد ان کے درمیان سے نکل کر آگے بڑھا۔ اس نے [illegible] مخاطب کیا تھا۔ دونوں مقامی دیہاتی سہمے ہوئے تھے۔

"میری زبان میں انہیں مخاطب کیا تھا۔ دونوں مقامی دیہاتی سہمے ہوئے تھے۔ [illegible] نہیں ——— کہہ نہیں۔" بوڑھے نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔ "پاگل ہے یہ۔ پیچھے ہٹ جائیں۔ آپ لوگ جائیں۔"

ہی بچہ مار ڈالا ——— غداروں نے مار ڈالا۔" اور پھر بھی واہ میں میری بیٹی نہیں تھی۔ یہاں اس نے بچہ مار ڈالا۔" وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر مچھن داس کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے چلا رہی تھی۔ اس کا بچہ بلا پڑ رہا تھا جب کہ عورت بھیڑی ہوئی شیرنی نظر آ رہی تھی۔ خوف اور دہشت سے محلہ سب کی سمجھ میں آ گیا۔ اس بدنصیب کی لڑکی کو وہیں بے آبرو کر کے قتل کر دیا گیا اور جب یہ جان بچا کر سڑی ٹھر کی طرف بھاگ رہے تھے تو ٹرک ڈرائیور نے لاپرواہی سے اس کے بچے کو مار ڈالا۔ صوبیدار مچھن داس اسے کہا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

دیکھتی ہے سالی۔" کہہ کر اس نے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور عورت پر گولی داغ دی۔

یک وقت دو فائر ہوئے تھے۔ ایک گولی مچھن داس کے پستول سے نکلی اور پاگل عورت کے سینے میں لگی جبکہ بوڑھے کشمیری نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ خون میں بھیگ گئے۔ دوسرا فائر حوالدار غلام محمد نے کیا تھا۔ گولی صوبیدار مچھن داس کی پشت پر لگی اور وہ منہ کے بل آگے جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ معاملے کی نوعیت جان سکتے' شیرو نے گن کا بولٹ گرنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا فائر ہوا اور گولی مچھن داس کی کھوپڑی کو توڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

ٹرک ڈرائیور نے اپنی اسٹین گن سیدھی کی ہی تھی کہ شیرو کی گن سے نکلی گولیوں نے اسے چاٹ لیا۔ سبھی لوگ بھونچکے سے وہاں کھڑے تھے۔ یہ سارا عمل اتنی تیزی سے اور اچانک انجام پایا کہ کسی کو اپنی جگہ سے ہلنے کی مہلت بھی نہ ملی۔

سب سے پہلے شیرو ہی اس عورت پر جھکا جو اب بوڑھے کشمیری کے ہاتھوں سے نکل کر

دشمن پر جا پڑی تھی۔ اس کا منہ کھل گیا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابل آئی تھیں۔ سانسوں کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا۔

سے پہلے کہ کوئی سپاہی اپنی بوٹ سے پانی اس کے منہ میں ڈالتا، بکی پاگل عورت کی لاش نے تختہ سے فیروزوں کے لیے پوچھ کی کراس بھی تک نہ تھی کہ ہم عمل کیا کرتے آئے ہیں تو اس لیے کہ جس حد تک ممکن ہو دشمن کا نقصان پہنچائیں اور پوچھ ہی تک محدود نہ رہے۔ سارے کشمیر میں پھیل جائے۔"

شیرو نے حوالدار غلام محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ "چچا غلام محمد نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں بیک وقت محبت اور احترام کی پیش اٹھ رہی تھیں۔ "میں فوج سے ریٹائرڈ ہو چکا ہوں بیٹا، لیکن ابھی ان ہاتھوں میں اتنا دم ہے کہ یہ بڑھ کر دشمن کا گلا گھونٹ سکیں۔ میں تمہارے جذبے کو سلام کرتا ہوں۔ پوچھ کی ہڈیوں پر سلامتی بھیجتا ہوں جنہوں نے کشمیر کو ایسے فیرت مند سپوت عطا کیے ہیں جو کبھی پیچھے نہ پاؤ گے۔"

"یہ سب ہمارے ساتھی ہیں اور پوچھ سے ہم اکٹھے آئے ہیں۔" شیرو نے غلام محمد کو بتایا۔ باقی مجاہدین کی طرف سے بھی مطمئن کر دیا۔

بوڑھے کشمیری کی داڑھی بھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔ وہ سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔ کبھی وہ بے بسی سے روتے روتے بچے کی لاش پر نظر ڈالتا، کبھی پاگل عورت کی لاش پر اور بچوں کی طرح سسکنے لگتا۔ پھر اچانک جیسے اسے چپ لگ گئی۔ اس نے اپنا پھٹی پھٹی پھٹکی قمیص کے پلے سے اپنا چہرہ صاف کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں رائفل چلانا جانتا ہوں۔" اس نے شعلے برساتی نظروں سے شیرو کو مخاطب کیا۔ "اسے ایک وردی دے دو۔ دونوں لاشیں دفن کر دو اور ان دونوں کو اٹھا کر ان کمبلوں میں لپیٹ آؤ۔" اس نے پچھن داس اور ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احکامات جاری کیے۔ "ان کی تلاشی اچھی طرح لے لینا۔"

کرنے والوں میں سے ایک کی رائفل اور گولیوں کا پتہ اس نے بوڑھے کشمیری کو تھماتے ہوئے کہا۔ "ہم ان دونوں کا انتقام بھارتی فوج سے ضرور لیں گے۔ بیگناہ ہزاروں معصوموں کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہو گا۔"

پھر انہوں نے دونوں لاشیں کندھوں سے گڑھے کھود کر وہاں دفن کر دیں اور باقی دونوں کو کسی کمبل کی نذر کر دیا۔ اب ان سب کی کمان عملاً شیرو کے ہاتھ میں تھی جسے حالات نے

[illegible] ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں ایک بار سپاہی بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے [illegible] نظر اٹھائی اور ان سے مخاطب ہوا۔

[illegible] ہم کامیاب ہو کر مراجعت کر رہے ہیں۔ الحمد للہ آج وہ پورے کرنے کا موقع [illegible] اللہ کے حضور دعا کریں کہ وہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی نصیب [illegible] کشمیر کی موت کے متعلق وہ کہانی سچائی جو ان لوگوں نے آگے بیان [illegible] کے مطابق ان لوگوں نے سری نگر سے آنے والی سڑک پر شہر کے باہر ہی بنے [illegible] قیام کرنا تھا اور امن و امان قائم کرنے میں "سنتائی پولیس" کا ہاتھ بٹانا تھا۔ وہ [illegible] لے کر آئے تھے۔ ڈاک بنگلے پر موجود انسپکٹر اشونی کمار ان کا منتظر تھا۔ [illegible] اور ڈرائیور مارے گئے۔ میرا نام پرتاب ٹھاکر ہے اور میں ہی اب اس ٹیکشن کا [illegible] شیرو نے اشونی کمار سے تو کوئی..... سنبھلنے سے پہلے ہی [illegible] حملہ آور؟ یہاں سے" اشونی کمار کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ [illegible] کا احساس ہو گیا تھا۔ [illegible] اپنی غلطی کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اشونی [illegible] شیرو کو بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اشونی [illegible] کی آنکھوں میں جھانکا جو اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ "یہ تمہارے [illegible] کا کام نہیں انسپکٹر۔ ہمارا ورد سر ہے کہ وہ کون تھے۔ میرے خیال میں شاید وہ حملہ [illegible] تھے۔" اپنی کہی ہوئی بات کا ردعمل تلاش کرنے کے لیے اس نے دوبارہ [illegible] کی آنکھوں میں جھانکا۔

انسپکٹر اشونی کمار نے حیرت سے کہا۔ "لیکن یہاں؟"

"اچھا انسپکٹر! جے ہند۔" شیرو نے مزید گفتگو سے بچنے کے لیے کہا۔ "مجھے اپنے جوانوں کے لیے لنگر کا انتظام بھی کرنا ہے۔" اور وہ آگے بڑھ گیا۔

"جے ہند!" انسپکٹر اشونی کمار کے منہ سے نکلا اور وہ بنگلے کی طرف جاتے شیرو کو دیکھنے لگا۔

☆○☆

رات ایک پہر بیت چکی تھی۔ ڈاک بنگلے کے بندوبست کیدار نے ان کے کمرے میں ایک

طرف لکڑیوں کا گٹھا کر رکھ دیا' پھر لکڑیاں آگ دان میں رکھ کر بھک سے سلگا کر
بجھانے جانے اس نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر پہلے ہاتھ ہلا کر پھر مشعل کی طرح
رات کاٹ کر بولا۔

"مہاراج جی! یہاں سب سے اچھی چیز کڑی ہے۔ اس موسم میں تو خاص طور پر
میرے لائق کوئی سیوا ہو تو ضرور بتلیئے۔ ادھر گوری کا سارا بندوبست موجود ہے
سے جو مسلمان چھوکریاں آئی ہیں نا ایک دم پٹاخہ ہیں صاحب ایک دم پٹاخہ۔ سونی
لاج میں رہتے ہیں وہ لوگ۔"

"بکو مت اور دفع ہو جاؤ۔" شیرو کا ساتھی ضبط نہ کر سکا۔

چوکیدار نے اس ڈانٹ کو صاحب لوگوں کا "نخرہ" جانا اور ہاتھ ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔
پچھلے پندرہ سال سے اس ڈاک بنگلے کی چوکیداری کے ساتھ ساتھ یہاں آنے والے "صاحب
لوگوں" کی اسی طرح خدمت انجام دے رہا تھا اور اب کافی حد تک ان صاحبوں کے مزاج
سے آشنا ہو چکا تھا۔

"صبح ہونے پر ہی حالات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے گا۔" شیرو نے چٹخی لکڑیوں پر ہاتھ
جماتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس کے بعد ہی کوئی منصوبہ بندی ہو گی۔ میرے خیال سے ہم لوگوں کو جلد از جلد
جموں کی طرف نکلنا چاہیے۔" اس کے سری نگر والے ساتھی نے جواب دیا۔

دونوں لیٹنے کے ارادے سے کمرے کی دیوار کے ساتھ زمین پر بچھے اپنے بستروں کی
طرف چل دیئے ـــــ باقی گارڈز دوسرے کمروں میں موجود تھے۔

"ـــــ کسی ممکنہ "شرارت" کو شیرو نے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ حوالدار غلام محمد کے
زیر کمان دس جوان اس ڈاک بنگلے کے گرد وا گرد باری باری پہرہ دے رہے تھے۔ اس نے
خود کو تو اشونی کمار کے سامنے ہندو ظاہر کر دیا تھا' لیکن اشونی کمار کو یہ علم تھا کہ باقی تمام اوم
گارڈز مسلمان ہیں۔ یہاں یہ تاثر عام پایا جاتا تھا کہ شیخ عبداللہ اپنی سیاسی طاقت بڑھانے کے
لیے اوم گارڈز میں مسلمانوں کی تعداد بڑھاتا چلا جا رہا ہے اور اس بے چارے کے "منصوبہ
امن" میں بھی متعصب ہندوؤں نے کیڑے نکالنا شروع کر دیئے تھے۔

ساری رات شیرو برف کے مرغزاروں میں زہراں کا تعاقب کرتا رہا۔ کبھی وہ یہاں سے
اور کبھی کی جمی ہوئی وادیوں سے' کبھی کسی شوریدہ سر ندی کی لہروں کے دوش پر اور
کبھی ـــــ نہ ختم ہونے پر پہنچ جاتا جہاں وہ ان لوگوں کو چھوڑ کر آیا تھا۔ ہر جگہ' ہر موڑ پر

ہوں گے اس نے اپنا بھرم رکھا۔
ہو اس بی اور سرور رات ا ساتھ ایک ہندو اور کہ سے لیے ان ، ہمارے کو اور جو
کر رہے تھے ان دونوں کو ہتھیار پولیس ہم سے ملاقات دا اور اپنے وہ
ہاتھ سے کیا تھا جس کے مسلمان مالک کو قتل کر سکے
ہندو جا رہا تھا۔

☆○☆

ابھی دونوں پہلے کی حدود ہی میں تھے کہ رات والا چوکیدار انہیں اپنی سمت آتا دکھائی
دیا۔ اس نے ایک فوجی کمبل اپنے جسم پر اچھی طرح لپیٹ کر خود کو سردی سے بچانے کا مناسب
بندوبست کر رکھا تھا۔ شیرو نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے ساتھی کو پرسکون رہنے کی
ہدایت کی۔

"بچے بند مہاراج جی!" اس نے سرکس کے بندروں کی طرح ہاتھ باندھ کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"کہیے ہو؟" شیرو نے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔

"کہا ہے بھگوان کی مہاراج جی۔ ایک خبر سنانے آیا ہوں۔ ابھی ابھی ایک آدمی پہنچا ہے
بھدر واہ سے۔ ارے میں بھی کیا بیوقوف ہوں' پہنچا تو وہ مہاراج جی رات کو تھا' مجھے ابھی دیا
ہے۔ ادھر جو کمپنی ہے نا ہوم گارڈز کی' اس نے اپنے پاٹھون کمانڈر کو مار ڈالا ہے۔" اس
نے بڑی مکاری سے آنکھ دبائی اور بولا۔ "بے چارہ ہندو تھا نا۔ یہ سالے مسلمان اعتبار کے
چل نہیں ہیں۔ ایسے واقعات تو ہوم گارڈز میں اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں ترہم خبریں پہنچی
جاتی ہیں۔ وہ تو بھگوان بھلا کرے سنگھ (جن سنگھ) والوں کا' جو کشتواڑ سے وہاں پہنچے اور
انہوں نے راتوں رات مسلمانوں کا وہ حشر کیا کہ بس سالوں کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہو گا۔
کچھ مال ادھر بھی پہنچا ہے مہاراج جی۔ ایک دم گرم مال ہے۔ کہیے تو آج ہی ـــــ" اس
نے دوبارہ اپنی ایک آنکھ دبائی۔ ادھر سونی لاج پر جو گارڈ انچارج ہے نا پولیس کا حوالدار
بھوپت رائے۔ پکا یار ہے اپنا۔ بس آپ کے اشارہ کرنے کی دیر ہے مہاراج۔"

"اچھا ـــــ اچھا اپنے کام سے کام رکھو۔ زیادہ باتیں نہ کیا کرو۔" شیرو نے وہاں سے
آگے بڑھ جانے کا ارادہ کیا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ساتھی کے صبر کا پیمانہ اب
چھلکنے کو ہے۔

ایک بات ہے سردار۔ ان مسلمانوں سے ارادہ شیاری سیکھنے کو ہم گھوڑا دوڑ
ے۔" اس نے جاتے جاتے فقرہ ان کی سمت اچھال دیا اور "سہ ہندو" کر کر آگے
"سوئی لان" کے قریب سے گزرتے ہوئے دونوں کے پیچھے قہقہے لگانے لگے
چلے جا رہے تھے۔ لیکن ابھی کچھ کہنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ شیرو کو کسی نہ کسی
طرح یاد تھا۔ "تمہارا ایک غلط قدم نہ صرف ان سب لوگوں کو مروا دے گا بلکہ تحریک
اپنے ابتدائی مراحل میں زبردست صدمے سے دوچار ہو جائے گی اور جانے ہم کب
برداشت کر سکیں گے یا نہیں۔"

دونوں سوئی لان کے قریب سے بظیر آواز پیدا کیے گزر گئے تھے اور ان کا رخ اب اس
ہوٹل کی طرف تھا جسے مقامی لوگ "ر۔خیونی ہوٹل" کہتے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے ہی
خبر ہوٹل میں پہنچ چکی تھی۔ جبھی تو وہ موٹا سا سکھ سردار جو سامنے کاؤنٹر کے ایک کونے میں
فوم کے ایک گدے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، انہیں دیکھتے ہی لپکا اور ان تک جا پہنچا۔

"ست سری اکال جی—— ست سری اکال! جی آیاں نوں! دھن بھاگ، دلھسنے تو
بھاگ جاگ اٹھے، کیڑی کے گھر نارائن آ گئے مہاراج۔"

"چائے کے ساتھ جو بھی تمہارے پاس تیار ہے لے آؤ۔" شیرو کے ساتھی نے اس کی
گرمجوشی کو اس سے بچنے کے لیے جلن چھڑائی۔

"لوئے جی۔" اس نے وہاں موجود ایک لڑکے کو آواز دی۔

"آیا باپو جی۔" کاؤنٹر کے پیچھے سے ایک سر نمودار ہوا۔

تھوڑی ہی دیر میں چائے اور پوریاں ان کی میز پر موجود تھیں۔ اس دوران موٹا سکھ
مسلسل ان کا دماغ چاٹتا رہا۔ "ادھر مظفر آباد میں اپنا ہوٹل تھا جی، لیکن ایسا نہیں۔ وہ گورو
جی کی کرپا سے اس سے تین گنا بڑا ہوٹل مل گیا۔ وہ مالکا تیری لیلا بھی نیاری ہے۔ سنتے ہیں
ڈوگرے۔" وہ اپنی ترنگ میں کہہ تو گیا لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ "کیا
کریں جی۔ وہ بھی مجبور ہیں بے چارے ادھر پٹھانوں نے بھی تو ان کے ساتھ برا کرنے میں
کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مہاراج جی! ایک رات میں سات ہزار ڈوگرے تو انہوں نے بارہ
مولہ سے لے کر بکتا رہا۔ دونوں کے کان تو اس کی گفتگو پر ہی لگے تھے، لیکن ذہن
کا ایک حصہ ہوٹل کے سردار کی گفتگو کا سلسلہ دو فوجیوں کی آمد پر ٹوٹا۔ دونوں ایک

ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ ساتھ والے سے مخاطب ہو کر ان میں سے ایک نے کہا۔

"یار بخت صبح ہی صبح کون مرے۔" سردار نہایت سے پیٹھ موڑ کر قہقہہ کی طرف
چلا۔ "واہے گورو—— واہے گورو۔ ست گرو نانک تیری لوٹ۔" اس نے جاپ شروع کر
دیا۔

"لوئے ہوئے کیا ہے تجھے ہاں؟" ان میں سے ایک لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

"وہی لاتا ہوں مہاراج جی۔" اس نے جان چھڑانی چاہی، لیکن وہ تو اس کی جان کو آ
گئے تھے۔

"لوئے ہوئے۔ وہ سالا باہنی لوگ کہہ رہا ہے—— باہنی لوگ، جن کے پاس ہر وقت
گرم مال ہوتا ہے۔ کشمیر کا باہنی لوگ تو ادھر مہاراشٹر میں بہت مشہور ہے، لیکن ادھر
تو——" مریشہ حوالدار کی آواز نشے سے لڑکھڑانے لگی تھی، پھر نجانے انہیں کیا ہوا۔ شیرو پر
نظر ڈالتے ہی وہ نارمل ہو گئے۔ شاید انہیں ہدایات ہی ایسی دی گئی تھیں۔ موٹا سردار
دوبارہ ان کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔

"لوئے—— کہاں مر گیا ہے لوئے تو——!" اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لڑکے کو تو ہاں
دی جس نے حسب سابق کاؤنٹر کے پیچھے سے سر نکال کر اس کی طرف دیکھا—— "منور!
گرم پوریاں نکال صاحب لوگوں کے لیے—— اور تازہ چنی کی چائے بنا کر لا۔"

"لایا سردار جی۔" لڑکا دوبارہ کاؤنٹر کے پیچھے غائب ہو گیا۔

"مہاراج جی! یہ جو سالا اشونی کمار ہے نا—— یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ بڑا بدمعاش
آدمی ہے۔ اس نے تو مسافروں کے ٹاک میں دم کر رکھا ہے اور ہوم گارڈز والوں کا تو دشمن
ہے دشمن---- اسے ہر مسلمان پر شک رہتا ہے کہ وہ ڈوگروں کے خلاف ہے۔ پہلے تو
ہمارے پیچھے بھی کافی دیر تک لگا رہا—— بڑی مشکل سے جان چھڑائی ہے ہم نے اپنی۔"

"اچھا سردار جی۔ ہم چلتے ہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ادھر ڈاک بنگلہ میں ہم لوگ
رہتے ہیں۔ کوئی بات ہو تو چلے آنا—— پرتاب نگر ہم ہے میرا اور جو تمہارا اشونی کمار
ہے نا---- اس سے تو میں نمٹ لوں گا۔" شیرو نے سردار کے "ہا ہا" کرنے کے باوجود
اسے بل لوا کیا اور دونوں باہر نکل آئے۔

ہوٹل کے باہر دھند اور سورج کی طویل لڑائی اپنے اختتام کو پہنچی تھی اور فضا میں
دھند غائب ہو گئی تھی۔ ان کے چاروں اطرف سبزے پر شبنم کے قطرے اب بھی بکھرے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

☆○☆

بھول کی مہلت مسلسل اور بھرپور تشدد سے اس قابل نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا بھی رہ سکے۔ یہ تو اس کی مضبوط قوت ارادی تھی جس نے کسی کمزوری کو اس کے نزدیک نہ پھٹکنے دیا اور کسی نہ کسی طرح دو چار روز ہی میں وہ اپنے پاؤں پر نہ صرف کھڑا رہنے بلکہ چلنے کے قابل بھی ہو گیا تھا۔

بجرنگ سنگھ کی موت کی خبر نے اسے خوشی کے بجائے مایوس کر دیا تھا۔ بھول نے حتی کمانی تھی کہ وہ خود موذی کو اپنے ہاتھوں اس کے بھیانک انجام تک پہنچائے گا اور وہ اب اپنی اس قسم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا' مگر دیکھتے ہی دیکھتے حالات نے اتنی تیزی سے پانا کھایا کہ بھول اور اس کے ساتھی سوائے بے بسی سے تماشا دیکھنے کے اور کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔

پونچھ کی جاگیر کا دارالحکومت بھی پونچھ شہر تھا جس کی ۳ لاکھ ۸۲ ہزار مسلم اور ۳۹ ہزار غیر مسلم آبادی زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہی تھی۔ اس شہر کی خصوصی جنگی اہمیت کے پیش نظر فوج کو سختی سے حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے مورچوں سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹے۔ کوہالہ اور آزاد پتن سے دشمن کو رگیدتے ہوئے مجاہدین نے اسے پونچھ میں محصور کر دیا تھا۔ دوسری طرف وہ لوگ سالم حویلی اور مینڈر کی تحصیلوں سے گزرتے راجوڑی تک آ گئے تھے۔ دشمن کے لیے پونچھ شہ رگ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ یہ شہ رگ کٹ جاتی لیکن انہوں کی سیاہ کاریاں رنگ لائیں اور ایک شاندار فتح کا موقع جان بوجھ کر ہاتھ سے نکل جانے دیا گیا۔

یہ کشمیر کی تاریخ حریت کا وہ اندوہناک باب ہے جس پر ماضی کی گرد کریدی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس میں چھپے المناک سوالوں کے جواب مورخ کو اس لیے بھی میسر نہ آ سکے کہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کامیرے پر موجود تیسری فوج اس تماشے سے محظوظ ہوتی رہی۔
جلدی پریکٹس کے شہر میں داخل ہوتے ہی وہاں کا نقشہ بدل گیا۔ ان لوگوں نے شہر کے
چاروں اطراف زبردست مورچہ بندیاں کر کے شہر کو اب باقاعدہ تیسرے قلعے میں تبدیل کر دیا
تھا۔

☆○☆

"حالات تمہارے سامنے ہیں دوستو۔" امیر خان نے اپنے سامنے موجود ساتھیوں کو مخاطب
کیا۔
"بی خان نے آخری ہدایت یہی بھیجی ہے کہ ہم اپنی صوابدید کے مطابق کوئی فیصلہ کر
لیں۔ ہمارے لیے سری نگر اور وہاں سے پھر جموں تک جانے کا بندوبست بھی ہو چکا ہے۔
اب میں دوستوں تم پر چھوڑتا ہوں۔"
"یہ آخری ضرب ضرور لگانی ہو گی امیر خان! سجاول کی کمی بات کے پیچھے کارفرما مسرت
کا امیر خان کو اندازہ تھا' پھر بھی اس نے ایک کمانڈر ہونے کی حیثیت سے اپنے باقی ساتھیوں
کی طرف استفساریہ نظروں سے دیکھا۔ وہاں موجود ہر شخص آتش فشاں پہاڑ کی طرح کسی
بھی لمحے پھٹ جانے کو تیار تھا۔ پھر ایسے "غنیمت" مواقع سے فائدہ نہ اٹھانا ان کے نزدیک
کفران نعمت کے مترادف تھا۔
تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ ایک "ہدف" منتخب کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اب وہ
اس پر آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ان کا انتخاب دریائے پونچھ کے کنارے دشمن کا ایک
کیمپ تھا جہاں گھوڑا بگڑوں سے وہ لوگ مجاہدین پر دن رات آگ برسایا کرتے تھے۔
زمین پر ایک نقشہ بچھا کر امیر خان نے ماہر جرنیلوں کی طرح اس پر لکیریں کھینچ کر ان
لوگوں کو اس مورچے کے گرد و گرد موجود رکاوٹوں اور مشکلات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مودہ
گوجر کو یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ کل رات کو اس علاقے میں "ریکی" کر کے دشمن کی
پوزیشنوں کا ایک مرتبہ پھر قریب سے جائزہ لے لے تاکہ وہاں عمل میں آئی کسی بھی ممکنہ
تبدیلی سے وہ لوگ آگاہ ہو سکیں اور ضرورت کے مطابق اپنے پلان میں تبدیلی کر سکیں۔
دوسرے ہی روز پھر رات گئے وہ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ مودہ گوجر کے سامنے وہی نقشہ
بچھا ہوا تھا اور وہ اندازے سے پہلی لکیروں سے کچھ مختلف لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اس کی
بتائی ہوئی لکیروں کا ایک مرکزی نقطہ بہرحال تھا۔
"جہاں سے وہ مورچہ عمل ان لوگوں نے "میڈیم گن" عمل ہی میں نصب کی ہے۔" اس

نے امیر خان کے کہنے پر ہاتھ روک کر ہوئے نقشے میں نشان
وضاحت کی۔ "مجھ اتری" والے یہاں تک کیسے آ رہا۔" امیر خان نے
واپس اوپر جانے کا نہیں آ رہا۔" امیر خان نے
"ایک چکر میں نے ایسی تلاش کر لی ہے امیر خان۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "جہاں سے ہم
دوربین کے ذریعے اس "گن" کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے ہم صبح اسے دیکھ لیں گے۔" امیر خان نے کہا۔ "تم لوگ واپس
واپس جاؤ؟" اس دن اس کے مخاطب وہ دو نوجوان تھے جو اس سے پہلے اس مہم میں اس کے
ساتھ حصہ لے چکے تھے۔
اپنی تنظیم کے اصول کے مطابق اس نے ابھی تک ان دونوں سے ان کے خاندان کی
تیسری ملاقات تھی۔ امیر خان شاید یہ بات روایت نہ کرتا لیکن ان دونوں کی عمروں نے اس کو
تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے ہم کار کے متعلق ہمیشہ متجسس رہتا تھا۔
"میں پلندری سے آیا ہوں۔ یہ یہاں کا پتہ ہے۔" ان میں سے ایک نے مختصر سا
جواب دیا۔
امیر خان کو اس کے جواب نے احساس دلایا کہ اس کو ان نوجوانوں سے یہ سوال نہیں کرنا
چاہیے تھا۔ "اصل میں' میں یہ چاہتا تھا کہ تم میں سے ایک ہمارے رابطہ میں رہے اور ان
حالات کی واقفیت رکھتا ہو۔ یہاں ہمارے اس مختصر لشکر کی حفاظت کے لیے بھی کسی نہ
کسی کا رہنا تو ضروری ہے' پھر ہم میں سے کوئی ایک تو بچ جائے جو ہمارے آپریشن کی خبر بی
خان کو پہنچا سکے۔" اس نے نوواردوں کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا۔
وہ رات انہوں نے اکٹھے ہی باری باری پہرہ بدل کر اپنے لشکر پر گزاری۔ صبح
جب شہر کے کسی کونے سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو سجاول' امیر خان اور مودہ گوجر دونوں
ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ طاقت ور شیشوں کی ایک دوربین
امیر خان نے اپنے گلے میں لٹکا کر اس پر کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے دونوں ساتھیوں کی
آستین گنیں بھی اسی طرح ان کے جسموں سے چپکی ہوئی تھیں۔
ان کے مطلوبہ مقام تک پہنچنے تک جہاں سے انہوں نے "ٹارگٹ" کا نظارہ کرنا تھا' سورج
نہیں نکلا تھا' لیکن پرندوں کی ملی جلی آوازیں اگاہی کا تاثر دوں کی آوازوں کے درمیان اپنا راگ
الاپ رہی تھیں۔ تینوں بخ بستہ پتھروں پر چلتے اس جگہ پر پہنچے تھے۔ پہاڑوں کی سرخ سنہری
چوٹیاں نیلے آسمان پر پھیلتی ایک پراسرار سی سرد روشنی میں لب ان کے سامنے نمایاں ہو رہی

تھیں۔

پچاس دم سادھے ایک ٹوٹیلی چٹان سے چپکے بیٹھے تھے۔ ان سے محض چند گز کے فاصلے پر ۔۔۔ تک فوجی مورچوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ صرف وہی راستہ محفوظ تھا جس پر وہ رات کو برف کی سردی میں سفر کرتے ہوئے آئے تھے۔ اسے گزرگاہ کا نام دینا تو غلط تھا۔ وہ تو پتھروں اور اونچے نیچے ٹیلوں میں بکھر کر لگتے یہاں تک پہنچے تھے۔ سردی اور ماحول کی پراسراریت کے سے بیٹھے احساس نے انہیں دم سادھ کر چپ بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دم توڑتے اندھیرے میں سہاول نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جہاں تک نظر جا سکتا تھا، کو دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے دشمن کے مورچوں کے لیے کون دور میں ایسی جگہ ڈھونڈی تھی جہاں کسی بھی "سرچنگ لائٹ" کا وہاں جا سکتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی پہلی کرن چنگی اور خوشبو کی طرح ان کے احساس کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ وادی جنت نظیر نے گھور اندھیروں کا سیاہ غلاف اتار پھینکا تھا۔ یہاں دشمن کے بیچوں بیچ بیٹھے ان تینوں سرفروشوں نے جیسے اپنی زندگیوں پر پڑے خول کو بھی اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ ان سبھوں نے نئی زندگی کی نئی صبح کو سرد ہوا کے لمس اور دہکتے سورج کی لو رنگ کرنوں کے بوسے کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ ان کے چاروں طرف پھیلی چوٹیوں پر دھوپ نے نوزائیدہ بچوں کی طرح لرز لرز کر سانس لینا شروع کر دیا تھا۔ پہلی کرنوں نے سرکش مجاہدین کے عزم و استقلال کو ہدیہ تہنیت پیش کرنے کے لیے پہاڑوں کی پیشانیوں کو چومنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے سلسلہ ہائے کوہ پر پھیلی کرنوں کے سرد شعلے بھڑک کر اب لطیف ہوا کے برفیلے جھونکوں میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے تھے۔

سامنے کا منظر نمایاں ہونے لگا تھا۔ ان کے سامنے والی پہاڑی سڑک پر ایک جیپ نمودار ہوئی۔ یہ سڑک تنگ درے کے بیچوں بیچ لہراتی بل کھاتی ہوئی چلتی تھی۔ جیپ کبھی اونچی چوٹی پر چڑھتی اور کبھی ڈھلوانوں سے لڑھکتی نظر آ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ چوٹیاں کشمیر کے بلند و بالا سپوتوں کی عظمت کی طرح بلند سے بلند تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ پہاڑی سڑک کا کھنڈ والا استرے کی دھار کی طرح تیز اور باریک کنارہ انہیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جیپ ایک خطرناک موڑ پر ان کی نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو کر پہاڑی کے پیٹ میں کہیں اتر گئی۔

امیر خان نے اپنی گود میں رکھی دوربین کے شیشوں کو اپنی چادر کے ایک کونے سے صاف کیا اور دوربین آنکھوں پر جما لی۔ اس کی آنکھوں کے عین سامنے پستہ قد کی ایک

پہاڑی [illegible] کے محض [illegible] میں [illegible] اس اختیار کر چکی تھی۔ وہ پہاڑی [illegible] سے [illegible] بھاگی جا رہی تھی۔

امیر خان نے دوربین کا فوکس [illegible] اسے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح واضح اور الگ الگ دیکھ سکتا تھا۔ ایک ایک [illegible] ایک ایک زاویہ، ایک ایک اصطکاک، چٹانوں کی ایک ایک [illegible] کرد پھیلی گھنی جھاڑیوں کا ایک ایک پتہ اس کے [illegible] تھے۔

جھاڑیوں کا یہ سلسلہ پہاڑی کے وسط سے شروع ہو کر [illegible] ختم ہو گیا تھا۔ چوٹی سے ذرا نیچے بکھرے پتھروں کی [illegible] خان کی نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ سیاہ لوکیلی چٹانوں کے [illegible] اور کانٹے دار جھاڑیوں سے پھسلتی، اٹکتی، ڈگمگاتی اس کی نظروں کو [illegible] سے میڈیم گن کی باہر کو جھانکتی نال اور اس کے ساتھ ساتھ [illegible] دھار میں جکڑ لیا۔

"یہ لوگ یہاں تک پہنچے کیسے اور راشن اور ایمونیشن یہاں تک کیسے پہنچاتے ہیں؟" اس نے دوربین آنکھوں سے الگ کر کے ممدو گوجر سے پوچھا۔

"امیر خان ——!" ممدو گوجر نے اس کی طرف دیکھے بغیر سامنے پہاڑی پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "دوربین کو شمال اور مشرق کے مرکز میں رکھ کر دیکھو۔"

سورج اب پہاڑی چوٹی کے سر پر چمکنے لگا تھا۔ امیر خان نے قدرے [illegible] کر دوربین کو سیٹ کیا تو اس کی نظریں تیز کرنوں میں ننگی ہوتی ہوئی اس سبزی مائل چٹان سے ٹکرائیں جس کی بغل میں ایک پتلی سی لکیر پھوٹتی نظر آ رہی تھی۔ سورج کی روشنی میں پتھروں کی سیب اور سیاہ عریانی اسے مسکرا مسکرا کر ان کے ارادوں کا مذاق اڑاتی نظر آئی۔ اس چوٹی پر کسی دشمن کو تباہ کرنا فوجی لحاظ سے قطعی ناممکن تھا۔

امیر خان کو الجھن سی ہونے لگی، پھر یہ الجھن غصے میں بدل گئی۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے ایسا سوچا ہی کیوں؟ "میں تمہارا زعم خاک میں ملا دوں گا۔ کل صبح جب سورج تمہارے سروں پر خدا کا عذاب بن کر طلوع ہو گا تو یہ سامنے کا منظر بدل چکا ہو گا۔ تب اس محفوظ بنکر کے پرخچے اس میں موجود "میم راجوں" اور ان کے آتشیں ہتھیاروں سمیت اڑ چکے ہوں گے۔" اس نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔

دونوں ساتھیوں نے چونک کر امیر خان کی طرف دیکھا۔ دوربین اس کی آنکھوں سے
ایک دو پتی تھی اور اس کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو انگارے دہکتے ہوئے نظر آ رہے
تھے۔

یہ خیال انتہا لذت انگیز تھا کہ امیر خان کو اپنی رگ رگ میں طمانیت کا ایک سمندر
ہلکورے لیتا محسوس ہوا۔ اس پر نشے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

☆○☆

رات اپنی مسافت بڑی تیزی سے طے کرتی دن کے تعاقب میں لپک رہی تھی۔ طارق ایک پتھر پر پاؤں رکھے پاؤں کی پنڈلی پر دھرے ہاتھ کی ہتھیلی میں اپنی ٹھوڑی ٹکائے سوچ میں غرق تھا۔ اس کے گرداگرد اوڑی کے اطراف میں پھیلے پہاڑوں کے درمیان وادی ایک پیالے کے پیندے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے ۷۵ میل لمبی اس سڑک کو خالی چھوڑ دیا تو دشمن یلغار کرتا ہوا کسی بھی لمحے پاکستان کی سرحدوں تک پہنچ جائے گا۔ اگر اسے صاف راستہ مل گیا تو وہ محض تین گھنٹے میں مظفر آباد پر قابض ہو جائے گا۔

پٹھان یہاں سے فرار ہو کر اس کے لیے ایسا خلاء پیدا کر گئے تھے جس کو پر کرنا بظاہر ناممکن نظر آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے بڑے "حساس مقام" سے پسپائی اختیار کی تھی۔ ممکن ہے اگر وہ کشمیر کے کسی اور علاقہ کو خالی کر جاتے تو اس کے نتائج اتنے ہولناک نہ ہوتے، لیکن یہ سڑک جو کشمیر کے سب سے زیادہ وسیع و عریض خطے میں سے گزرتی تھی، بڑی نازک اہمیت اختیار کر گئی تھی۔

جنرل طارق سوچ رہا تھا کہ اگر بھارتیوں نے علی الصبح ایڈوانس نہ کیا تو بھی ان کی نگرانی کرنے والے جہاز دن کا اجالا پھیلتے ہی یہاں آئیں گے اور دشمن کو "خالی علاقے" کی خوشخبری سنا کر اس کے ایڈوانس کی رفتہ ہموار کر دیں گے۔ اگر خدانخواستہ دشمن اس سڑک پر قابض ہو جاتا تو سارے کشمیر میں پھیلی تحریک آزادی اپنی موت آپ مر جاتی کیونکہ اس سے ملنے والوں کا سارا رابطہ بند ہو کر رہ جاتا۔ یہ بڑی بھیانک صورت حال تھی۔

پاکستان سے رضاکاروں کے یہاں پہنچنے میں چند دن تو ضرور درکار تھے جب کہ صرف چند گھنٹے کا فیصلہ باقی تھا۔ اس علاقہ کو خالی چھوڑنا کشمیر اور پاکستان کی قسمت سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ اچانک اس نے ایک سائے کو اپنی طرف آتے دیکھ کر جنرل چونکا۔ قریب آنے پر جب اس سے خدوخال واضح ہوئے تو اسے اپنا اردلی نظر آیا۔ وہ اسٹیشن ویگن کو روانگی کی حالت میں

[illegible] کر کے اپنے جنرل کے پاس آیا تھا۔ جنرل کو سلیوٹ مار کر وہ پرے سے لمبے [illegible]
[illegible] کے اگلے حکم کا منتظر رہ گیا۔
[illegible] جنرل کے منہ سے یہ سنا تھا۔ تم یہاں سے پیچھے چلے جاؤ۔
[illegible] نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ "نہیں سر" اردلی نے گردن کو خم دیا اور وہ جس سمت سے آیا تھا اس سمت میں
[illegible] کی چادر میں غائب ہو گیا۔

جنرل سوچ رہا تھا کہ دشمن کو اس بات کا احساس دلانا ضروری ہے کہ قافلہ یہاں رکا
[illegible] نہیں گئے ہیں اور وہ اوڑی میں اس کی گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ اس مقصد کی خاطر
[illegible] کے لیے لازم تھا کہ تخریبی کارروائیاں کی جائیں۔ جنرل نے فیصلہ کیا کہ وہ سب سے پہلے
[illegible] دشمن کے راستے میں آنے والے کچھ پلوں کو بیچ کر دے گا اور اپنی اس جنگی تربیت
[illegible] کے ساتھ اس انداز سے پہاڑوں میں پھیل کر "سنائپنگ" کرنے گا کہ دشمن کے ایڈوانس
[illegible] کرنے کے نام پر اکا دکا گولیاں اسے سنبھلنے اور باآسانی آگے بڑھنے سے باز رکھیں۔

جنرل طارق نے اپنی فوج کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصے کو چند میل نیچے "ہیں"
[illegible] کے لیے بھیج دیا اور چار آدمیوں کے ساتھ وہاں مورچہ بند ہو کر دشمن کا منتظر رہا۔

ساری رات ان لوگوں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح کے آثار اب واضح
ہونے لگے تھے۔ سامنے سے دشمن تو نظر نہ آیا البتہ مغرب سے روشنی کی دو لکیریں جنرل
طارق کو اپنی سمت لپکتی نظر آئیں۔

[illegible] دشمن نے راستہ کاٹ کر انہیں گھیرے میں لے لیا ہے کیونکہ پچھلے چوکنوں سے
میدان اس کے لیے خالی تھا اور اس کی کوئی نقل و حرکت سامنے سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔
یہ تھا پہلا خیال جو جنرل طارق اور اس کے ہمراہیوں کے ذہن میں کلبلایا۔

جنرل نے اپنے ساتھیوں کو فوراً پوزیشن لینے کا حکم دیا اور خود جیپ کی طرف بڑھنے لگا
جو تیز رفتاری سے اس کی طرف بھاگی چلی آ رہی تھی۔

صبح کاذب کے اجالے میں جیپ اب صاف دکھائی دینے لگی تھی۔ یہ پاکستان کی
باقاعدہ آرمی کی جیپ تھی۔ جیپ جنرل طارق سے چند گز کے فاصلے پر آ کر رکی اور اس کے
بعد دیگرے چار گبھرو پٹھان اس میں سے چھلانگیں لگا کر باہر نکل آئے۔ وہ شاید جنرل طارق
کو پہچانتے تھے کیونکہ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی ان کی ایڑیاں بجیں اور ان کے ہاتھ ان کی
پیشانیوں کو چھونے لگے۔

"ہاں ہاں تم لوگ؟" جنرل طارق نے انہیں جانتے ہوئے بھی سوال کیا۔

"سر ہم اپنی یونٹ سے ——" ان میں سے ایک جو شاید ان کا کمانڈر تھا بولتے بولتے رک گیا۔

"بھاگ کر آئے ہو؟" اس کی بات میں ہی بات جنرل نے پوری کر دی۔

"یس سر۔" اس نے جواب دیا۔ باقی تینوں کے سر بھی اس کے ساتھ ہی جھک گئے۔

"کیوں؟" جنرل نے ان پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"ہم جہاد میں حصہ لینا چاہتے تھے۔"

"شہادت؟" جنرل کے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ سے ان کے کھنچے اعصاب کو سکون ملنے لگا۔

"ہم نے یہ فیصلہ بالکل اچانک کیا تھا سر۔ یہ ایم سی کا جوان ہے۔" اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "جیپ لے کر کہیں جا رہا تھا۔ ہم نے نیکی غنیمت جانی اور اس طرف بھاگ آئے۔ الحمدللہ ہم یونٹ سے اسلحہ نہ چرا سکے ——!"

ان چاروں کے چہروں سے ٹپکتے جوش اور عزم نے جنرل طارق کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ خدا کو اس کے حال پر رحم آ گیا ہے اور یہ چاروں جوان اس کے لیے تائید غیبی بن کر آئے ہیں۔ انہیں راستے میں بھگوڑے فوجیوں کی قافلے بھی ملے تھے جنہوں نے انہیں بددل کر کے یہاں سے بھاگ جانے کو کہا تھا اور یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ محاذ پر اب کوئی رہا ہی نہیں' اگر کوئی بچا بھی ہے تو وہ کوئی پاگل ہو گا کیونکہ ان حالات میں وہاں کوئی عام انسان قیام نہیں کر سکتا۔

ان بے چاروں کو کسی نے اپنی رائفل بھی مستعار نہیں دی تھی۔ یہ چاروں جوان اپنا مستقبل اور نوکری داؤ پر لگا کر ایک عظیم مقصد کے لیے یہاں آئے تھے۔ ان کی آمد گو کہ جنرل طارق کے لیے غنیمت تھی' لیکن اس نے ان کے عظیم جذبے کو "ایکسپلائٹ" کرنے کے بجائے انہیں حقیقت حال سے باخبر کرنا ضروری جانا۔

"محاذ کی صورت حال تمہارے سامنے ہے بہادرو۔ ہمارے ساتھی منہ موڑ کر چلے گئے ہیں۔ ہم فوجی لقمہ سے بنتے ہیں۔ ان رائفلوں اور برین گنوں کی حیثیت دشمن کے نزدیک کچھ بھی نہیں۔ پاکستانی افواج اور برسراقتدار طبقہ ہماری مدد کرنے کے بجائے ہمارے حوصلے پست کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ہم چومکھی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ دشمن اور اپنوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف ہمیں بیک وقت لڑنا پڑ رہا ہے۔ ان حالات میں کوئی بھی جذباتی فیصلہ تمہیں

...سے کہیں بچانے کے لیے میرا حکم ہے کہ کوئی اقدام نہیں۔ میں بھی اس جنگ میں ...ہی ہوں۔ تم اگر چاہو تو اب بھی واپس جا سکتے ہو۔" جنرل ...ہی کی تشویش سے ایک کی آواز جوش جذبات سے لرزنے لگی۔ "ہم مسلمان فوج کے ...ہی ہیں۔ ہم قرآن کی سرزمین کے رکھوالے ہیں۔ ہمارے بھائیوں پر کافر ظلم توڑ رہے ...ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کو نیلام کیا جا رہا ہے اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے ...دیکھتے رہیں —— لعنت ہے ہماری زندگیوں پر۔"

...ان کا عزم دیدنی تھا —— "ہم آپ کے ساتھ ہی جئیں گے اور مریں گے۔" ان کے ...کمانڈر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

☆○☆

رات برق رفتاری سے اپنی دکان بڑھا رہی تھی۔ سورج نکلنے میں بمشکل ایک آدھ گھنٹہ ...باقی رہ گیا تھا۔ دن چڑھتے ہی دشمن کی زمینی اور فضائی افواج کی سرگرمیاں شروع ہونے والی ...تھیں۔ جنرل نے ان چاروں کے جذبہ جہاد کو خراج تحسین پیش کیا اور انہیں رائفلیں اور ایک ...مشین گن دے کر اس ہدایت کے ساتھ آگے بھیج دیا کہ وہ دشمن کے ایڈوانس کرتے ...ہراول دستے پر فائر کر کے اس کا راستہ روکے رکھیں۔

جوں ہی یہ چار سرکٹ جانباز اپنے ٹھکانے پر پہنچے' دشمن کی توپوں کے دہانے بھی کھل گئے۔ دشمن کی میڈیم بیٹریاں بے تحاشا گولہ باری کر رہی تھیں۔ وہ لوگ بغیر کسی نشانے کے ...اندھا دھند بم برسا رہے تھے' لیکن یہ گولہ باری بالکل بے سود تھی کیونکہ جو تمپس نظری ...یہاں تھی وہ ان کی تباہ کاریوں سے مامون و محفوظ تھی۔

ایک گھنٹہ تک اوڑی کی پہاڑیوں میں بھارتی گولہ باری نے زلزلہ بپا کیے رکھا۔ وہ لوگ صرف دور مار گولہ باری پر ہی اکتفا کر رہے تھے اور پیش قدمی کے سلسلے میں خاصے محتاط دکھائی دے رہے تھے۔ یہ چاروں جوان اگر دشمن پر چار راؤنڈ فائر کرتے تھے تو اس کے جواب میں وہ چار ہزار راؤنڈ فائر کرتا تھا۔ یہ سودا جنرل کے لیے بڑا سستا تھا۔

وہ وقت حاصل کرنا چاہتا تھا اور دشمن کو دھوکے میں رکھ کر وقت حاصل کرتا رہا۔ اس دوران دن کا بھرپور اجالا پھیلنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن کی فضائیہ بھی حرکت میں آ گئی۔ ان کے درجنوں طیارے آسمان پر نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی زمینی افواج کی تائید میں بم گرانے اور مشین گنیں فائر کرنا شروع کر دیں۔ جہاں وہ فائر کر رہے تھے' وہاں سے

بھائیوں اور قبائلیوں کے خلاف کردہ مورچوں کے اور بڑھ گئے تھے۔
جنرل اور اس کے دوسرے ساتھی اس قیامت خیز گولہ باری سے پاگل سے ہو گئے تھے۔
کے نزدیک ایک پل اکٹھا ہونے میں مصروف رہتے۔ انہیں ان کے پیچھے ہٹنے کا راستہ
نمیالی نصیب ہوئی اور پل ناکارہ ہو کر ناقابل استعمال بن گیا۔
جنرل طارق نے اپنے ساتھیوں کو اس جگہ کردہ پل کے کنارے پر اس طرح پوزیشن دی
ای کہ وہ لوگ زمین اور فضا سے کی جانے والی گولہ باری سے مکمل محفوظ تھے۔ البتہ دشمن
ان کے نشانے کی زد پر تھے۔ جنرل اور اس کے ساتھیوں کی مراد بر آئی۔ جب ان کی نظر دشمن
کے ایک سیکشن پر پڑی جس کے سپاہی اندھا دھند گولہ باری کی آڑ میں ایڈوانس کرتے اس
طرف بڑھ رہے تھے۔
پل شدہ پل کے نزدیک وہ رک گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ محفوظ آڑ میں جائیں، ان پر
گولیوں کا مینہ برسنے لگا اور اس ہراول سیکشن کا بمشکل ہی کوئی جوان زندہ بچ نکلنے میں
کامیاب ہو سکا۔
دشمن نے اندھا دھند جوابی گولیوں اور گولوں کا مینہ برسایا، لیکن اس نے آگے بڑھنے کی
ہمت نہ کی۔ دراصل قبائلی پٹھانوں کا طریقہ جنگ ایسا خطرناک اور جلا کن تھا کہ دشمن کا
دشمن اب چھاپہ کو بھی پھونک پھونک کر پی رہا تھا۔ بھارتی فوج کا ہر سپاہی جانتا تھا کہ اگر وہ
قبائلی پٹھانوں کے گھیرے میں آ گیا تو ایک اذیت ناک موت اس کا مقدر بن کر رہ جائے گی۔
قبائلی یہاں موجود نہیں تھے، لیکن ان کی پھیلائی دہشت زدہ اور ناک بھوتوں کی شکل میں بھارتی
اور ناگرہ فوجیوں کے دل و دماغ پر مسلط تھی۔
شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ سورج کی سرد اور کپکپاتی روشنیوں کا سفر اپنے
اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ساتھ بھارتی توپوں کی گولہ باری بھی سرد پڑنے
لگی اور رات ہوتے ہی انہوں نے فائرنگ مکمل بند کر دی۔ تاریک رات کا ہولناک سناٹا
ہر سُو چھانے لگا۔ یہ لمحات جنرل طارق اور اس کے ساتھیوں کے لیے غنیمت تھے۔ وہ لوگ
پچھلے اڑتالیس گھنٹے سے مسلسل بیدار تھے۔ سکون کے کچھ لمحات ان لوگوں نے آپس میں
بانٹ کر گزارے اور صبح کا دھندلکا نکھرنے سے پہلے دوبارہ سرگرم عمل ہو گئے۔
انہوں نے دشمن کے ہراول پر اپنی نظریں رکھی ہوئی تھیں۔ برق رفتاری سے یہ لوگ
کبھی کوہ پوش پہاڑیوں پر بھاگتے دوڑتے رہے۔ کبھی وہ ایک پہاڑی سے چند راؤنڈز فائر کرتے،
کبھی دوسری سے۔ اس دوران ان کی کوشش یہی رہی کہ دشمن کو دائیں بائیں بکھر کر

[illegible] کرنے دیں۔ انہیں اس کوشش میں ناظر اور ہوائی جہازوں سے مدد ملتی رہی۔
[illegible] اس سڑک پر مست گرد و گیا۔
[illegible] جنرل طارق کے ساتھی پیچھے ہٹتے ہوئے سڑک پر آنے والے ہر شخص، ہر گاڑی اور
[illegible] کرتے جا رہے تھے اور ایڈوانس کرنے کے لیے ضروری تھا کہ بھارتی فوج کی نقل و حرکت
[illegible] ہچکچاہٹ بھی جاری رہی۔ اس دوران جنرل طارق اور اس کے
ساتھیوں نے دشمن کو سست رفتار اپنانے پر مجبور کر دیا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے وہ اپنے محفوظ ٹھکانے سے
پندرہ میل پیچھے چکوٹھی کے مقام پر ایک مضبوط مورچہ بنا کر
بندیاں کر رہے تھے۔ ابھی تک پاکستان سے کوئی مدد نہیں آئی تھی۔

☆○☆

شیرو نے حوالدار غلام محمد کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ اپنے ایک ساتھی کے
ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔
"مجھے علم ہے چاچا——!" اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں
پھنسائیں۔ "لیکن کوئی بھی جذباتی قدم ہمیں لے ڈوبے گا۔ آپ لوگ میری بات سمجھنے کی
کوشش کیجیے۔ شہر میں تین ہزار فوج موجود ہے۔ اردگرد کے مسلمان اگر تو زندہ نہیں
بچے، اگر کوئی بدقسمتی سے بچ بھی گیا ہے تو وہ اتنا خوف زدہ ہے کہ اپنی جان بچانے کے سوا
اسے کسی اور بات کا ہوش نہیں۔ ہم جموں اور سری نگر کے درمیان بھارتی فوج کے سیلاب
میں پھنسے ہیں۔ بوم گارڈز کو پہلے ہی لوگ شیخ عبداللہ کی فوج سمجھتے ہیں اور مقامی
ہندوؤں کو علم ہے کہ ہم مسلمان بھلے لاکھ نیشنلسٹ ہونے کی دہائی دیتے رہیں، وہ ہم پر کبھی
اعتبار نہیں کریں گے۔ "سونی لاج" کی ساری کہانی میرے علم میں آ چکی ہے۔ بخدا مجھ میں
غیرت ابھی زندہ ہے۔ آپ لوگ ذرا صبر کریں۔ ابھی ہم صرف "انتظار کرو اور دیکھو" کی
پالیسی پر عمل کریں گے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"
"لو میرے خدایا! اس بے غیرتی سے تو موت ہی آ جاتی۔" حوالدار غلام محمد نے تو
بھڑی۔
"ہوش میں نہیں خان نے اس طرف نہ بھٹکا ہوتا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے یہ ظلم ہو
رہا ہے اور ہم——" ان کا تیسرا ساتھی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو رہا۔
"خدا کے لیے—— آپ لوگ ایسی باتیں نہ کیجیے۔ ابھی وقت نہیں۔ ابھی——"

اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

"بہرحال حتمی فیصلہ تو تمہی کو کرنا ہے' لیکن میرا فرض تھا کہ تمہیں اپنے تجربات سے آگاہ کر دوں۔ یہ لوگ مجھ سے تمہارے ساتھ ہی آئے ہیں اور تم انہیں مجھ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہو ——— میں اور وہ انہیں محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور تم انہیں ہر خیال رکھنا کہ یہ لوگ زیادہ دیر تک چپ رہنے والے نہیں ہیں۔" حوالدار غلام محمد نے اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔

"میں بھی ان ہی میں سے ہوں چاچا غلام محمد اور میری رگوں میں بھی سرحدوں کا باغیرت خون دوڑ رہا ہے۔ جب بھی وقت آیا' بخدا تم مجھے سب سے آگے پاؤ گے۔" اس مرتبہ فرط جوش و جذبات سے شیرو کی آواز کانپنے لگی تھی۔

☆○☆

اشونی کمار نے اپنی آنکھیں بدستور چوکیدار پر جما رکھی تھیں۔ "جانتے ہو تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے بڑے سرد اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"دھرتی ماں کی قسم مالک!" چوکیدار نے دونوں ہاتھ باندھ دیئے ——— "وہ ہندو نہیں۔"

"لیکن تمہیں بتایا کس نے؟" اشونی کمار نے پولیس والے مخصوص لہجے میں اس سے پوچھا۔

"مائی باپ! مجھے تک تو اسی روز شک ہو گیا تھا جس روز میں نے اس سے چھوکریوں کی بات کی تھی۔ پچھلے پندرہ بیس سال سے اسی ڈاک بنگلے پر صاحب لوگوں کی سیوا کرتا رہا ہوں مالک۔" اس نے چاپلوسی اختیار کی۔

"آپے بکو۔" اشونی کمار چلایا۔

"میں نے خود نگرانی شروع کر دی تھی اس کی۔" چوکیدار سہم کر بولا۔ "اسے میں نے نماز پڑھتے دیکھا تھا' پھر حوالدار جانکی داس کو میں نے اس کے پیچھے لگا دیا۔"

"ہوں....." اشونی کمار نے بڑے لمبی "ہوں" کہہ کر دوبارہ اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ میں پکڑی بید کی چھڑی کو بار بار دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ چوکیدار کمرے کے ایک کونے میں سکڑا سمٹا کھڑا تھا۔

معاملات اس کی توقع کے بالکل برعکس پیش آ رہے تھے۔ اسے تو یہی امید تھی کہ جب یہ انکشاف اس کے سامنے یہ انکشاف کرے گا کہ پرتاب ٹھاکر ہندو نہیں' مسلمان ہے تو وہ

اپنی سیٹ سے اچھل پڑے گا اور اسے شیر ببر کی طرح انتقام سے للکارے گا۔ خوشی کا اظہار کرے گا۔ لیکن اشونی کمار نے اسے الٹے سیدھے سوالات کر کے پریشان کر دیا۔

چوکیدار نے بھاگ دوڑ کر ایک فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچ کر رک گیا۔ کمرے میں رکھی میز کے ایک کونے پر ٹک کر اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے پہلے کے چوکیدار کو مخاطب کیا۔ "دیکھو!" اس نے بڑی بارعب آواز میں کہا۔ "تم یہ بھول جاؤ کہ پرتاب ٹھاکر مسلمان ہے یا تم نے اسے وضو بناتے دیکھا ہے۔ اس بات کا کسی سے بھول کر بھی ذکر نہ کرنا۔ کسی کو یہ بھی نہیں پتہ کہ تم میرے پاس آئے ہو ——— اور ہاں تمہاری یہاں آمد کا تو کسی کو علم نہیں ہوا؟"

چوکیدار صرف بھوپت رائے کو پتہ ہے کہ میں آپ کی سیوا کیا کرتا ہوں۔ وہی مجھے ہر مہینہ کی اطلاع دیا کرتا ہے نا ——— اس سے بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔" چوکیدار نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"ٹھیک ہے اس سے یہی کہنا کہ تم میرے پاس "تازہ مل" کی خبر کرنے آئے ہو۔ اب جاؤ۔" اس نے اپنی جیب سے ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"دھن دلو مہاراج جی۔" چوکیدار کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بڑی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اچانک اشونی کمار کی گونج دار آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔

"ادھر نہیں۔" اس نے مخالف سمت والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "ادھر سے۔" چوکیدار جانتا تھا کہ جس دروازے کی طرف وہ اشارہ کر رہا ہے' اس کے باہر دور دور کسی جاندار شے کا وجود ہی نہیں ہے۔

انسپکٹر اشونی کمار کو بنوٹ کے مقامی بادشاہ کی حیثیت ہوم گارڈز کے آنے سے پہلے حاصل تھی۔ مقامی ہندو لٹیرے اس کی سربراہی میں بنوٹ اور اس کے گردوا گرد سارے علاقے میں لوٹ مار مچا رہے تھے۔ اس کا حصہ ہر دوسرے تیسرے دن نقدی' سونے اور کبھی کبھی لڑکیوں کی شکل میں اس تک پہنچ جاتا تھا۔ ہوم گارڈز کی اچانک آمد سے اس کا سارا طمطراق ختم تو نہیں ہوا تھا' لیکن اس میں وہ پہلے کی سی تیزی باقی نہیں رہی تھی۔

جن جن علاقوں میں ہوم گارڈز آئے تھے' وہاں خوفزدہ اور بچے کھچے مسلمانوں نے اب واپس آنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات انسپکٹر اشونی کمار کے لیے خاصی تکلیف دہ تھی کہ اب مسلمان اکا دکا مقامات پر مدافعت بھی کرنے لگے تھے۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ جیسے بھی ہو ہوم گارڈز یہاں سے چلے جائیں۔ فوج کی طرف سے مایوس ہو کر اب اس نے خود کوئی

خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے سامنے مسلمانوں کی بہت سی مثالیں موجود تھیں۔ "غیرت" کی شکل میں موجود تھی۔ اس کے اجداد نے اسے نسل در نسل ایک قوت تھا کہ یہاں پہلا مسلمان سندھ کے راستے محمد بن قاسم کی شکل میں داخل ہوا تھا۔ یہی کی بنیاد پر چلا آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اور اس کے اجداد اپنی متعدد بار کی شکست مسلمانوں کو بے غیرت بنانے لگے تھے۔

"برلو راست ان لوگوں کی غیرت پر ہاتھ ڈالا جائے۔" اس نے سوچا۔ اور اب اشوانی کمار یہی خطرناک عزائم لے کر "سونی لاج" کی طرف جا رہا تھا۔ سائے لمبے ہو رہے تھے اور وہ اپنے عملے کے سارے کے سارے ٹیکس پہنچیں سکے کے ساتھ اس طرف رواں دواں تھا۔

☆○☆

ڈاک بنگلے کی سمت آنے والی سڑک کے ایک کنارے پر درختوں کے جھنڈ میں گھات کرتے سپاہی اللہ داد نے جب پولیس کی اس بھیڑ کو اس طرف آتے دیکھا تو اس کا ہاتھ کی پیش آمدہ خطرے کے احساس سے ٹھنڈا اندھیرے کی برساتی چادر نے آہستہ آہستہ بڑھ کر دم توڑتے اجالوں کو ڈسنا شروع کر دیا تھا' لیکن ابھی اتنا اندھیرا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ سامنے کے منظر کو اچھی طرح دیکھ ہی نہ پاتا۔

چند لمحے کشمکش کا شکار رہنے کے بعد اس نے وہاں سے ہٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں معمول کی گشت ڈیوٹی کر رہا تھا۔ شام ہوتے ہی ان لوگوں کو ڈاک بنگلے کے گرداگرد علاقے میں شرپسندوں کی ممکنہ کارروائیوں سے نمٹنے کے لیے پہرے پر متعین کر دیا جاتا تھا۔ اگر وہ یہیں رہتا تو ان لوگوں کی نظروں میں آ جاتا' جو اسے گوارہ نہیں تھا۔ پولیس کا افسر طرف آتا تو کوئی خطرناک بات نہیں تھی' لیکن اتنے ہجوم کے ساتھ انسپکٹر اشوانی کمار کی آمد نے اسے ضرور مشکوک کر دیا تھا۔ سپاہی اللہ داد نے دیکھ لیا تھا کہ آنے والوں نے رائفلیں بھی تھام رکھی تھیں اور کئی ایک کے کندھوں سے لٹکتی گولیوں کی پیٹیاں بھی اسے دکھائی دیئے تھی۔

سپاہی اللہ داد پیچھے ہٹ کر ایک محفوظ آڑ میں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے مزید احتیاط کی خاطر [illegible] کا رخ دوسرے ہی لمحے وہ ایک درخت کی ٹہنیوں میں چھپا بیٹھا اندھیرے [illegible] آنے والوں کو دیکھنے لگا۔ سونی لاج سے یہ سڑک سیدھی ڈاک بنگلے [illegible] وہ لوگ سونی لاج والے موڑ سے اسی عمارت کی طرف گھوم گئے

سپاہی اللہ داد کو سارے معاملات کی سمجھ آ گئی۔ وہ [illegible] سے [illegible] کے لیے [illegible] ہوئے [illegible] سپاہی اللہ داد نے [illegible] اور [illegible] سپاہی اللہ داد کے [illegible] حوالدار غلام محمد [illegible] سے [illegible] ہوئے [illegible] سلسل اور تیز بھاگنے سے سپاہی اللہ داد کا سانس [illegible] ہوا تھا۔ سکوت [illegible] ساری پولیس آ رہی ہے۔ وہ ادھر..... سونی لاج کی طرف....."

"کیا سونی لاج کی طرف؟" غلام محمد نے اس کی بات لوٹ کر پوچھنا چاہی۔ وہ [illegible]

"ہاں۔۔۔ ہاں چاچا! وہ لوگ ادھر سونی لاج کی طرف گئے ہیں۔" سپاہی اللہ داد نے اپنی بات مکمل کر دی۔

"کیا کرنے؟" اس مرتبہ شیرو اس سے مخاطب تھا۔

اسے اپنی بات کا جواب بجائے سپاہی اللہ داد کے سونی لاج کی طرف سے آنے والے دو چیخوں نے دیا۔

"تمام جوانوں کو فال ان کرو۔" شیرو نے برآمدے سے کمرے کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے کہا۔

حوالدار غلام محمد نے اپنی جیب سے سیٹی نکال کر بجانی شروع کر دی۔ جب تک شیرو اپنی اسٹین گن اور گولیوں کا تھیلا اٹھا کر باہر آتا' ہوم گارڈز کے وہ جوان جن کے کانوں تک سیٹی کی آواز پہنچی تھی' وہاں پہنچ چکے تھے۔

"پانچ جوان یہاں رک جاؤ' باقی دو سیکشنوں میں بٹ جاؤ۔۔۔ پانچوں جوان میرے ساتھ جائیں گے۔ باقی کو تم میرے تعاقب میں لے کر آؤ۔ نزدیک آنے کی ضرورت نہیں' جب تک میری طرف سے اشارہ نہ ملے' کوئی جوان گولی نہیں چلائے گا۔" شیرو نے تیز برساتی آواز میں ہدایات جاری کیں۔

پانچ جوان اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی آگے بڑھ آئے۔ "میں آگے چلوں گا' تم لوگوں کو میرے پیچھے لانا۔ فاصلہ دس قدم۔۔۔ احتیاط سے۔۔۔ آواز پیدا نہ ہو۔۔۔ ایڈوانس جوان!" اس نے آگے نکلتے ہوئے کہا۔

"پوزیشن جوان۔۔۔ دائیں تین جوان پھیلو۔۔۔ محمد بن بائیں نکلو۔۔۔ [illegible]

گز ـــــ تیار جوان ـــــ ایڈوانس" اپنے عقب میں اسے حوالدار غلام محمد کی آواز

ابھی وہ لوگ پندرہ بیس گز آگے ہی بڑھے تھے جب اچانک بنکے کی ایک سائیڈ سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور حوالدار غلام محمد کے سر میں لگی۔ وہ بغیر چیخے چلائے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں بند ہو رہی تھیں جیسے کوئی قصائی کسی بکری کو ذبح کر رہا ہو۔ وہ بھاگتے بھاگتے ایک دم گرتے گرتے بچی تھی۔ شیرو ٹھٹک کر رک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھ سکے' سامنے سے بھاگ کر آتی ہوئی عورت اس سے ٹکرا گئی۔ خوف اور دہشت سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"کیا بات ہے ـــــ کیا ہوا؟" شیرو نے اس کا بازو تھام کر اسے خود سے الگ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہ ـــــ وہ ورنے وہاں ـــــ" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ خوف اس کے گلے میں کہیں اٹک کر رہ گیا۔

"گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارے مسلمان بھائی ہیں۔" ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کو تسلی دی' لیکن اس کی دہشت میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ خوف اور دہشت سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ شیرو کو دیکھتی رہی۔

"اسے وہاں موجود جوانوں کی حفاظت میں دے آؤ۔" شیرو کی آواز میں صاعقہ کی کڑک تھی۔

سپاہی سہمی ہوئی لڑکی کو جو مرے سے تنکی ہی کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کے چنگل سے نکل کر یہاں تک آ گئی تھی' بڑی آہستگی سے بازو پکڑا اور تیز تیز قدموں سے واپس آ گئے۔ وہ لوگ جوں جوں "سوئی گلن" کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے' دہشت کی قیامت صغریٰ ان کی سماعت کو اور تیزی سے جھنجھوڑنے لگی تھی۔

شیرو نے اسٹین گن کو پوزیشن میں کر لیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو اس نے چند قدم پیچھے ہی ٹھہرنے کا حکم دیا تھا۔ ابھی وہ چند گز دور ہی تھا جب اچانک "ہالٹ" کی آواز سن کر رک گیا۔

"کون ہو تم؟" اندھیرے میں آواز بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک طاقتور ٹارچ بھی روشن ہو گئی جس کی روشنی ایک پہلو سے نکلی اور بہت قدرے بنکا ہو گئی۔

"میں ہوں گارڈ آف آنریری کیپٹن۔" شیرو کی آواز سنائی دی۔ "اپنے افسر کو بلاؤ۔"

اس نے پکارنے والے کو حکم دیا۔

"یس سر!" اس کے عقب میں تاریکی میں کوئی حرکت ہوئی۔ پھر کوئی شخص بھاگتا ہوا وہاں پہنچا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ میں اس لمحے کو جانے کیا نام دوں۔ یہ انسپکٹر اشونی کمار تھے۔ خاموشی کمار تین منٹ کے اندر اپنے مختصر سے دستے کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ "شیرو کی ہدایت کو فوری۔ خاموشی وہاں کسی کی موت مارے جانے کے بغیر ہو گئی۔"

شیرو اشونی کمار کا جواب سننے سے پہلے ہی پیچھے ہٹ گیا۔ رکی ہوئی چند قدم پیچھے ہی تھا جب ایک گولی اس کے کان کے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ وہ اس کے دوسرے ہی لمحے شیرو اپنی جگہ سے ہٹ کر قریبی گھاس میں بیٹھی ہوئی حالت پر زمین پر گرتے ہی وہ پوزیشن میں آ گیا اور اب وہ سامنے کی سمت اس کی بھیگی گھاس کے اندر ہی اندر رینگتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔

ایک جگہ رک کر اس نے اندازے سے برسٹ مارا۔ وہ تین نشانے ہی تھے جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کی سمت اکارت نہیں گئی۔

اس کے ساتھ ہی اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے چاروں اطراف گولیاں چلنے لگیں۔ جلد ہی شیرو اور اس کے ساتھیوں نے انسپکٹر اشونی کمار کے پیچھے سے پوزیشن میں بیٹھے سپاہیوں کا اندازہ کر لیا تھا۔

حوالدار غلام محمد اپنی سیکشن کے ساتھ سوئی گلن سے باہر جانے والی سڑک پر پوزیشن لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ساتھی کو ہدایت دے کر پیچھے روانہ کر دیا۔ جب ہی اس کی مڈبھیڑ ہوئی جب اس نے انسپکٹر اشونی کمار اور اس کے دو سپاہیوں کو چارج کرتے ہوئے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ اندھیرے میں ان کے نقوش تو نمایاں نہیں ہو رہے تھے' لیکن ان کی جسامت اور چلانے کا مخصوص انداز اس کی شناسائی کے لیے کافی تھا۔

انسپکٹر اشونی کمار اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوم گارڈز کو چارج میں الجھا کر انہی رستے سے پیچھے ہٹا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر آرمی کے پس جائے اور وہاں پہنچ کر "مسلمان ہوم گارڈز کے حملے" کی دہائی دے کر ان کی مدد سے سب کو چن چن کر مروا دے' لیکن وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ حوالدار غلام محمد اور اس کی سیکشن کے باقی جوان موت کے فرشتے بن کر اس کی راہ تک رہے تھے۔ وہ لوگ اپنی رائفلوں سے رک رک کر فائر کرتے مختلف درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں پسپا ہو رہے تھے۔ جب کہ اشونی کمار کی پشت میں

پے بعد دیگرے گھنے والی دردناک گولیوں نے اسے اوندھا کر دیا۔ یہی منظر اس کے باقی ساتھیوں کا بھی ہوا تھا۔

فائرنگ کے پس منظر میں دلدوز اجتماعی مظلوم عورتوں کی چیخیں قیامت کا سماں بپا کیے ہوئے تھیں۔ بس چند منٹ ہی میں مدافعت دم توڑ گئی۔ آخر پولیس والے مارے گئے تھے' چار زخمی تھے اور باقی شاید بھاگ گئے تھے۔ کسی ہوئی خوف زدہ مظلوم مسلمان لڑکیاں انہیں رحمت کے فرشتے سمجھ کر ان کے حضور فریاد کناں تھیں۔

حوالدار غلام محمد اپنی یونیفارم سمیت وہاں آ گیا تھا۔ شیرو کو وقت کا احساس بڑی شدت سے تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اول تو اب تک آرمی کو فائرنگ کی آوازوں سے صورت حال کا اندازہ ہو چکا ہو گا' اگر نہیں تو جیسے ہی آرمی تک کوئی "مظلوم پولیس والا" پہنچا اور اس نے روئے بسورتے ہوئے کہ ہوم گارڈز کے مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں پولیس کے قتل عام کی خبر دی تو فوج فوراً" حرکت میں آ جائے گی۔

یہ کم اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی' لیکن اس کے "فولادی اعصاب" میں ایسی خوبی تھی جس کو حسین خان کی عقابی نگاہوں نے دیکھ اور پرکھ لیا تھا۔

"چاچا غلام محمد! اپنے ساتھ دس جوان لے کر تمام عورتوں سمیت ٹرک میں سوار ہو جاؤ اور ناشری نالے کے پاس پہنچ کر ہمارا انتظار کرو۔ اگر ہم لوگ ایک گھنٹے تک پہنچ جائیں تو بہتر---- ورنہ تم عورتوں کو لے کر سری نگر کی طرف نکل جاؤ۔" اس نے بوڑھے غلام محمد کو کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن تم لوگ....." غلام محمد نے کچھ کہنا چاہا۔

"یہ بحث کا وقت نہیں حوالدار غلام محمد۔" اس کا لہجہ غلام محمد کے لیے اجنبی تھا۔ "باقی جوان میرے ساتھ پیدل چلیں گے۔ ہم لوگ سری نگر روڈ پر رک کر صورت حال پر نگاہ رکھیں گے۔ ہیڈ کوارٹر کو سری نگر میں تازہ صورت حال سے آگاہ کر دو۔ ان کی طرف سے کوئی جواب آنے تک اگر فوج نے مداخلت کی تو ہم انہیں راستے ہی میں روکنے کی کوشش کریں گے۔ حوالدار غلام محمد اگر ایک گھنٹے تک میری طرف سے کوئی پیغام نہ آئے تو تم نالے کا پل اڑا کر سری نگر کی طرف نکل جاؤ---- جلدی کرو۔" اس نے مزید کسی کی کوئی بھی بات سننے سے پہلے وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔

وہ ٹائر بنگلے کی طرف بھاگتے ہوئے جا رہے تھے اور شیرو اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود سہمی ہوئی مسلمان عورتوں کو تسلی دے رہا تھا کہ ان کے جیتے جی کوئی مسلمان

بلوی کی طرف بری نگاہ نہیں اٹھ سکتی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہاں ہوم گارڈز کا وہی ٹرک آ رہا تھا جس پر وہ سری نگر سے یہاں آئے تھے۔ تمام عورتوں کو اس میں سوار کرانے کے بعد وہ پہلے سے تیار وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں کے قافلے کی طرف چل دیے۔

"اللہ تمہیں بیٹا! خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ ابھی تمہیں ہماری ضرورت ہے۔" حوالدار غلام محمد نے جو سر جھکائے شیرو کے قریب کھڑا تھا سب سے آخر میں ٹرک میں سوار ہوتے ہوئے کہا۔

"فی امان اللہ!" بچے کھچے مجاہدین نے انہیں رخصت کیا۔

ٹرک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوا اور جلد ہی سامنے والے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شیرو ابھی واپس اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا ہی تھا کہ اسے وائرلیس سیٹ والا جیپ کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"سیٹ خراب ہو گیا ہے۔" اس نے شیرو سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"تم نے کوشش کی اسے ٹھیک کرنے کی؟"

"جناب ہر طرح کی کوشش کے بعد ناکام ہو کر ہی آپ تک آیا ہوں۔"

"اوہ----!" شیرو کے منہ سے نکلا۔

وائرلیس سیٹ کے بگڑنے کے بعد اب ان کے پاس سری نگر پیغام بھیجنے کا واحد ذریعہ بنوٹ کا ٹیلی گراف آفس تھا۔ سری نگر' بانہال' کشتواڑ' بھدرواہ' ڈوڈہ غرض ہر جگہ یہاں سے ہو کر ہی تار جایا کرتی تھی۔ اس لیے اس ٹیلی گراف آفس کو نیوز ایجنسی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

شیرو جانتا تھا اس وقت پوسٹ ماسٹر گھوڑے بیچ کر سو رہا ہو گا۔ اس کا گھر بنوٹ کے ہندو محلے میں تھا جہاں تک اول تو ہوم گارڈز کے کسی سپاہی کے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' اگر کوئی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں پہنچ ہی جاتا تو اس بات کے مواقع بہت ہی کم تھے کہ متعصب ہندو پوسٹ ماسٹر ان کی خاطر وہ آفس کھول دے گا۔

مقامی مسلمان آبادی کا صفایا کرنے کے بعد اب شرپسندوں کو ہر وہ شے بری طرح کھٹکنے لگی تھی جس سے مسلمانی کی ذرا بھی بو آئے۔ اس صورت حال کے باوجود ایک جوان پوسٹ ماسٹر کے گھر جانے کو تیار ہو گیا۔ شیرو کے کہنے پر اس نے اپنی وردی اتار کر سویلین کپڑے پہن لیے تھے۔

ابھی وہ بمشکل چند گز دور ہی گیا تھا کہ ہوم گارڈز کا ایک جوان بڑی تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا اس طرف آیا۔ یہ کشتی پزول پارٹی کا جوان تھا جسے شیرو نے ہنگامہ ہنگام کے لئے بوٹ کی طرف روانہ کیا تھا اور ان لوگوں سے کہا تھا کہ وہ فوجیوں کے "عارضی ہیڈکوارٹر" سے اس طرف آنے والی سڑک پر نظر رکھیں' جیسے ہی کوئی غیر معمولی حرکت نظر آئے' اسے اطلاع دی جائے۔

"فوج اس طرف آ رہی ہے۔" اس نے دور ہی سے چلاتے ہوئے کہا۔

"تمام جوان اپنا اپنا اسلحہ اٹھا کر سری نگر روڈ کی طرف چلو۔" شیرو نے انہیں حکم دیا اور ساتھ ہی وہ بھی ڈاک بنگلے کی طرف بھاگا تاکہ وہاں موجود ایمونیشن اٹھا سکے۔

☆○☆

دونوں گہری نیند سو رہے تھے جب اچانک ہی بوستان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ خواب بھی ایسا ہی ڈراؤنا تھا۔ وہ پوچھ کار بننے والا ایئر مین آرمی کا سابقہ ٹائیگ تھا اور پچھلے دو ماہ سے چوری چھپے "صاعقہ" کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس کے گلیوں پر پچھلے ہی ہفتے جب بھارتی فوج شہر میں داخل ہوئی تھی' حملہ ہوا تھا۔ بریگیڈیئر پریتم سنگھ نے شہر میں داخل ہوتے ہی اعلان کیا تھا کہ شہر کے گرد و نواح میں چھپے شرپسندوں کو گرفتار کروانے والوں کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ مفرور شرپسندوں کے گھر بار کو آگ لگا دی جائے گی اور ان کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اپنی اس دھمکی کو فوج نے اب تک کئی مرتبہ عملی جامہ پہنانے کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ شہر کی مسلمان آبادی بری طرح سہمی ہوئی تھی اور کسی بریگیڈیئر پریتم سنگھ چاہتا تھا کہ شہر کے اندر سے ہونے والی کوئی بھی جارحانہ کارروائی اس کی فوج کے لیے موت کا پروانہ ثابت ہو سکتی تھی۔

بوستان نے خواب میں اپنے بچے اور بیوی کا جو حشر دیکھا تھا' اس نے حقیقی دنیا میں آ جانے کے بعد بھی اسے لرزا کر رکھ دیا۔ اس کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ عالم زندگی میں وہ کوئی بزدل آدمی نہیں تھا۔ اگر بزدل ہوتا تو کبھی نبی خان کی نظر انتخاب اس پر نہ ٹھہرتی۔ ضرور اس میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے "صاعقہ" میں شامل کیا تھا۔

لیکن وہ کمزور لمحہ ——! وہ لمحہ اسے بزدل بنا گیا۔ یہاں اس شہر میں انسان کا جو مول کی طرح کٹ رہے تھے۔ جس کسی پر معمولی سا بھی شبہ ہو جاتا' اسے اس کے اہل و عیال سمیت ایک لمحے میں ختم کر دیا جاتا تھا۔ ابھی پرسوں ہی کا واقعہ تھا جب فوج

نے پونچھ بیل سے مقامی لیڈروں کو رہا کر کے پل پر پہنچایا اور وہاں پہلے سے تیار شدہ مسجد سے اعلان کروا دیا تھا جنہوں نے ان کے استقبال کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بمشکل ایک دو خوش قسمت ایسے تھے جو دریا میں چھلانگیں لگا کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

بوستان کا ذہن رہ رہ کر اپنے اکلوتے بیٹے اور بیوی کی طرف پلٹتا تھا جن کے بغیر اس کی زندگی بے معنی تھی۔ اس کا ان دونوں کے علاوہ اور تھا ہی کون؟ کبھی کبھی تو وہ خود حیران ہوتا تھا کہ آخر ایسی "کمزوری" کے ہوتے ہوئے اس نے اتنی خطرناک زندگی کیوں اپنا لی تھی۔ اسے اپنے رویے کی کوئی سمجھ نہیں آتی تھی۔

لیکن آج —— آج بوستان کی حیثیت ایک بزدل اور سہمے ہوئے بچے سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔ دماغ کا فیصلہ کن تھا کہ بھارتی فوج کے مرکز پر پیش ہو کر "صاعقہ" کے مقامی اڈے اور عمدہ اور اس کے دونوں ساتھیوں کے عزائم سے آگاہ کر کے جان کی امان اور انعام و اکرام پا لے جب کہ دل اس فیصلے پر ملامت کرتا تھا۔

وہ ضمیر کی اذیت ناک مار —— رہا تھا اور اس کا دوسرا ساتھی آنے والی قیامت سے بے خبر گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے کھانا تیار کیا تھا۔ رات اس نے جاگ کر ہی گزاری تھی اور اب قدرے مطمئن ہو کر لیٹ گیا تھا کہ نیند نے اسے آ لیا۔

دوپہر تک بوستان کے اندر خاصی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی' لیکن بزدل فطرت ہی سہی اس نے بزدلی ہی کو مصلحت جان لیا تھا۔ اس کے ساتھی نے کھانا تیار کیا تھا۔ انہیں یہاں سے رات کے دوسرے پہر امیر خان اور اس کے ساتھیوں کی آمد کے بعد ہی روانہ ہونا تھا۔ بوستان نے بمشکل دو چار لقمے زہر مار کیے تھے۔ اپنے ساتھی کے استفسار پر اس نے پیٹ کی خرابی کا بہانہ کر کے بظاہر اسے مطمئن کر دیا تھا' لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کے اندر برپا ہونے والی کشمکش اس کے رویے پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے اور اس کے درمیانی عمر کے ساتھی نے اس میں پیدا ہونے والی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔

"کیا بات ہے بوستان' تم کچھ مطمئن نظر نہیں آ رہے؟" بالآخر اس نے اپنا خدشہ بوستان پر ظاہر کر ہی دیا۔

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں۔ بس یونہی دراصل پچھلے دو چار دن سے مجھے پیٹ کی

تکلیف نے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔"

"شہر سے کوئی دوائی لے آؤ۔" اس کے ساتھی نے ہمدردی ظاہر کی۔

"ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں، پھر شہر کے حالات....." بوستان نے بات بالکل ہی بھول گئی، لیکن وہ قدرے مطمئن بھی ہو گیا کہ اس طرح یہاں سے ہٹنے کا کوئی بہانہ تو اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔

بوستان بیس رات کو نہ جانے اور کتنا سفر کرتا ہے۔ میرے خیال سے بہتر یہی ہے کہ تم کوئی دوائی لے آؤ۔" اس کے ساتھی نے کہا۔ بوستان کو بے چین تو پاتا تھا، لیکن اس کی پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اب جیسے اس کی پریشانی جان کر مطمئن ہو گیا۔ "ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو جاتا ہوں۔" بوستان اٹھ کھڑا ہوا۔

سہ پہر کو وہ اپنے ٹھکانے سے نکلا تھا اور سورج غروب ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے پریتم سنگھ کے ہیڈکوارٹر تک پہنچا تھا۔ ہیڈکوارٹر کے باہر کھڑا وہ بڑی اذیت ناک سوچ میں گرفتار تھا۔ اپنے زندہ ضمیر کو سلانے کے لیے اسے کسی دلیل یا منطق کی کوئی ابھی میسر نہیں آئی تھی۔ اسے رہ رہ کر عجیب و غریب خیالات گھیرے ہوئے تھے، پھر بچے اور بیوی نے ساری سوچوں کو نگل لیا۔ "یہ ساری بدوبجد بے کار ہے—— ایک دم بکواس—— کشمیر کبھی آزاد نہیں ہو گا۔ سب لیڈر سرکار سے ملے ہوئے ہیں۔ تمام شیر مُردوں کی ہڈی منہ لگتے ہی گیدڑ بن چکے ہیں۔ پاگل ہے نبی خان۔ ہم سب پاگل ہیں۔ خواہ مخواہ خود کو موت کے منہ میں ڈال رہے ہیں۔ اپنا گھر بار تباہ کروا رہے ہیں۔ اس فوج کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔ کوئی نہیں۔" وہ بڑبڑاتا خیموں کی اس قطار کی طرف بڑھ رہا تھا جو ایک عمارت کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور یہی قطار یعنی پریتم سنگھ کا ہیڈکوارٹر۔

"ہالٹ" کی زوردار آواز سن کر وہ سہم کر رک گیا۔ ایک سپاہی رائفل تانے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ "اے کدھر جائے گا؟" آنے والے نے درشت لہجے میں اسے مخاطب کیا اور بوستان کو یوں لگا جیسے وہ کسی خواب سے اچانک چونک کر بیدار ہوا ہو۔

"میں—— میں بریگیڈیئر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا۔ سپاہی کو معاملہ کوئی گڑبڑ نظر آ رہا تھا۔ "ہینڈز اپ!" اس نے بوستان کو للکارا اور اس کے ہاتھ کسی مشینی عمل کے تابع اوپر اٹھتے چلے گئے۔

"تو ادھر چلو سالا! ابھی پتا آتا ہے تیرے کو بریگیڈیئر صاحب سے۔" سپاہی نے اسے رائفل کی نال سے دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

[illegible] "سالا!" اس نے اپنے افسر کو تعظیم دیتے ہوئے کہا۔ "یہ مسلا دیگیڈیئر صاحب سے ملنا مانگتا ہے۔" لفظ اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔

کیپٹن پیارے چند نے اپنی میز کے سامنے ہاتھ اٹھا کر کہنے پر بوستان کی آنکھوں میں [illegible] چند لمحوں کی ہاچ سے وہ بوستان کو گھورتا رہا، پھر اس نے اپنی نظریں ہٹا لیں۔ پھر اس نے میز پر رکھی گھنٹی پر زور سے ہاتھ مارا۔ دو مسلح سپاہی اندر آ گئے۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے بوستان کو حکم دیا۔ "اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا جنہوں نے بوستان کو فوراً مارے پیٹے اتار دینے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی تین رائفلوں کی نالیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

"یہ—— یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟" اس نے بے بسی سے چیخ کر کہنا چاہا لیکن اپنے پہلو پر لگنے والی زوردار لات نے اسے الٹا کر رکھ دیا۔

"بکو مت! کپڑے اتارو۔" بوستان کے پیچھے کھڑے حوالدار نے ہوا میں اٹھی ہوئی [illegible] لیکن اس کی پسلیوں میں چبھوئے تھا کہا۔

خوف کی ایک سرد لہر بوستان کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ اس کے لہو نے ضمیر بول پڑا تھا۔ وہ کسی خوفزدہ بچے کی طرح بزدل بن گیا۔ بوستان نے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار دیئے، صرف ایک زیر جامہ اس کے جسم پر رہ گیا۔

کیپٹن پیارے چند کے اشارے پر وہی حوالدار آگے بڑھا۔ اس نے دوبارہ بے خبری میں رائفل کا بٹ اتنی قوت سے بوستان کے پہلو پر جمایا کہ وہ اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک رائفل کی نلی اس کی پیٹھ سے آن لگی۔ ایک سپاہی نے رائفل کے ساتھ ہی ایک پاؤں اس کی کمر پر رکھ دیا۔ دوسرے نے زیر جامہ پر زور زور سے ہاتھ مار کر اس بات کی تصدیق کر دی کہ یہاں کچھ نہیں۔

حوالدار نے اس کے تمام کپڑے پہلے پاؤں کی ٹھوکروں سے پھر ہاتھ سکوڑتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولے۔ اس کی سب جیبیں خالی تھیں۔ حوالدار نے سر کو نفی کے انداز میں ہلاتے ہوئے جب بوستان کے پاس کچھ نہ ہونے کی تصدیق کی تو کیپٹن پیارے چند کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"اٹھ کر کپڑے پہنو اور بیٹھ جاؤ۔" اس نے کمرے کے ایک کونے میں رکھے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔

بوستان جس کی ٹہنی پر بڑنے والی ضربوں نے اسے بے حال کر رکھا تھا، گھاس پر اسٹول پر جا بیٹھا۔ تینوں سپاہی گھرنے کے مختلف کونوں میں کھڑے ہو گئے۔

"کیا نام ہے تیرا؟" کیپٹن پیارے چند اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

"بوستان!" بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا کام کرتے ہو؟"

"میں صاحب انڈین آرمی کا سابق ٹائیگر ہوں۔" اسے بولنے میں بڑی قوت صرف کرنا پڑتی تھی۔

"ہر یگیڈیئر صاحب سے کیوں ملنا تھا؟" وہی سنسناہٹ اس کے کانوں میں گونجی۔

"صاحب میں ایک بہت اہم اطلاع لایا ہوں۔" بوستان نے کچھ توسلہ کیا۔

"کیا؟"

"لوہر ایک لڑوہ ہے تخریب کاروں کا۔"

ابھی اس کا جواب نامکمل ہی تھا کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر لگا اور وہ اسٹول سمیت زمین بوس ہو گیا۔ "سالا! ہمیں ڈانٹ کرتا ہے۔" کیپٹن نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

اتنا بھرپور طمانچہ تھا کہ بوستان کے کانوں میں گونجتی سنسناہٹ پہلے سے دوچند ہو گئی۔ اسٹول سے زمین پر وہ منہ کے بل گرا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ اس نے اپنی قمیص کی آستین سے منہ پونچھا اور دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"صاحب ——— ! صاحب! خدا کی قسم میں سچ بولتا ہوں۔ صاحب!" وہ گھگھیایا۔

"بکتا ہے سالا۔" کیپٹن کے منہ سے گالی نکلی اور اس کے سپاہی بوستان پر پل پڑے اور وہ بزدلوں کی طرح چیختا چلاتا رہا۔ پھر کیپٹن نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے جوانوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔

اس دو تین منٹ کی مار ہی نے بوستان کی ہڈیاں چٹخا کر رکھ دی تھیں۔ وہ زمین پر گرا بے بس پٹنے کی طرح رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مہلت نصیب ہونے پر وہ ہاتھ باندھتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ "میں سچ کہتا ہوں صاحب۔ میں سچ ———" وہ ایک ہی فقرہ روتے ہوئے دہرا رہا تھا۔

آدھ گھنٹہ مسلسل مار اور گالیاں کھانے کے بعد بوستان جب اس قابل ہوا کہ انہیں اپنی "سچائی" کا یقین دلا سکے تو جہاں اس کے جسم کا بند بند ٹوٹنے لگا تھا، وہاں کوئی بھیدہ طاقت

[illegible] کے ہاں میں [illegible] "سچ!" کی مسلسل تکرار کر رہا تھا۔

[illegible] کے باہر لے جاؤ۔" کیپٹن پیارے چند نے اپنے ہاتھوں کو صاف کیا اور وہ جوان اس کے سامنے پہرے پر ٹیل پا چکے تھے اور تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھے۔

[illegible] پیچھے رہ گئے تھے۔ پیارے چند اور اس کے افسران اب بوستان پر مشتمل جمع کو لے کر بھی مطمئن [illegible] اس کے ساتھ "سچائی" کے متلاشی لمحاتے پر چھاپہ مارنے جا رہے تھے۔

☆○☆

تینوں کے اعصاب رات ڈھلنے کے انتظار میں تڑخنے لگے تھے۔ مورچہ کی مسلسل نگہداشت کے لئے ہوئی۔ سارا دن تو مطلع صاف رہا لیکن شام کے افق پر بادلوں کا ہیولہ نمودار ہونے لگا تھا۔ ڈوبتے سورج کی کپکپاتی کرنوں نے بادل کے ہمالیائی اطراف پر خوبصورت شعاعی پیٹرن بنا لیا تھا۔ اب اس حاشیے پر بھی رات کی ظلمتوں کا سایہ گہرا ہونے لگا تھا۔ بالآخر روشنیاں دم توڑ گئیں۔

اندھیرے کے ہیبت ناک دیو نے ان کے سامنے بنی پہاڑی کو نگل لیا تھا۔ کبھی کبھی کسی سمت سے اچانک ٹارچ یا سرچ لائٹ کی روشنی جل بجھ کر اندھیرے کے اس طلسم سے ٹکرا کر دم توڑ دیتی تھی۔

سامنے کا سارا منظر گو کہ کشمیر کے مقدر پر پھیلی رات کی ظلمت نے ہڑپ کر لیا تھا لیکن امیر خان نے ٹکر کی ایک ایک تفصیل حفظ کر رکھی تھی۔ صبح سے اب تک اس نے اس کے سوا اور کیا ہی کیا تھا۔ کبھی کبھی جب سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک پر دوڑتی کسی جیپ کی روشنی موڑ کاٹتے ہوئے ایک خاص زاویئے پر آ کر جب ٹکر کو جانے والے راستے پر پڑتی تو امیر خان کی رگوں میں انگارے دوڑنے لگتے۔

"چلو سنگیو!" اس نے اپنے بائیں بیٹھے دونوں ساتھیوں سے سرگوشی کی۔

"امیر خان بڑا لمبا ساتھ رہا ہے اپنا ——— ہم نے اٹلی سے مصر تک اکٹھے مہمت کی شاہراہ پر سفر کیا ہے۔ اب مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہو۔" مدد گوجر نے اس کے بازو پر لرزتا ہوا ہاتھ رکھا۔

"نہ سنگی ——— نہ!" امیر خان نے بڑی آہستگی سے اس کے ہاتھ کو الگ کیا اور اپنا مضبوط پنجہ اس کے کندھے پر جما لیا۔ تم تو جانتے ہو مجھے ——— میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں۔" اس نے کوشش کی تھی کہ اپنے لہجے کو غیر سنجیدہ بنائے رکھے۔

HBC

جہول خاموش تھا۔ اسے کچھ نہیں سوجھ رہی تھی۔ تینوں دوست ایک دوسرے سے بری طرح بغلگیر ہوئے۔ انہوں نے ہنستے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے ہمیشہ دل کی بھی دولت تنظلی کی معافی مانگی اور "ترب راکھا" پکارتے موت کی شاہراہ پر قدم رکھنے والی تین راہیں اپنا لیں۔ وہ پتھروں پر بغیر آواز پیدا کیے چل رہے تھے۔ مرد لور جہول خان کو امیر خان نے ان کی پوزیشنوں سے آگاہ کر دیا تھا۔

ایک مخصوص مقام پر وہ تینوں اپنی اپنی سمت ہو لیے۔ مرد لور جہول نے اس راستے کو عبور کرنا تھا جو اس بنکر تک جاتا تھا لور امیر خان نے اپنے ذہن میں اس سے الگ ایک دشوار گزار راستہ اختیار کر کے بنکر تک پہنچنا تھا۔

بنکر کے ایک کونے سے جھانکتی فیلڈ گن کی نال سے کبھی کبھی کوئی گولہ گونج دار آواز پیدا کرتا' اپنے پیچھے چنگاریوں کی ایک لکیر چھوڑتا مجلدین کی پوچھ سے باہر جانے والی پوزیشنوں پر گرتا تو ایک گونج سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر لرزنے لگتی۔ پھر اس کا ہیبت ناک تسلسل بھی خاموشیوں کے سمندر میں غرق ہو جاتا۔

امیر خان نے اپنے جوتے اتار کر پھینک دیئے تھے۔ اس کی اسٹین گن اس کے کندھے سے جھول رہی تھی اور پوچ میں رکھے ہینڈ گرنیڈ محض ایک لمحے کی مہلت پر اپنی مہم پر روانہ ہونے کے لیے تیار تھے۔ امیر خان نے بنکر کے ایک پہلو پر پھوٹتے اس پیچ دار لور بظاہر ناقابل عبور راستے کا انتخاب کیا تھا جس پر چل کر بنکر تک پہنچنا کسی بہت بڑے اور جھلستے صحرا کو پاٹنے سے کم ہرگز نہ تھا۔

کسی بھی پتھر پر پڑنے والا غلط قدم' کوئی بھی کنکر نیچے گرا دیتا یا کسی بھی جھاڑی سے پیدا ہونے والی معمولی سی آواز اس کی موت کی پیامبر بن جاتی۔ کوئی اس طرف دیکھنے کا تکلف بھی نہ کرتا۔ محض اس کے سر پر جھانکتی مشین گن کی نالی سے ایک سرخ لکیر پھوٹتی اور وہ موت کے بے رحم ہاتھوں میں کچھ کرنے کی حسرت ہی دل میں لیے جا پہنچتا۔

پتھروں پر تیرتا ہوا اب وہ اس نیچے کے نیچے بنی چٹان کے تیز دھار سرے پر پہنچ چکا تھا جس نے اسے اس نیچے تک پہنچانا تھا' جس کے اوپر بنے بنکر میں موت اپنا بھیانک جبڑا کھولے ہر آنے والے کی منتظر بیٹھی تھی۔

امیر خان نے پتھروں کے ڈھیر پر سے ایک قدم چٹان پر رکھا اور زمان و مکان کی ٹھہری ہوئی گردشوں میں سما گیا۔ یہ چند لمحوں کا سفر اس کے اعصاب توڑے ڈال رہا تھا۔ کسی بھی نئے پیر اٹھنے سے کوئی کنکر بھی پھسل کر آواز پیدا کر سکتا تھا۔ پھر اس کے قدم اٹھانے اور

رکھنے کا عمل ایک ساتھ وقوع پذیر ہوا۔ دھماکے کی آواز سے اس کی نسیں ٹوٹنے لگیں۔ تنی ہوئی تنکر از کر نیچے گرے تو امیر خان کو اپنی نبضیں ساکت ہوتی ہوئی معلوم ہوئیں۔

پھر اس نے اس لمحاتی خاک گریز کیفیت کی بھینٹ چڑھا کر وہ شعور کے دھاروں میں واپس آیا اور موت کی شاہراہ پر سنبھل سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ اپنی ساکت نبض کے ساتھ اس نے اپنا پاؤں اور پھر پنڈلی کا پٹھا صراط عبور کیا اور نیچے پر پہنچ گیا۔

نیچے کی چٹان قدرے ہموار تھی۔ امیر خان نے برف سی چھریلی چٹان پر خود کو بغیر آواز پیدا کیے گرا دیا اور لمحے لمحے ایک پتھر سے ٹک کر اپنے پوچ سے گرنیڈ باہر نکالا۔ یہاں تک پہنچنے کی جو مسافت اس نے پانی تھی' اس کا تصور کرتے ہی کرب آمیز مسکراہٹ کی ایک لہر اس کے ہونٹوں پر منجمد ہو کر رہ گئی۔

اپنے شعور کی دنیا میں لوٹنے پر جب اس نے اپنی جسمانی کیفیت کا جائزہ لیا تو اس پر منکشف ہوا کہ اس کے پاؤں تو کبھی کے جسم سے الگ ہو چکے ہیں۔ پاؤں کی جگہ برف میں منجمد گوشت کے دو بے حس لوتھڑے اس کی ٹانگوں سے چپٹے ہوئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح اپنے بے حس اور منجمد قدموں پر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سینے سے پتھروں کی وہ دیوار لگی ہوئی تھی جس میں چوکور دروازے کے اندر فیلڈ گن اور مشین گنیں نصب تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اسے اپنے منہ تک لے جا کر امیر خان نے گرنیڈ سے پن الگ کی اور پنجوں کے بل اوپر کو اٹھا۔

بنکر میں موجود توپچیوں کے ہیولے اندھیرے میں ابھرے' پھیلے اور پھیل کر سمٹ گئے۔ امیر خان کا ہاتھ سر سے بلند ہوا اور گرنیڈ مورچے میں جا گرا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دوسرے گرنیڈ کی پن نکال چکا تھا۔ پہلے دھماکے کے ساتھ ہی دوسرا گرنیڈ بنکر میں گرا۔

دھماکے کے ساتھ اڑنے والی چیزوں میں امیر خان کا اپنا وجود بھی شامل تھا۔ پوری دنیا کانپ ہی تو دہل گیا تھا۔ امیر خان اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ اڑتا ہوا سامنے والی چٹان سے ٹکرایا۔ پھر اس کا وجود ٹکرا کر پیچھے کو الٹا اور سر ایک بڑے پتھر سے ٹکرا گیا۔ تازہ خون کی ایک سرخ لکیر پتھر پر سے بہہ کر ایک کونے سے قطرہ قطرہ نیچے پھیلے پتھروں پر گر کر جمنے لگی۔

"خدایا..... کشمیر.....!" اس نے دو الفاظ ہی بمشکل ادا کیے تھے۔

شہادت کی منزل

صوبے دار کیدار ہاتھ اپنی پگڑی کے ساتھ باندھ کر رہا تھا جب اس کو دور سے دو سائے بھاگ کر اس جانب آتے دکھائی دیئے۔

——اس سے پہلے فائرنگ کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ پہلے تو اس نے یہی سمجھا کہ یہ بلوائیوں کی کارروائی ہے، لیکن جلد ہی اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اس کی تو ساری زندگی میدان جنگ میں گزری تھی اور بیک وقت فائر کرتی مختلف گنوں میں سے علیحدہ علیحدہ ہر ایک آواز کی شناخت کر سکتا تھا—— فائرنگ میں لائٹ مشین گن کی آواز اس امر پر دلالت کر رہی تھی کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

"ٹارچ جلاؤ۔" اس نے ایک جوان کو حکم دیا۔

ٹارچ روشن ہوتے ہی باقی ساری پلاٹون اٹینشن ہو گئی۔ ٹارچ کی روشنی میں انہیں دو حواس باختہ پولیس والوں کے چہرے دکھائی دیئے جو دیوانہ وار منہ اٹھا کر اس طرف بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

"مہاراج جی—— مہاراج جی! غضب ہو گیا۔" فوج کو اپنے سامنے دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے ہانپتے ہوئے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔ دوسرا تو دہشت کے مارے بولنے کے قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔

"کیا ہوا——؟ کیا بات ہے؟" صوبے دار کیدار ناتھ نے فوجی دبدبے کا مظاہرہ کیا۔

"لوھر بوم گارڈز والے مسلمانوں نے سب کو مار ڈالا—— سب کو مہاراج جی—— کسی کو زندہ نہیں چھوڑا—— انسپکٹر صاحب بھی مارے گئے—— سب مارے گئے۔" وہ ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا۔

"مسلوں نے..... سب کو مار دیا....."

"ان کی یہ ہمت——!"

"یہ ایسے ہی کرتے ہیں۔"

"وہاں بھدر واہ میں بھی انہوں نے کل تین ہندو پولیس والے مار دیئے تھے۔" لانس نائیک ذہانی بھانت بھانت کا زہر اگلنے لگیں۔

"صاحب جی! وہ سب چھوکریوں کو بھگا کر لے گئے ——— سب کو ———" دوسرا بھی ہمت کر کے ٹھکیلیا۔

"یہ مسلے خان کی یہ ہمت!" صوبے دار کیدار ناتھ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"ایڈوانس کرو جوانو ——— ساری پلاٹون بکھر کر میرے ساتھ چلے گی ——— اسے حوالدار صاحب تم ادھر کمپنی ہیڈ کوارٹر کو خبر کرو ———!" اس نے احکامات جاری کیے۔

حوالدار تو وائرلیس پر رابطہ پیدا کرنے لگا۔ باقی جوان فوراً جنگی تربیت کے مطابق مختلف پوزیشنوں میں بٹ کر بکھر گئے۔ وہ سب ایڈوانس کرتے ہوئے ڈاک بنگلے کی طرف بڑھ گئے۔

☆○☆

شیرو بھاگم بھاگ جب اپنے کمرے میں پہنچا تو اسے ایک زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ لڑکی جسے اس نے ایک جوان کے ساتھ بھیجا تھا ——— اس کے کمرے میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔

———افراتفری میں شیرو کے ذہن سے اس کا خیال ہی نکل گیا تھا۔

———اس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے، لیکن ابھی تک وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ اسے اپنی جسمانی حالت کا جائزہ لینے کا خیال ہی شاید نہیں آیا تھا۔

شیرو اس پر ایک نظر ڈال کر دھک سے رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے ہپناٹائز کر دیا ہو۔ یہ لڑکی اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی کسی اور عالم کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ شیرو ایک ٹک اسے گھورتا رہا۔ جیسے ہی لڑکی کو اس کی آمد کا احساس ہوا اور اس کی نظریں شیرو کی نظروں سے ٹکرائیں، ایک خجالت سی اسے محسوس ہوئی جیسے لڑکی نے اسے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔

وہ دوسرے ہی لمحے عالم ہوش میں لوٹ آیا۔ وقت کی نزاکت کا احساس اس سے زیادہ اور کسے تھا۔ چارپائی کے ایک کونے پر دھرا اپنا سویلین جوڑا جو اس نے رات کو پہننے کے لیے تیار کیا تھا، اس نے اس کے سامنے پھینک دیا۔

"جلدی سے کپڑے بدل کر باہر آؤ ——— فوراً!" یہ کہہ کر وہ اپنا اسباب سمیٹنے لگا۔ راشن سے بھرا تھیلا اس نے کندھے کے ساتھ لٹکایا اور گن ہاتھ میں پکڑ کر باہر نکل گیا۔

دو منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد لڑکی باہر آئی۔ اس نے بھی شاید حالات کی سنگینی کو

محسوس کر لیا تھا۔ باقی جوان قطار میں باہر کھڑے تھے۔

"غلام نبی!" اس نے ایک حوالدار کو مخاطب کیا۔ "تم اپنی جوانوں کے ساتھ رہو۔ ہم سری محمد روڈ پاک کرتے ہیں۔ فوج کو اس طرف آتے دیکھ کر لاوارث پٹھان فائرنگ کرتے ہوئے پسپا ہو جائیں تو فائرنگ کرتے ہوئے پسپا ہو جانا۔ سمجھا؟"

اس نے باقی جوانوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی سہمی ہوئی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کا ذہن ہی شاید ماؤف ہو چکا تھا۔ سب سے آگے چلنے والی قدوخوں نے اسے بازو سے تھام رکھا تھا۔

"آؤ ——— چلو میرے ساتھ ———!" شیرو نے اس کا بازو پکڑ کر اسے آگے بڑھایا۔

"ہوں ———!" لڑکی کے منہ سے بمشکل نکلا۔

شیرو نے اسے اپنے ساتھ ہی بھگانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کی رفتار کا ساتھ تو نہ دے سکتی تھی، اس کے ساتھ کھنچی چلی آ رہی تھی۔

———لیکن بمشکل اس نے ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ وہ لڑکھڑا گئی اور اگر شیرو نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ نہ تھام رکھا ہوتا تو وہ منہ کے بل گر پڑتی۔ اس نے رک کر لڑکی کو سنبھالا۔

"چلو ——— جلدی کرو ———!" شیرو نے اسے سہارا دیتے ہوئے مخاطب کیا۔

"مجھ سے بھاگا نہیں جاتا۔" وہ سسک پڑی۔

اس کی جلتی ہوئی آنکھیں شیرو سے ٹکرائیں اور اپنا قصور چھوٹ گئیں۔ ایک مرتبہ وہ پھر اسی کیفیت کا شکار ہو گیا جس سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہ گزر کر آیا تھا۔ اس کے لیے لڑکی سے آنکھیں ملائے رکھنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ اچانک ہی فائرنگ کی آواز دونوں کو عالم حقیقت میں واپس لے آئی۔

شیرو جھکا اور ایک جھٹکے سے حیرت زدہ لڑکی کو کندھے پر اٹھا کر بھاگنے لگا۔ اس کے ساتھی شیرو کے وہاں پہنچنے تک سڑک کے کنارے دونوں اطراف میں پوزیشنیں سنبھالنے لگے تھے۔ لڑکی کو کندھے پر اٹھائے وہ سڑک کے کنارے لگے درختوں کے اندر ہی اندر گھستا چلا گیا۔ ایک قدرے محفوظ جگہ پہنچ کر اس نے اس بوجھ سے نجات حاصل کی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے اپنی سانسیں سنبھالتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"آسیہ!" اس کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ اچانک شیرو نے جست لگائی اور اپنے ساتھ اسے بھی زمین پر گرا دیا۔ گولیاں اس سے کچھ فاصلے پر درختوں سے پتے چھیدنے لگی تھیں۔

لڑکی کے بارے لڑکی کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی ہی ہولناک تھی۔
——— شیرو نے اس کا بازو پکڑا اور وہ دونوں درختوں کے اندر ہی اندر دوڑنے لگے۔ اسے اپنے چاروں طرف سے اپنے ساتھیوں کے بھاگنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ حملہ آور مارٹر اور مشین گن فائر کر رہے تھے اور شیرو کے ساتھیوں کے پاس رائفلیں اور اسٹین گنیں اور دو مشین گنیں بھی تھیں مگر انہیں تعینات کرنے کی انہیں کہاں مہلت ملی ہو گی؟ شیرو سوچنے لگا۔

مقابلہ دیوانے کا خواب تھا اور بس۔ اس کی اپنی اکیلی جان ہوتی تو کوئی اور بات تھی لیکن قدرت نے ایک مسلمان لڑکی کی شکل میں اس پر جو بوجھ لاد دیا تھا اس نے شیرو کو بہت زیادہ ہی حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ وہ لڑکی کا ہاتھ تھامے بدستور بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

لڑکی کی حالت اب یہ تھی کہ وہ بھاگنے کی بجائے اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ شیرو حیران تھا کہ اب تک اس سمت آنے والی ہزاروں گولیوں میں سے کوئی ان میں سے کسی ایک کو کہاں نہیں لگ گئی؟ جس شدت سے وہ لوگ فائرنگ کر رہے تھے بظاہر ان کے اب تک بچے رہنے والی کوئی بات نہیں تھی۔

ایک قدرے محفوظ جگہ پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ خود اس کا سانس بھی مسلسل بھاگ دوڑ سے دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ لڑکی تو نیم مردہ سی وہیں ایک درخت کے سہارے بیٹھ رہی جب کہ شیرو اس سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں اسی راستے پر جمی ہوئی تھیں جس پر بھاگتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچے تھے' لیکن گھنے درختوں کی وجہ سے اس کی نظریں قریب ہی الجھ کر رہ جاتیں۔

"کہاں کی رہنے والی ہو؟" اس مرتبہ لڑکی سے آنکھیں ملانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی تھی۔ ان کے سوال کا جواب لڑکی کی آنکھوں سے بے اختیار بہنے والے دو آنسو تھے جنہوں نے شیرو کو بھی گڑبڑا کر رکھ دیا۔ "اوہ! معاف کرنا۔ مجھے شاید یہ نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔" شیرو اس الجھن میں تھا کہ اسے کس طرح تسلی دلاسہ دے۔

"کیا نام ہے۔ آپ نے تو میری جان بچائی ہے۔ ہم لوگ جموں کے ساتھ ہی ایک گاؤں میں رہنے والے ہیں لیکن اب..... اب وہاں کوئی بھی نہیں رہا۔" وہ سسک پڑی۔ شیرو کا دل بیٹھ گیا۔

"یہ ظالم اپنے ہی ملک کے کیا بنے گا۔ جو تمہاری کہانی ہے' وہی آج ہر کشمیری مسلمان کی ہے۔ صبر کرو۔ اب تم محفوظ ہو جب تک میں تمہارے ساتھ زندہ ہوں۔"

لڑکی نے حیرت انگیز قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور سر جھکا لیا۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے دور نکل جانا چاہیے۔ فائرنگ کی آوازیں بند ہو چکی ہیں۔ میرے ساتھی یا تو مارے گئے ہیں یا گرفتار ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ اب ادھر آئیں گے۔ اب اندھیرے میں ہم لوگ جنگل اور پہاڑ میں بھٹکتے ہوئے اجالے میں سفر کرنا اپنا آسان نہیں۔" شیرو نے اپنا منصوبہ بتایا۔

لڑکی بغیر کوئی بات کیے اٹھ کھڑی ہوئی مگر صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی حالت مزید چلنے کے لائق نہیں ہے۔

"مجھے تمہاری حالت کا احساس ہے آسیہ۔" شیرو بولا۔ "لیکن ——— وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو رہا کیونکہ آسیہ چند قدم دور نکل گئی تھی۔

وہ تین فرلانگ وہ دونوں اکٹھے چلتے رہے۔ اس دوران دونوں نے ایک دوسرے کی طرف کئی کئی مرتبہ کن انکھیوں سے دیکھا اور ایک دوسرے کی پوزیشن کا پتا لگانے کی کوشش کرتی رہی تھیں دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ چلتے چلتے اچانک ہی آسیہ رک گئی۔

"آپ کون ہیں؟" اسے شاید ہوش ہی اب آیا تھا۔ شیرو چونک پڑا۔

وہ جس سوال کی توقع بہت پہلے کر رہا تھا' وہ لڑکی نے اب اس سے پوچھا تھا۔

"میں مسلمان ہوں۔ شیرو میرا نام ہے ——— شیر محمد میں پونچھ سے آیا ہوں۔" اس نے اپنا مختصر تعارف جلدی جلدی کروا دیا۔

لڑکی کو شاید ابھی تک اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا یہ نہ۔ اس نے شیرو کو سرسری نظروں سے دیکھا تھا جو اس کے خیال سے بھارتی یا روسی فوج کی وردی میں ہو سکتی ہے۔ شیرو بھی اس کی ذہنی کیفیت کو جان گیا تھا۔

"ہم شیخ عبداللہ کی فوج کے سپاہی ہیں۔" اس نے لڑکی کو مطمئن کرنا چاہا۔ اسے یقین تھا کہ شیخ کا نام آسیہ کے لیے اجنبی نہیں ہو گا۔ شیرو کے جواب سے وہ قدرے مطمئن ہو گئی تھی۔ دونوں اب پھر خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔

"تمہیں اس علاقے کی کچھ خبر بھی ہے؟" اس نے چلتے چلتے ہی آسیہ سے پوچھ لیا۔

"نہیں۔ میں صرف سری نگر دو مرتبہ گئی ہوں اپنے چچا کے گھر۔ یہاں جموں سے کبھی باہر نکلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

شیرو نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب کم از کم لڑکی کو مضبوط ہاتھوں تک پہنچانے کا مرحلہ تو

HBC

بچالی لے جائے گا کیونکہ اس کا پتا سری نگر میں موجود ہے۔ وہ تو ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ اسے بچا کر لے جائے گا کہاں" اس نے ہوم گارڈز کی وردی پہن رکھی تھی جو ان دونوں کو کسی بھی وقت پکڑوا سکتی تھی۔ اردگرد کے ہندو دیہاتوں میں پہلے ہی سے کیمپ میں بدلی بننے والے مسلمان ہوم گارڈز کے خلاف زبردست نفرت پائی جاتی تھی کیونکہ جو کارنامہ شیرو اور اس کے ساتھیوں نے بونت میں انجام دیا' ایسے کئی کارنامے مسلمان ہوم گارڈز پہلے بھی مختلف مقامات پر انجام دے چکے تھے اور کئی جگہ ان کا ٹکراؤ ریاستی فوج اور ہوم گارڈز میں موجود غیر مسلموں سے ہو چکا تھا۔ فوج سے ابھی تک البتہ یہ پہلا ٹکراؤ تھا جو ان لوگوں نے کیا۔ شیرو کو رہ رہ کر ایک ہی فکر ستائے جا رہی تھی کہ جموں میں اس کے ساتھی اس کے منتظر ہوں گے۔ اس کے دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ خدا کرے اس کے پونچھ والے باقی ساتھی جموں تک بخیریت پہنچ جائیں۔

بونت کے تار گھر سے نکلنے والی خبر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نزدیکی علاقوں میں پھیل جاتی تھی اور شیرو جانتا تھا کہ راتوں رات ان کا "کارنامہ" بونت کے گردو نواح میں پھیل چکا ہو گا۔ دن کے اجالے میں اس کی وردی ان دونوں کے لیے موت کا پھندا ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ جلد از جلد اس مصیبت سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا' لیکن کیسے؟ یہی سوال اسے کچوکے دے رہا تھا۔

رات کا شاید دوسرا پہر تھا جب اس نے آسیہ کو لڑکھڑاتے دیکھا۔ بجلی کی سی پھرتی سے وہ آگے بڑھا اور اس نے آسیہ کو اپنے دونوں بازوؤں میں تھام لیا۔ شیرو نے محسوس کیا کہ سردی سے اس کا وجود لرز رہا ہے اور اس کی ٹانگوں پر کپکپاہٹ طاری ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ چلتے چلتے لڑکھڑا گئی تھی۔ شیرو کے سینے سے لگتے ہی آسیہ کو ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا' بالکل یوں جیسے کوئی مرغی کا چوزہ سہم کر اپنی ماں کے پروں میں چھپ جاتا ہے' لیکن اس کے اس غیر اختیاری عمل نے جو اثرات نوجوان شیرو پر مرتب کیے تھے ان کا احساس اسے نہیں ہو سکتا تھا۔ شیرو چند سیکنڈ کے لیے تو بوکھلا گیا تھا پھر اس نے اپنے سینے پر ایک گرم سا دہکتا محسوس کیا۔ وہ ان لمحات کی طوالت کا متمنی تھا' لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اسے آسیہ کو خود سے الگ کرنا پڑا۔ اس نے بغیر کچھ کہے اپنا فوجی کوٹ اتارا اور اس کی طرف بڑھایا۔ لڑکی حیرت سے اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔

"یہ لو، مجھے دے دو اور کوٹ پہن لو۔" اس نے آسیہ کو مخاطب کیا جس نے کسی [illegible] کے تحت اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔ کوٹ اتارنے کے بعد شیرو کو اپنی رگوں

میں خون منجمد ہوتا محسوس ہو رہا تھا' لیکن اس نے [illegible] سے اس نے عکریٹ کی اصل شکل اور [illegible] دی اور کوٹ پہن لیا۔ کوٹ کی لمبائی نے اس کی ٹانگوں کو بھی خاصی حد تک محفوظ کر دیا تھا۔

☆○☆

بھارت کے ساتھ الحاق کے معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کے گورنر جنرل مائونٹ بیٹن نے لکھا تھا:

"وہ خاص حالات جن کے تحت یور ہائی نس نے ہمیں حکومت سے الحاق کی درخواست گزاری ہے' اسے مدنظر رکھتے ہوئے بھارتی سرکار ریاست جموں و کشمیر اور ڈومینین آف انڈیا کا الحاق منظور کرتی ہے' لیکن میں یور ہائی نس کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مستقبل میں اگر یہ الحاق متنازعہ حیثیت اختیار کر گیا اور حکومت پاکستان یا ریاستی عوام کو اس پر اعتراض ہوا تو اس کا فیصلہ ریاست جموں و کشمیر کے عوام کی مرضی سے طے پائے گا۔ میری حکومت کی خواہش ہے کہ جونہی ہماری مسلح افواج غیر ملکی مداخلت کاروں کو باہر کرتی ہیں اور امن و امان بحال ہوتا ہے' آپ کے ہمارے الحاق کے بارے میں رائے عامہ طلب کی جائے۔"

"رائے شماری" پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے ایسی تجویز تھی جس پر بھارت میں بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ گو کہ مہاراجہ کی ماضی میں کبھی پنڈت جواہر لال نہرو سے قریبی عبداللہ کے ذاتی مراسم کی وجہ سے نہ بنی تھی اور وہ سردار پٹیل کے زیادہ نزدیک تھے' لیکن کشمیر سے اپنے جذباتی تعلق' قوم پرستی اور شیخ عبداللہ سے دوستی ایسے محرکات تھے جنہوں نے پٹیل کی بجائے نہرو کو کشمیر کی سیاست میں زیادہ حد تک ملوث کر دیا تھا۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے "الحاق" کا وقتی معاہدہ محض اپنی گدی اور حملہ آوروں سے کشمیر کو بچانے کے لیے کیا تھا' لیکن رائے شماری کا ترپ کا پتہ بیک وقت پاکستان اور شیخ عبداللہ کے ہاتھ میں دے کر جواہر لال نہرو نے اس کی سیاسی موت کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ اس کی ریاستی فوج کا کمانڈر انچیف بریگیڈیئر راجندر سنگھ جنرل انتہائی نالائق ثابت ہوا تھا۔ حکومت کا گورنر گھنشام سنگھ قبائلیوں کی قید میں پہنچ چکا تھا اور حکومت اسکاوٹ کے کمانڈر میجر براؤن نے

پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کر رہا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ سے بھاگ کر جموں پہنچنے
جانکیہ کے پہلے اپنے دانت تیز کر چکے تھے۔ تمام کشمیر اقوام متحدہ میں پیش ہونا تھا۔ بھارتی
وفد کی قیادت ریاست جموں و کشمیر کا سابق وزیر اعلیٰ گوپال سوامی آئینگر کر رہا تھا۔ بھارتی
خصوصی کرم فرمائی سے بڑا انعام مقام حاصل کر چکا تھا لیکن مہاراجہ دیکھ رہا تھا کہ پاکستانی وفد کے
لیڈر چوہدری ظفر اللہ کے سامنے سوائے آئیں ہائیں شائیں کر رہا ہے اور بین الاقوامی رائے
کیس پاکستان کے حق میں مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ نہرو کی مہربانیوں سے دیوانی خوابوں کی
قائم کردہ انتظامیہ کا سربراہ اسی شیخ عبداللہ کو بنایا جا چکا تھا۔ شیخ کی شخصیت اور اس کا سیاسی قد
اتنا بلند تھا کہ مہاراجہ لاکھ ریاستی عوام کے سامنے ہر دل عزیز ہونے کے باوجود اس سے ٹکرا
کر پاش پاش ہو جاتا۔ جواہر لال نہرو نے مہاراجہ کو مات دینے کے لیے بڑی خطرناک چال چل
تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اختیارات اس کے ہاتھوں سے چھین کر شیخ کو منتقل کر رہا تھا جس کی
حیثیت کانگریس کی کٹھ پتلی سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

۱۳ نومبر ۴۷ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے مہاراجہ ہری سنگھ کو لکھا تھا:

"میرے خیال کے مطابق پوری ریاست جموں کشمیر میں صرف
شیخ عبداللہ ہی ایسی شخصیت ہیں جو اندرونی حالات ریاست میں امن و
سکون بحال کر سکتے ہیں۔ وہ متوازن ذہن کے مالک اور مقبول ترین
عوامی شخصیت ہیں۔ ہندو مسلم فسادات روکنے میں انہوں نے فقید
المثال کردار ادا کیا ہے جو ان کے حسن تدبر کی بہترین مثال ہے۔
آپ کو ممکن ہے کہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں ان سے اختلاف
ہو، لیکن بڑے مسائل کو بہتر طریقے سے وہی حل کر سکتے ہیں۔ میں
آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ بجائے حالات مزید بگاڑنے کے آپ کسی
تیسرے واسطے کو اپنے اور شیخ عبداللہ کے درمیان لائے بغیر ان سے
معاملات طے کر لیں۔"

مہاراجہ ہری سنگھ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا کہ وہ نہرو کی اس چال کو نہ سمجھ سکتا، لیکن
حالات نے اسے جس طرح باندھ کر بھارت سرکار کے آگے ڈال دیا تھا، اس کے بعد وہ بے
بس ہو چکا تھا۔ اس کے لیے اور کوئی راستہ باقی نہ بچا تھا کہ وہ نہرو کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا
جائے۔ مہاراجہ آئینی طور پر ریاستی کمانڈر انچیف تھا، لیکن نہرو کی شہ پر شیخ عبداللہ نے یہ
حکم بھی جاری کر دیا کہ باختیار وزیر اعلیٰ ہونے کے ناطے اور امن و امان کے جلدی حصول کے

[illegible] فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں دی جائے۔ مہاراجہ نے اس [illegible]
[illegible] ایک خط میں نہرو کو لکھا:

"وائسرائے شیخ عبداللہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے جموں فوج
کو بھارتی فوج کی نگرانی میں دے دیں تو پاکستان ہماری ناکامی
تاثر لے گا کہ بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بنا رہا ہے۔ [illegible]
حالات جب کہ ہمارا معاملہ [illegible] میں چل رہا ہے۔ یہ قدم ہم
ہمارے کیس کو بڑے کمزور اور پاکستان کے کیس کو اور طاقت ور کر
دے گا۔

دوسری اہم بات بھی میں آپ کے گوش گزار کر دوں تو بہتر
ہوں گا۔ پاکستان کا کہنا ہے کہ جب رائے شماری ہو تو بھارتی فوج وہاں
سے نکل جائے۔ اگر ریاستی فوج کو بھارتی فوج کی تحویل میں دے دیا
گیا تو زبردست انتظامی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ میں آپ سے
صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اندرونی حالات میرے لیے یہ
مشورہ قابل قبول نہیں ہے۔"

وقتی طور پر مہاراجہ کی اشک شوئی کے لیے ان کی بات تسلیم کر لی گئی لیکن بھارت
سرکار نے کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بنانے کی سرگرمیاں جاری رکھیں اور شیخ عبداللہ کی طرف
سے مسلسل ایسے بیانات آنے لگے جن میں ریاستی فوج پر زبردست تنقید کی جاتی تھی۔

اس دوران مہاراجہ کے اکلوتے بیٹے یوراج کرن سنگھ کے کولہے کی تکلیف اتنی شدت
اختیار کر گئی کہ ولی عہد کو علاج کے لیے امریکہ بھیجنا پڑا۔ اب مہاراجہ بالکل اکیلا رہ گیا تھا
اور اس کے گرد اکرد بھارت نواز کشمیریوں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ولی عہد کی بیماری نے
تو اسے ذہنی طور پر بالکل مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ مہاراجہ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی
تھی۔ ایک روز اس نے سر عام ہی عمائدین سے معذرت کر لی اور رات اکیلے گزاری۔
ساری رات اس مسئلے پر سوچ بچار کرنے کے بعد وہ حتمی فیصلے پر پہنچا تھا کہ بھارت کے
ساتھ معاہدۂ الحاق ختم کر دیا جائے لیکن کیسے؟

یہ سوال اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس نے "الحاق" کر کے سانپ کی بانبی میں ہاتھ دے
دیا تھا۔ اب کچھ بھی کرنا اس کے اختیار میں نہ رہا تھا۔ اس نے دسمبر کے الوائل میں اپنے
"خود ساختہ دوست" اور بھارت کے وزیر ریاست جموں و کشمیر امور، الطہ سردار پٹیل سے

HBC

ہم بڑی ہی پراگندہ خیالی اور غصے کے عالم میں تھا کہنے

"میں کل ساری رات ایمانداری سے سوچ بچار کرنے کے بعد
اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بھارت کے ساتھ معاہدۂ الحاق سے دست
کش ہونے کا اعلان کر دوں۔ تمہارا معاہدہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں،
مشروط تھا اور مجھے خطرہ ہے کہ بھارتی فوج کبھی بھی حملہ آوروں سے
کشمیر کے زیر قبضہ علاقے خالی نہیں کروا سکے گی۔ اس صورت میں
اگر ہم سلامتی کونسل کے فیصلے کی بھینٹ آپ کی مہربانیوں کے طفیل
چڑھ گئے تو ظاہر ہے کشمیر کی قسمت کا فیصلہ پاکستان کے ہاتھ میں دے
دیا جائے گا۔ اندریں حالات میں اس معاہدۂ الحاق کو بیکار سمجھتا ہوں۔
میں جانتا ہوں کہ عارضی طور پر پاکستانی ہمیں پر کشش مراعات پیش
کریں گے، لیکن مسلمان میرے نزدیک کبھی قابل اعتبار نہیں رہے۔
مجھے غم ہے کہ حکومت پاکستان ڈوگرہ راج ختم کر دے گی اور ریاست
کے تمام ہندو سکھ قتل کر دیئے جائیں گے، لیکن معاہدہ ختم ہونے کی
صورت میں یہ ضرور ہو گا کہ اس طرح کو کہ میں بھارتی مسلح افواج
کی خدمات سے محروم ہو جاؤں گا، لیکن مجھے یقین ہے کہ میں ریاستی
افواج اور رضاکارانہ طور پر یہاں دی جانے والی افواج کی کمان اگر خود
سنبھال لوں تو آپ کے کسی جرنیل سے زیادہ موثر انداز میں اور خوش
اسلوبی سے حملہ آوروں سے نمٹ سکوں گا کیونکہ میں اپنے عوام کو
آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ اگر موجودہ صورت حال جو آپ نے شیخ
عبداللہ کو میرے سر پر مسلط کر کے پیدا کر دی ہے، میں کوئی تبدیلی
نہ لائی گئی تو میں ریاست چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ اس طرح کم از کم
میرے عوام مجھ سے کوئی امید تو نہ رکھ سکیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے
کہ میں جاتے وقت عوام کو اعتماد میں لے کر یہ ضرور بتاؤں گا کہ مجھے
اپنے لوگوں کو کن حالات میں چھوڑنا پڑا۔"

مہاراجہ ہری سنگھ کا یہ خط بکل بن کر گرا اور اس نے بھارتی ایوانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔
سردار پٹیل اور پنڈت نہرو کے درمیان آپس میں ٹھن گئی کیونکہ سردار پٹیل شروع ہی سے
حیدر آباد دکن کی طرح ریاست پر بھی عسکری قبضے کے حق میں تھا۔ وہ نہرو کی کشمیر میں

کردہ سفارتی پالیسی کا سخت خلاف اور نہرو سے شدید نفرت کرتا تھا۔ صورت حال کی
نزاکت کا اس وقت دونوں میں آپس میں کوئی سے دوسرے کو ہوا لگنے نہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ
وقتی طور پر مسئلہ کشمیر کے حل ہونے کی وجہ سے دونوں میں کشیدگی ختم ہو گئی تھی۔ سردار پٹیل
سردار نہرو کی اس غیر صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی تعریف کرتے تھکتے تھے۔
وہ کل کی ہدایت پر سردار پٹیل نے "اپنے دوست" ڈوگرہ مہاراجہ کو مسلمان سے اور
اپنے ارادے سے باز رکھنے کے لیے مختصر خط لکھا۔

"کشمیر کے حالات اور بین الاقوامی رائے عامہ کا بھی گہرا علم
ہے۔ میں بے جھجک سے اقوام متحدہ میں ہونے والے کسی بھی فیصلے کا
احترام کروں گا۔ آپ مطمئن رہیے اور بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں آپ
کا دوست آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اور کشمیر کی شان و شوکت
کو دوبارہ بحال کرنے میں ہم کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ امید ہے
آپ کی پریشانی اس یقین دہانی کے بعد ختم ہو گئی ہو گی۔"

اور بے وقوف مہاراجہ چانکیہ کے چیلوں کے چکر میں آ کر خاموش ہو گیا۔

☆○☆

مسلسل دھماکوں اور پھر ایک دم زوردار دھماکے کی آواز سن کر محمود اور سنبھل خان نے
بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کا دوست اپنا مشن مکمل کر چکا ہے۔
"مرحبا!" سنبھل کے ہونٹوں پر لرزش ہوئی۔
"سبحان اللہ کہ امیر خان اپنی مراد کو پہنچا۔" دوسری طرف بیٹھا محمود بڑبڑایا۔
پلان کے مطابق امیر خان کے بچ کر آ جانے کی صورت میں اسے کور فائر دینا تھا، پھر
اس کے گن پر حملہ آور ہونے سے پہلے دشمن اس کی طرف سے باخبر ہو جائے تو اس کی
توجہ ہٹانے کے لیے فائرنگ کرنا تھا۔ اب دونوں ہی صورتیں ختم ہو چکی تھیں اور ان کی
توپ اپنے توپچیوں سمیت لوہے کے پگھلے ہوئے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھی اور ان کا دوست
انہیں کوئی زحمت دیئے بغیر سرخرو ہو کر خدا کے حضور پہنچ چکا تھا۔
دونوں الگ الگ ایک دوسرے کی مخالف سمت سے سنبھل سنبھل کر نیچے اتر رہے
تھے۔ اچانک فضا روشنی کے پھٹتے گولوں سے روشن تر ہونے لگی۔
---بھارتی فوج کے افسران نے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ میڈیم گن پر حملہ کرنے والا
کوئی اکیلا شخص نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھی بھی یقیناً یہیں کہیں موجود ہوں گے۔ ان کی

نشانہی کے لیے اب "ویری لائٹ راؤنڈز" فائر کیے جا رہے تھے۔ سجاول نے اپنے بائیں ہاتھ کچھ فاصلے پر مدد کو پھلانگ لگا کر ایک پتھر کی اوٹ میں لڑھکتے دیکھا تھا۔ اس کے تعاقب میں پھٹنے والی گولیاں سیدھی لکیر بناتی ہوئی پتھر تک پہنچ چکی تھیں۔ بہادری کا ایک ایک اور ان کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

سجاول دیوانہ وار اپنے نزدیکی پتھر کی اوٹ لینے کے لیے بھاگا۔ پتھر کے نزدیک پہنچتے ہی اسے اپنے دائیں پہلو میں انگارے دہکتے محسوس ہوئے۔ ایل ایم جی کی دو تین گولیاں الٹھی اس کے جسم میں گھس گئیں۔ سجاول تلملا کر بائیں بازو کے سہارے گر پڑا' لیکن دوسرے ہی لمحے وہاں موجود پتھروں کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہاتھ کسی ہوئی محل کے تشنج اپنے پوچ میں رنگ گیا تھا۔ پھر اس نے دانتوں کی مدد سے پن باہر نکالی اور بایاں ہاتھ دائیں پہلو پر جما کر دائیں ہاتھ سے دستی بم اپنے سے چند گز کے فاصلے پر ٹاک اکلتی اس مشین گن کی طرف اچھال دیا جس کی نالی سے شعلے نکل کر مدد کی طرف لپک رہے تھے۔ زوردار دھماکے کی آواز میں اس مشین گن کی فائرنگ کی آواز بھی شامل تھی جس نے اچانک ہی سجاول کی پشت سے سر باہر نکالا اور اس کو نگل لیا۔

مدد نے سجاول کو گرتے اور پھر لڑھکنیاں کھا کر ڈھلوان سے نیچے پھسلتے دیکھا۔ "سنگی!" وہ گلا پھاڑ کر دیوانوں کی طرح چلایا۔ "میں ابھی آیا۔"

"چارج!" اس کے گرداگرد پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

مدد نے اپنے چاروں اطراف سے فوجیوں کو جنگی تربیت میں اس طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ بھارتی فوجیوں کے نزدیک حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ لوگ اپنی گنوں سے اس سمت اندھادھند فائرنگ کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔

---مدد پر دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں گرنیڈ تھام رکھے تھے۔ وہ اٹھ کر اس سمت بھاگا جہاں سجاول کی لاش لڑھک کر نیچے گری تھی۔ دونوں گرنیڈ اس نے یکے بعد دیگرے اپنے سامنے ہوا میں اچھال دیئے تھے جو سامنے سے "چارج" کرتے فوجیوں کے سروں پر پھٹے۔ اس کے ساتھ ہی درجنوں گولیاں مختلف اطراف سے اس کے جسم میں گھس گئیں اور وہ عین اس جگہ منہ کے بل جا گرا جہاں سے اس کا ساتھی سجاول لڑھک کر نیچے گرا تھا۔ دونوں کے جسد خاکی ایک دوسرے سے محض دو تین فٹ کی دوری پر تھے۔

ان کی لاشوں تک دوڑ کر پہنچنے والوں میں سب سے آگے آرمی انٹیلی جنس کا میجر ورما

ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا جس کی نال سے ابھی دھواں نکل رہا تھا۔ وہ ہے
دونوں لاشوں پر باری باری جھکا تھا' لیکن یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا
دونوں بھی زندگی کا قرض چکا چکے تھے۔
"چارج" کے سیلاب سرفروش جان سے گزر گئے اور باقی ماندہ لوگوں نے اور
بھیڑیا دشمنوں کی طرح ان کے مردہ جسموں کو نوچنا شروع کر دیا۔
ان کی تلاشی لو۔" اس نے اپنے دائیں بائیں کھڑے مستعد جوانوں کو حکم دیا۔ "اور وہ
جو زندہ ہو' وہ مجھے دفتر میں پہنچا دو۔" اور وہ اپنی ٹانگ پر لگے زخم سے ٹپکتا ہوا خون دیکھ

☆○☆

چوٹی کی طرف آنے والے راستے پر ایک کچے نالے پر بنا ہوا خاصا لمبا پل بھارتی
کے ساتھیوں نے اڑا دیا تھا اور وہاں پہلے پہاڑی سلسلے میں تاخیر ہو گئی۔ دشمن کی آمد
کے پیش نظر
فوجی تنظیم و تربیت کے مطابق ہراول دستوں سے پہلے دشمن کی ایک چوکی پاکستانی
لینے آئی اور جیسے ہی وہ لوگ پل کے نزدیک پہنچے' جنرل کے ساتھیوں نے ان پر جہنم کا دہانہ
کھول دیا---- بھارتی سورما ایک گاڑی اور تین لاشیں وہیں چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ ان کی
روانگی کے تھوڑی دیر بعد ہی ہراول دستوں کی آمد شروع ہو گئی' لیکن ان کا حشر بھی پہلے
آنے والوں سے مختلف نہیں ہوا تھا۔ دشمن کی جب کوئی پیش نہ چلی تو اس نے حسب
روایت اپنے سامنے والے پہاڑی سلسلے پر اندھا دھند گولا باری شروع کر دی۔ اس کے ساتھ
ہی ان کی فضائیہ بھی حرکت میں آ گئی۔

سورج غروب ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہا' پھر یکلخت پر سکوت طاری ہو گیا۔ بالکل ایسا
ہی سناٹا جو کسی بڑے طوفان کی آمد کا پیش خیمہ ہو۔ جنرل کے نفس بھر سرفروشوں نے پہرے
بدل بدل کر یہ رات آنکھوں میں کاٹی۔ اس دوران وہ رات بھر گاڑیوں کے شور اور توپوں کی
منتقلی کی آوازیں سنتے رہے' لیکن نالے کو عبور کر کے دشمن پر شب خون مارنے کی حسرت
ہی دل میں لے کر بیٹھے رہے کیوں کہ ان کی نفری نہ ہونے کے برابر تھی اور جنرل کو اپنے
ساتھیوں میں سے کسی ایک کی بھی کمی گوارہ نہیں تھی کیونکہ ان میں سے کسی ایک کے بھی
اپنی جگہ سے ہٹ جانے کی صورت میں بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا اور عین ممکن تھا کہ اس خلا
کے بیچ میں سے دشمن راستہ بنا کر اس طرف آ نکلتا۔

اور پھر اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ ان کے پاس اسلحہ کی کمیابی تھی۔ اول تو ان کے

پس برق رفتاری سے حملہ کرنے اور زیادہ نقصان پہنچانے والے ہلکے ہتھیار تھے۔ نہ ہی ان کو ایک دو مارٹر اور مشین گنیں تھیں۔ انہیں جنرل طارق نے اس طرح "میکموہن لائن" کو مضبوط کرنے کے لئے وہاں سے ہٹانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

علی الصبح بھارتی فوج نے زبردست حملہ کیا۔ حملے کا زیادہ تر زور جنرل کے دائیں پہلو پر تھا۔ جنرل کے بیٹ مین پوزیشن بدل بدل کر فائرنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے مارٹروں کا رخ بدل کر اتنی تیزی اور برق رفتاری سے فائرنگ کروائی کہ بھارتی فوج کو یہی گمان گزرنے لگا کہ مقابلے پر کم از کم تین چار بٹالین فوج آ گئی ہے۔ ابھی تک آرٹلری (توپ خانہ) کا فائر نہ ہوا تھا۔ دوپہر کے بعد دشمن نے دائیں پہلو پر جہاں اس کی دانست میں کسی کے اب تک زندہ بچ رہنے کا امکان نہیں تھا کیونکہ دشمن نے مسلسل دائیں طرف ایک مخصوص علاقے پر گولہ باری کی تھی اور اب اس کو "صاف میدان" جان کر اس سمت سے انفنٹری (پیدل فوج) کے ساتھ بلہ بول دیا۔

جنرل صبح سے اب تک انفنٹری ہی کے حملے کا خطرہ تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بڑی استقامت اور پامردی سے اب تک دشمن کی زوردار فائرنگ کے دھماکے مورچوں میں دبک کر اور کانوں میں انگلیاں لے کر سنے تھے۔ توپ خانے کی گولہ باری کے سامنے ان کی رائفلیں اور مشین گنیں بیکار تھیں اور وہ لوگ اسلحہ پھونکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

جنرل طارق ایک محفوظ آڑ میں آنکھوں سے دوربین لگائے بارود اور دھوئیں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا جب اس نے دھوئیں اور گرد و غبار کے بادلوں میں سے "چارج — چارج!" پکارتے پیدل جوانوں کو اپنے دائیں طرف بڑھتے دیکھا' تو ایک پراسرار سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقص کر گئی۔ اس نے اس طرح سکھ کا سانس لیا جیسے اس کی اب تک کی محنت کا معاوضہ مل گیا ہو۔ اپنے بائیں ہاتھ بیٹھے اپنے نائب کو جنرل نے احکامات جاری کیے جو دوسرے ہی لمحے پہاڑی سلسلے میں غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل نے بھی مشین گن اور دستی بموں کا تھیلا سنبھالتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا پہاڑی سلسلے کے اندر ہی اندر ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر گیا تھا۔ اب وہ اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں پہاڑی راستے پر دشمن کے ہراول دستے پہنچنے ہی والے تھے۔

---بمشکل تین چار منٹ بعد ہی ان کی آمد ہو گئی۔ ان کی پہلی سیکشن کو جنرل نے گزر جانے دیا اور جیسے ہی دوسری کے بعد تیسری سیکشن اس کی زد میں آئی' انتہائی تیز رفتاری سے جنرل نے ان پر چند گز کے فاصلے پر گرنیڈ پھینکے۔

[illegible] گرنیڈ وہاں سے گزرنے والی [illegible] سپاہیوں کی چیخ پکار سے لرز سے گئے۔ [illegible] ہاتھوں سے چور سپاہیوں کی چیخ پکار سے لرز سے گئے۔ [illegible] لیے جنرل طارق کی آستین گن کی سرخ اور خونی دہانہ [illegible] دشمن میں سے بمشکل ہی کوئی سپاہی بچ کر [illegible] پہاڑیوں میں [illegible] پہاڑی کی چیخ پکار میں اب پھاٹوں کے ولولہ انگیز نعرے گونجنے لگے تھے۔ [illegible] دشمن کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے اور اپنے [illegible] اپنی وہ تین پلاٹونوں کا صفایا کروانے کے بعد دشمن نے [illegible] تھوڑی سی قربانی دے کر اس طرف سے [illegible] نے اب اپنا منصوبہ بدل لیا تھا۔ وہ لوگ اوڑی سے اس سمت [illegible] کی سمت سے پونچھ تک پہنچنا چاہتے تھے جہاں بھارتی فوج [illegible] تھی اور وہ لوگ روز بروز اس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ دوسری طرف [illegible] نے کنٹرول مظفر آباد تک کا علاقہ خالی چھوڑنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس طرف اپنی کچھ کمپنیوں کو لگا دیا تھا کہ وہ حملہ آوروں کو مصروف رکھیں اور مناسب موقع ملنے پر مظفر آباد کی سمت ایڈوانس بھی کر سکیں۔

☆○☆

چھ دن تک جنرل طارق اپنے سرپلندوں کے ساتھ زندگی اور موت کی یہ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ اس کی نظریں اس دوران پاکستان سے اس طرف آنے والے راستوں پر جمی رہیں کہ ممکن ہے اب بھی کوئی ان کی مدد کو آ جائے' لیکن کشمیر کے برف زاروں میں جنرل طارق کی مدد کو کوئی نہ آیا — اب اس کی آخری امیدیں مقامی آبادی سے تھیں۔ اس نے اپنے ایک جانباز کو جو زخمی ہو چکا تھا' اپنی مشین گن دے کر ان آبادیوں کی طرف روانہ کیا تھا کہ وہاں سے کشمیری رضاکاروں کی کمک روانہ کرے۔

---چھ دن موسم اور بھارتی فوج کی اندھا دھند گولہ باری کا مذلب جھیلنے کے بعد ساتویں روز جنرل طارق کو صرف پچھتر رضاکار اردگرد کی آبادیوں سے میسر آئے۔ ان میں سے زیادہ تعداد سابق فوجیوں اور آئی این اے کے سپاہیوں کی تھی۔ اس دوران جنرل اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ اعصاب مسلسل گولہ باری کا سامنا کرنے سے تڑخنے لگے تھے۔ وہ لوگ جنونی کیفیت میں لڑ رہے تھے۔ جنرل جس کی ساری زندگی میدان کارزار میں گزری تھی' بخوبی اس بات کو محسوس کرنے لگا تھا کہ اگر مزید دو تین روز تک انہیں

لڑی میسر نہ آئی تو اس کے تمام ساتھی وہ اب نفسیاتی مریض بنتے جا رہے تھے' وہ آخر ان کے اعصاب جواب دے جائیں گے۔

انہوں نے پل بھر کے لئے "کمانڈ" کی پوزیشنیں بدل بدل کر فائرنگ کی اور موقع ملتے ہی نقب لگا کر پہاڑی راستوں پر دشمن کے کنوائے میں ایک آدھ پیچھے رہ جانے والی یا قافلے سے کٹی ہوئی گاڑی سے اسلحہ بھی لوٹا تھا۔ ان چھبیس رضاکاروں کی ساتھیں روز گھر سے جنرل اور اس کے ساتھیوں کے لئے کھانے بھر سے بلند ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی باغ اور پونچھ کے دیہاتی علاقوں سے بھی پیغامات آ رہے تھے کہ وہاں سے سرفروشوں کی ٹکڑیاں اس سمت چلی آ رہی ہیں۔ خود آزاد کشمیر کی بے وسیلہ حکومت بھی ان کے لئے رضاکار اور اسلحہ بھیج کر رہی تھی۔ جنرل چاہتا تھا کہ بھارتی فوج کے پڑھتے ہوئے طوفان اور اسلحہ کے انبار کے سامنے ننگی بھر سرفروش کوئی حیثیت نہیں رکھتے' خود باغ اور پونچھ میں بھی ان کی پوزیشن ابھی مستحکم نہیں ہوئی تھی--- یعنی اسے لڑنا تھا۔ آخری گولی اور آخری جوان تک---- اور وہ لڑا۔

جنرل کا طریق جنگ یہ تھا کہ چھپ کر دشمن پر نقب لگاتا اور تیزی کے ساتھ پوزیشن بدل بدل کر یہی عمل دہراتا چلا جاتا۔ اس کے ساتھی ایک پہاڑی سے اچانک حملہ کرتے اور چند منٹوں بعد ہی بھاگ کر دوسری پہاڑی پر پہنچ کر یہی عمل دہراتے۔ اس طرح دشمن اسی دھوکے میں رہتا کہ سامنے کی تمام پہاڑیاں حملہ آوروں سے بھری ہوئی ہیں اور اس نے تین مشین گنیں دے کر فورا دوں کو جن میں اب ساڑھے تین سو مزید پاکستانی رضاکار بھی شامل ہو چکے تھے' پہاڑیوں میں بھیجا تھا۔

لیکن وہ لوگ جو شوق جہاد اور جذبے کے عالم میں یہاں چلے آئے تھے' عملی میدان میں بالکل ناکارہ ثابت ہوئے۔ دشمن کے نزدیک جانے سے ان کی جان جاتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے حملہ تو کیا' لیکن جب دشمن کی طرف سے جوابی فائرنگ شروع ہوئی تو وہ لوگ پوزیشن بدلنے کی بجائے دم دبا کر بھاگ اٹھے۔ دو تین مرتبہ جنرل طارق نے ان کا حوصلہ بڑھا کر انہیں آگے روانہ کیا' لیکن ہر دفعہ وہ لوگ یہی کارنامہ انجام دیتے۔ بالآخر میجر اکرم اور ان کے دو تین ساتھی ہی وہاں رہ گئے تھے۔ جنرل نے ان بزدلوں کو ضائع کرنے کے بجائے ان کا ایک اور استعمال نکالا اور انہیں پہاڑی سلسلے میں دور دور تک پھیلا دیا۔ انہیں ہدایت دی کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھے آگ کا فائر کرتے رہیں۔ اس طرح کم از کم دشمن "تعداد کے دھوکے" ہی کا شکار ہو جائے۔ یہ حکمت عملی کسی حد تک کامیاب رہی۔ گو کہ وہ لوگ دشمن کی فائرنگ سے محفوظ تھے' لیکن جب کبھی کسی بزدلی گن کا کوئی ایک آدھ گولہ ان کے

[illegible] کوئی جہاد ان کے سروں سے [illegible] ہو کر [illegible] ان میں سے [illegible] کو جنرل نے دریا کے کنارے [illegible] کے ساتھ بٹھا دیا کہ وہ کم از کم وہاں سے [illegible] دشمن سے اپنی حفاظت کر سکیں۔ اس طرح ہر اول کی فائرنگ کرنے کے لئے نقصان پہنچاتے رہیں۔ اس سے [illegible] میں تین سو گز کے فاصلے سے دشمن [illegible] پہاڑ سے [illegible] مجاہدوں" نے دشمن پر ایک گولی بھی نہ چلائی۔ الٹا میں [illegible] فائرنگ کی تو دشمن کا جوابی فائر بھی آنے لگا۔ پانچ ان میں سے بھی صدمے کا شکار ہو کر واپس بھاگ گئے۔ اس دوران سواتی فوج کے [illegible] تمام مجاہد واپس بھاگ گئے۔ اس دوران سواتی فوج کے [illegible] کو [illegible] ان لوگوں کو باقاعدہ فوج کے خلاف لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور صرف جوش جذبہ ہی تاکہ ان کو یہاں لے آیا تھا۔ اس نے ان کو دشمن سے براہ راست ٹکرانے کے بجائے انہیں جگہ جگہ مجاہدوں کے فرار کے راستوں کی ناکہ بندی کے لئے روانہ کر دیا اور انہیں ایسے پہاڑی ناکوں پر کھڑا کر دیا جہاں سے یہ لوگ واپس بھاگ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساڑھے تین سو مجاہدین سارنے کے سارنے واپس بھاگ گئے۔ جاتے ہوئے وہ اپنی رائفلیں بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اس دوران مختلف ٹولیاں رضاکاروں کی آتی اور جاتی رہیں۔ ان میں سے ایسے "مرد مومن" تھے کہ ایک بار محاذ کا منہ دیکھنے کے فوراً بعد ہی ان کا جذبہ جہاد سرد پڑ جاتا اور وہ بھاگ جاتے۔ جنرل کی پالیسی "ضرب لگاؤ اور بھاگو" تھی جب کہ یہ لوگ "دیکھو اور بھاگو" پر عمل پیرا تھے۔

مجاہدین آتے اور جاتے رہے۔ ان کی آمد لاریوں کے ذریعے ہوتی تھی اور وہ فرار ہونے کے لئے پہاڑیوں کے اندر خفیہ راستے استعمال کرتے تھے۔ اس سے جنرل کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ دشمن غلط فہمی کا شکار رہا۔ دشمن کے جاسوس اسے یہی اطلاع دیتے کہ مجاہدین آتے اور پہاڑی سلسلے میں پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی روانگی ان جاسوسوں کی نظر سے چونکہ اوجھل رہتی تھی' اس لیے وہ اسے نہ دیکھ سکتے تھے اور بھارتی ہائی کمان کی بوکھلاہٹ میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ تاہم ایک فائدہ ضرور حاصل ہوا کہ ان آنے والوں میں سے ایسا عنصر ابھرنے لگا کہ جو لوگ محض جذباتیت کے زیر اثر نام نہاد جذبہ جہاد کے بجائے سنجیدگی سے اس جنگ آزادی کو جاری رکھنا چاہتے تھے' انہی باعمل لوگوں میں وہ ۷۵ مجاہدین شامل تھے کو کشمیر کی پہلی مظفر آباد بٹالین بنے اور سابق ریاست کشمیر کا لیفٹیننٹ قدرت اللہ ان کا پہلا بٹالین کمانڈر منتخب ہوا۔

HBC

اس دوران پٹھانوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ انہوں واپس بھاگ کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اس نے ان کی شاندار عسکری روایات پر سیاہی پھیر کر رکھ دی ہے۔ وہ لوگ اپنے فرار پر شرمندہ تھے اور کفارہ ادا کرنے کے لیے جلد از جلد محاذ پر واپس جانا چاہتے تھے۔ ان کی پیش کش جب جنرل طارق تک پہنچی تو اس نے انتہائی سوچ بچار اور اپنے ساتھیوں سے طلع مشورے کرنے کے بعد صرف تین سو محسودی قبائلی کو ان کے سردار گلاب خان کی سربراہی میں واپس آنے کی اجازت دی۔

جنرل "نذری دل" کی آمد اور اس کے نتائج دیکھ چکا تھا اور اب وہ اتنے ہی "مجاہدین" چاہتا تھا جنہیں باآسانی کنٹرول کیا جا سکے۔ پٹھانوں کو شکایت صرف یہ تھی کہ آخر پاکستانی فوج کیوں جنگ میں حصہ نہیں لیتی اور یہی ان کی ناراضی اور فرار کا سبب تھا۔ جب جنرل طارق نے گلاب خان کے سامنے ساری صورت حال رکھی اور اسے معاملات کی نزاکت کا احساس دلایا تو حقیقت پسند اور عظیم کردار کے مالک گلاب خان نے اس کی مرضی پر صاد کیا اور اس کے زیر کمان اپنے ساتھیوں سمیت لڑنے پر تیار ہو گیا۔

جنرل پٹھانوں کی جنگی استعداد سے واقف تھا اور اسے بخوبی علم تھا کہ اب تک مفتوحہ علاقہ انہی لوگوں کی قربانیوں کا باعث ہے۔ اس نے اگلے روز ان لوگوں کو یہ مشن سونپا کہ وہ دشمن کی پوسٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جنوب کی طرف اوڑی سے پونچھ کو جانے والی سڑک پر پندرہ میل دور نکل جائیں۔ جنرل نے پونچھ کی طرف کمک لے جانے والے بھارتی فوج کے دستوں کی روانگی کے راستے گلاب خان کو دکھا کر ایک مخصوص مقام کی نشان دہی کرتے ہوئے حکم دیا کہ یہاں وہ لوگ بھارتی کمک پر گھات لگائیں۔

گلاب خان اور اس کے جیالوں نے دوسرے ہی دن بھارتی کنوائے کو دبوچ لیا۔ یہ لوگ پہاڑیوں میں گھات لگانے کی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ وہ فرشتہ اجل بن کر دشمن پر ٹوٹے۔ اس کے ۳۶ بڑے ٹرک جلا کر راکھ کر دیئے' سینکڑوں فوجیوں کو تہ تیغ کیا اور ہتھیاروں کی بڑی تعداد' بے تار ایمونیشن' وائرلیس سیٹ' فوجی گرم کپڑے' فیلڈ ٹیلی فون اور چھ تین انچ مارٹر گنیں اٹھا کر دوبارہ ۱۵ میل کا فاصلہ طے کر کے بحفاظت جنرل اور اس کے ساتھیوں سے آ ملے۔ ان کی اس فتح مندانہ مراجعت نے محاذ پر موجود جوانوں میں برقی رو دوڑا دی۔ سارا محاذ "اللہ اکبر" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی پٹھانوں کی للکار گونجی "دا کافروں پسے استو والا گا" (کافروں کا تعاقب کرو)' "کافرا دبا" (کافروں کو مار

دو)۔ جنرل طارق نے پیش قدمی کا پاکل قبائلی انداز اپنایا تھا۔ وہ دشمن سے ٹکراؤ سے بچتے ہوئے اس کے پہلو کو چیرتے ہوئے آگے نکل جاتے تھے۔ اس حکمت عملی سے دشمن پر دہشت طاری کر دی۔ وہ لوگ خوفزدگی اور بدحواسی کے عالم میں اپنے بھاری ہتھیار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ان کے تعاقب میں ان کا ہوا اکھیڑنے والے پٹھانوں نے پونچھ کا بازار سرد نہ پڑنے دیا اور جنرل طارق دشمن کو رگیدتا ان علاقوں پر قابض ہوتے ہوئے پونچھ کی دفاعی فصیل پر دستک دینے لگا۔

☆○☆

دسمبر ۱۹۷۱ء کا آغاز:

قریباً چار ہفتے پہلے یہ محاذ ڈیکلیئر ہو چکا تھا اور بھارتی سورما پونچھ اور پونچھ تک پیش قدمی کر گئے تھے۔ جنرل نے انہیں پونچھ سے کاٹا' چکوٹھی سے پیچھے دھکیلا اور اوڑی کو میدان کارزار منتخب کر لیا۔ بھارتی فوج پر اس قدر دہشت طاری تھی کہ چکوٹھی اور اوڑی کے درمیان کا سارا علاقہ خالی کر کے وہ لوگ شہر کی سمت جانے والا پل توڑتے ہوئے شہر میں بند ہونے پر مجبور ہو گئے۔

قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ چند روز پہلے جنرل کشمیر کو بچانے کے لیے پل توڑ رہا تھا اور اب اس کا مدمقابل اپنی جان بچانے کے لیے یہی عمل دہرا رہا تھا۔ تین سو پٹھان جیالوں کی آمد نے محاذ کا نقشہ دنوں میں بدل کر رکھ دیا تھا۔

جنرل مطمئن ہو کر چکوٹھی لوٹ آیا۔ اس نے اپنی توجہ اب مقامی پشتونوں کو منظم کرنے اور ٹریننگ دینے پر مرکوز کر دی۔ اس کام میں کئی ہفتے درکار تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ اس دوران بھارتی محاذ خالی دیکھ کر واپس نہ آ جائیں۔ دشمن کو "مصروف اور خوفزدہ" رکھنا بھی ضروری تھا۔ جنرل نے مزید پٹھان مجاہدین کو محاذ پر بلا لیا۔ انہیں اپنی کمان میں لے کر جنرل نے پونچھ کی طرف ان احکامات کے ساتھ روانہ کیا:

"پونچھ روڈ کو دشمن کنوائے کا مرگھٹ بنا ڈالو۔"

"پونچھ کے محاصرے کو مضبوط کرتے ہوئے شہر پر شب خون مارو۔"

مقامی رضاکاروں کی ٹریننگ پر کچھ ساتھیوں کو مامور کر کے جنرل پٹھانوں کے ایک گروپ کے ساتھ اوڑی کی طرف نکل گیا۔ اس کی منزل "ہجوہلن" تھی۔ سڑک چھوڑ کر سات ہزار فٹ بلند سلسلہ ہائے کوہ کو مسخر کرتا اور منزلوں پر منزلیں مارتا بدر و حنین کا یہ مسافر اپنے

سرفروشوں کے ساتھ تین تین فٹ برف پر پیدل سفر کرتا دو دن بعد گوہلن و دشمن کے سر پر
اچانک جا پہنچا۔ طارق کی اچانک آمد نے دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دی۔ سنبھلتے ہوئے ہی
دشمن کے تین اسکوازرن اس پر حملہ آور ہوئے۔ دشمن کے ایئرکرافٹ پر سے باندھ کر لائے
اور ان پر اپنی مشین گنیں اور بم خالی کر کے چلے جاتے۔ دوبارہ پھر لوٹتے اور یہی عمل دو سر
پہر تک دہراتے رہے۔

"گوہلن" کی اونچی نیچی سرزمین' چٹانوں اور درختوں سے بھری پہاڑیوں نے اپنی گود
مجاہدین پر وا کر دی تھی۔ وہ اس میں سما گئے اور یہ معجزہ ہی تھا کہ کسی ایک پٹھان کو بھی کراہ
زخم نہ آیا۔

دوسری طرف "آکاش وانی" گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی تھی کہ تین سو قبائلی حملہ آوروں
کو ان کی "وایو سینا" (ہوائی فوج) نے مار ڈالا ہے۔

شام ڈھلنے سے قریباً" آدھ گھنٹہ پہلے قبائلی مجاہدین نے جنرل طارق کے زیر کمان شمال
مغرب اور جنوب میں پوزیشنیں سنبھال لیں۔ جنرل نے ایک پارٹی کو ہراول کے طور ریکی
کرنے کے لیے آگے بھیجا تاکہ وہ لوگ عقب میں جا کر سری نگر سے اوڑی کو آنے والی
سڑک بند کر دیں۔ خود ایک گروپ کے ساتھ اوڑی شہر کی فصیل کے قریب ہو کر بیٹھ رہے
تاکہ موقع پاتے ہی اپنے گروپ کے ساتھ اوڑی میں داخل ہو جائیں۔

مرکزی حملہ اگلے روز بارہ بجے ان لوگوں نے اوڑی پر کرنا تھا۔ جنرل کی پلاننگ بڑی
شاندار تھی۔ اس نے فوج کے بارہ رضاکاروں کے سپرد وہ چھ ۳" کی مارٹر گنیں نصب کر رکھی
تھیں اور ڈھائی سو گولے انہیں سونپے تھے کہ وہ لوگ ٹھیک دن کے بارہ بجے ان کا اشارہ
ملنے پر اوڑی کیمپ کے عین وسط میں اچانک گولہ باری شروع کر دیں۔

جنرل طارق نے یہ مارٹر گنیں ایسی محفوظ اور ایسے زاویئے سے لگا رکھی تھیں کہ وہ اپنی
جگہ سے ڈھائی ہزار گز دور تک کے ٹارگٹ کو ہٹ کر سکتی تھیں۔ خود وہ گنوں سے قریباً"
ہزار گز دور ایک ایسے مقام پر بیٹھ گئے جہاں سے دشمن کا ہر کیمپ بخوبی نظر آ رہا تھا۔

پلان کے مطابق بارہ بجے ان مارٹروں کی اچانک گولہ باری کے بعد قبائلیوں نے رائفلوں
کا منہ کھولنا اور دشمن پر گھات لگانا تھا' پھر کھلا حملہ کرنا تھا۔ جن لوگوں نے قبائلیوں کے "جام
سے" کا نظارہ کیا ہے' ان کے رونگٹے اب بھی اس حملے کے تصور ہی سے کھڑے ہو جاتے
ہیں۔ اس حملے میں قبائلیوں کی حالت بپھرے ہوئے چیتوں کے ریوڑ کی سی ہوتی ہے' وہ
اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں اور خنجروں' تلواروں' بندوقوں سے دشمن کو چیرنا پھاڑنا شروع

کر دیتے ہیں۔ اس حملے کے تصور ہی سے کئی مقامات سے انگریز ان کے آگے دم دبا کر
بھاگ جایا کرتا تھا۔

جنرل طارق کی نظریں بڑی بے چینی سے دشمن کے کیمپ پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہاں
ہونے والی معمولی سے معمولی نقل و حرکت بھی اس کی نظر میں تھی۔ خدا خدا کر کے بارہ
کے بارہ بجے اور جنرل نے مارٹروں کو فائر کرنے کا اشارہ کیا۔ اس کے فوراً مارٹروں کے فائر
سے ہونے والے دھماکوں کی آواز پر لگے تھے اور آدھی کیمپ کے اندر موت کا رقص
دیکھنے کو بے چین تھیں' لیکن اعصاب شکن انتظار کی طوالت بدستور ہی چلی گئی۔ "ہم لوگ
مجاہدین" نے اپنا پرانا گھناؤنا کھیل کھیلا۔ انہوں نے جنرل کو پتہ ہی نہ چلنے دیا اور مارٹر گنیں
چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ بڑے ہی جان لیوا مراحل تھے۔ قبائلی مجاہدین بے چینی سے مارٹروں
کے فائر کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اس کی آڑ میں حملہ کریں اور اپنے دل کے ارمان نکالیں۔
جب دس منٹ تک اس طرف سے کوئی فائر نہ آیا تو جنرل معاملے کی سنگینی جان گیا۔ اس نے
بجائے انتظار کرنے کے قبائلی مجاہدین کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

انہوں نے مسلسل پچاس گھنٹے بھارتی فوج کی ناک میں دم کیے رکھا۔ اس دوران جنرل
کی سخت ہدایات کے تحت انہوں نے کیمپ پر تو ہاتھ نہ ڈالا کیونکہ جنرل انہیں یہاں حرام
موت مروانے نہیں لایا تھا' البتہ بھارتی فوج کی پٹرول پر انہوں نے کئی مرتبہ گھات لگائی۔ ان
لوگوں کے پاس دو دن کا راشن اور گولہ بارود ہی تو تھا' اس سے زیادہ وہ اپنے ساتھ کچھ نہیں
لا سکتے تھے۔

تیسرے روز اوڑی کا بریگیڈ کمانڈر سفیدیا کر وائرلیس پر سری نگر سے درخواست کر رہا
تھا کہ اسے کمک روانہ کی جائے ورنہ وہ دو گھنٹے بعد اوڑی سے پسپائی اختیار کر لے گا۔ جب
اوڑی کا بریگیڈ کمانڈر دو گھنٹے کی لڑائی کے بعد پسپائی اختیار کرنے کے لیے صف بندی کر رہا
تھا' جنرل طارق اور ان کے ساتھی انتہائی یاسیت کے عالم میں اپنی بے سروسامانی کا جائزہ لے
رہے تھے۔ ان کا راشن ختم ہو چکا تھا۔ بہ مشکل اتنے راؤنڈ بچتے تھے کہ وہ لوگ گوہلن
سے اپنی جانیں بچا کر نکل جائیں۔ برف باری کی شدت نے اب طوفان کی شکل اختیار کر لی
تھی' خون رگوں میں منجمد ہوا جاتا تھا۔

دشمن کے آٹھ سو سپاہیوں کو موت کی نیند سلا کر اپنے تیرہ ساتھیوں کی قربانی دے کر
جنرل طارق اور اس کے ساتھی شہیدوں کی لاشیں اٹھا کر واپسی کا سفر اختیار کر رہے تھے۔
دسمبر کے آخری ایام تھے۔ برف باری کی شدت میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا۔ گوہلن میں

HBC

بجلدین کا مسئلہ نوٹ کیا۔ جنرل نے اپنے قدم اوڑی کی دفاعی فصیل کے باہر جما لیے اور وہ لوگ موسم' اپنوں اور غیروں کا مذاب جھیلنے کے لیے مستقبل کی تیاریاں کرنے لگے۔

☆○☆

ہاشری نالے کے دوسرے کنارے پر حوالدار غلام محمد اپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑی سہ پہنچی سے شیرو کی آمد کا منتظر تھا۔۔۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا اور ان کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

۔۔۔۔اس نے اغوا شدہ مسلمان لڑکیوں سے بھرا ہوا ٹرک حوالدار غلام محمد کو سونپ کر اس پر بہت بڑی ذمے داری ڈال دی تھی۔

رات کے پچھلے پہر تک حوالدار غلام محمد نے ان لوگوں کا انتظار کیا۔ اس نے شام ڈھلے ہی ایک مخبر کو اس طرف روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ صورت حال کا خود جائزہ لے کر آئے۔ مخبر جو لوٹ کا ایک ہوم گارڈز تھا رات تقریباً" آٹھ بجے واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ وہاں ہوم گارڈز اور فوج کے درمیان زبردست جنگ جاری ہے۔

حوالدار معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ اسے ہر صورت میں ان مظلوم مسلم زادیوں کو کسی محفوظ مقام تک پہنچانا تھا۔ اسے رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ شیرو اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے ساتھی ہوم گارڈز کسی طرح بھی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے' لیکن ایک اطمینان اسے بہرحال تھا کہ وہ بھی ایک انتہائی ضروری فرض ادا کر رہا ہے۔

ہاشری نالے کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر اس نے حسرت بھری نظر بنوٹ کی سمت ڈالی۔ کبھی کبھی دھماکوں کی آواز اس کی سماعت سے بھی ٹکرانے لگتی تھی۔۔۔۔ یہ مارٹر کے گولے کی آواز تھی۔ ہلکے اسلحے کی آواز یہاں تک نہیں آ سکتی تھی۔

"گاڑی اسٹارٹ کرو۔" اس نے ایک ہوم گارڈز کو اشارہ کیا۔

اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ سری نگر کی طرف روانہ ہو گئے۔ حوالدار غلام محمد دل ہی دل میں دعا مانگتا جا رہا تھا کہ سری نگر تک کا سفر بخیر و خوبی کٹ جائے۔ اسے اپنی یا ہوم گارڈز کی فکر نہیں تھی۔ فکر تھی تو ان مسلمان مظلوم لڑکیوں کی جنہیں قدرت نے اس کی حفاظت میں دے دیا تھا۔

۔ ۔ ۔

تاریکی بھی ایک بھیانک حقیقت اس پر طاری تھی۔ ابھی بمشکل وہ قدم ہی آگے بڑھا پایا تھا کہ اس کا پاؤں کسی شے سے ٹکرایا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتا، شیرو نے اپنی پانچ کا گھونسا نما ہاتھ اس کے نقاب میں اندر تک گھسیڑ دیا۔

لڑکی نے حملے کی شدت کا احساس کر لیا اور یہ جان لیا تھا کہ یہاں سے اکیلے وہ کبھی بھی ان دونوں کی جان نہ لے سکے گا۔ شیرو نے ماچس کی دوسری تیلی بھی جلا لی تھی۔ اس کے سامنے ایک کونے میں چارپائی پر ایک لڑکی کا جسم کھلا ہوا تھا جس میں سے کپڑے غائب تھے۔ ایک طرف ایک لالٹین اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔ شیرو سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے لالٹین کو سیدھا کیا جس کا شیشہ کئی جگہ سے تڑخ گیا تھا۔ بلا کر دیکھا تو شیرو کی جان میں جان آئی۔ اس میں تیل موجود تھا۔ اس نے سب سے پہلے اسی کو روشن کیا اور تو بڑھا کر وہ آسیہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"اٹھو! ادھر بیٹھ جاؤ۔" اس نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ "گھبراؤ نہیں۔" آسیہ نے کسی حیرزدہ معمول کی طرح اس کا حکم مانا تھا۔

نیفے میں رکھے ہوئے کپڑے مالک کے صاحب حیثیت ہونے کا احساس دلاتے تھے۔

شیرو نے چادر اپنے جسم سے الگ کر دی اور اپنی وردی پر لگے ہوم گارڈز کے نشانات نوچ ڈالے۔ اس نے وردی کے اوپر وہاں موجود ایک لمبی سی قمیص اوڑھ کر اس پر گرم جرسی پہن لی۔۔۔۔ اب کسی کو اس پر ہوم گارڈ ہونے کا شک نہیں گزر سکتا تھا۔ ایک جرسی اور جرابیں نیفے سے نکال کر اس نے آسیہ کی طرف بھی بڑھا دیں۔ جرابیں اپنے پاؤں میں پہنتے ہوئے جب اس کی نظریں اچانک شیرو سے ٹکرائیں تو شیرو کا دل بھر آیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس نے پہلی مرتبہ اس کے شباب کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ لڑکی کسی کھاتے پیتے گھرانے کی نظر آ رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھی اسی امر کی دلالت کرتے تھے اور شیرو کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی کہ اس کی بربادی کی وجہ بھی اس کے باپ کی دولتمندی ہی ہو گی کیونکہ اول تو مسلمان اور پھر مالدار، کبھی بھی ہندو لیڈروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔

"مجھے بہت افسوس ہے، لیکن میں بہت مجبور ہوں۔ کاش تمہارے لیے گرم کپڑوں کا بندوبست کر سکتا۔" شیرو خواہ مخواہ ندامت سی محسوس کر رہا تھا۔

"مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔" لڑکی کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں، لیکن اس نے کمال ضبط سے آنسو پی لیے۔

صدمے سے شیرو کو اپنی انگلیوں کی ہڈیوں میں خارش محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ موذی کی سلامتی کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ اس کے صبر کے ٹوٹنے کا امکان تھا کہ اس نے اپنی سب اپنے ہونے والی کسی بھی سوچی اور تشدد کی ادائگی کی [illegible] سے نہیں کی تھی۔ شاید اس طرح وہ اپنے محسن پر مزید کوئی اپنی زیادتی نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ اس نے انہی آنکھوں سے ان لوگوں کو مسلمان بچیوں کی عزت بچانے کے لیے اپنا [illegible] دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ موت کے بھیانک غار سے ان کی مسیحائی بچانے والے انسان نہیں فرشتے ہوں گے۔

شیرو اچانک کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے آگے بڑھا۔ اس نے جھونپڑی کا دروازہ کھول دیا اور باہر نکل آیا۔ نجانے کیوں اسے یہاں عجیب سی گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔

باہر آ کر اس نے دو چار لمبے لمبے سانس لیے اور چاروں اطراف گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا۔ پھر وہ مطمئن ہو کر لوٹا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد شیرو کی واپسی بھی ہو گئی۔ وہ اسے کسی اور ہی عالم کی مخلوق دکھائی دے رہا تھا۔ "ایسے عظیم انسان بھی اس دنیا میں ہوتے ہیں۔" اس نے سوچا اور شیرو کی طرف دیکھتی رہی جو اس کی موجودگی سے بے پروا ایک کونے میں دھرے مٹکے میں سے پانی نکال کر ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔ فارغ ہو کر اس نے تنقیدی نظروں سے جھونپڑی کی دیواروں کا جائزہ لیا۔ دیواروں کے اندر باہر مٹی کا لیپ کیا گیا تھا۔ قدرے مطمئن ہو کر اس نے لکڑی کا بنچ درمیان میں رکھا اور اس کے اوپر وہاں موجود باقی کپڑے پھیلنے لگا۔

"تھوڑی دیر بعد صبح ہو جائے گی۔ اگر تم ضرورت سمجھو تو منہ ہاتھ دھو لو۔ ہمارا زیادہ دیر تک ٹھہرنا میرے خیال سے مناسب نہیں۔" اس نے آسیہ کو مخاطب کیا اور بغیر اس کا جواب سنے "ابھی آیا" کہہ کر پھر باہر نکل گیا۔

آسیہ کو اب اس کی کسی حرکت پر حیرانی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی واپسی بمشکل تین چار منٹ بعد ہی ہو گئی۔ شیرو کے دونوں ہاتھوں میں سیب نظر آ رہے تھے۔

"میں نے سوچا روانگی سے پہلے ناشتہ ہی کر لیں۔" اس کی بات پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ خواہ مخواہ لڑکی کے ہونٹوں پر آ گئی۔

"برا مت مانو اس طرف تو آ جاؤ۔" اس نے آسیہ کو دروازے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

پھر سیب اس کے ہاتھوں میں تھما کر اس نے چارپائی ایک کونے میں کھڑی کر دی اور

زمین پر ٹیک کر ایک کپڑے کو آگ لگا دی۔ وہ تین منٹ تک دعائیں سے آنکھیں بند کرنے کے بعد وہ پلٹا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ لکڑی کا بکس جلنے لگا تھا۔ بھیڑیوں میں موجود کمزن میں بکس کے جلنے سے خاصی کمی ہو گئی تھی۔ آسیہ کو آگ کی تپش سے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دوبارہ زندہ ہو رہی ہے۔

——— آگ کے گرد گھومنے ہو کر اس نے شیرو کے بے پناہ اصرار پر منہ ہاتھ دھویا اور دو سیب کھائے تھے۔ نہ جانے اسے کیوں یقین ہونے لگا تھا کہ یہ شخص اس کو کبھی مرنے نہیں دے گا اور زندگی کی ساری روٹھی ہوئی خوشیاں دوبارہ لوٹ آئیں گی۔

"یہاں برف میں تمہارے علاوہ اور کون کون تھا؟" شیرو نے نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی کے طلسم کو توڑا۔

"میں' بابا اور بے بے۔ میرے دونوں بھائی سری نگر میں ہیں اپنے چچا کے پاس۔ ہمارا وہاں خشک میوے کا کاروبار ہے۔ ہم بھی اگلے روز سری نگر جانے والے تھے کہ اچانک یہ قیامت آ گئی۔ ہندوؤں نے میرے والدین کو مار ڈالا اور مجھے پولیس والے وہاں ——— "سونی لاج" میں لے گئے تھے۔"

———اس مرتبہ اس نے اپنے آنسوؤں کو روکا نہیں تھا۔

شیرو بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ اپنا بوجھ کسی طرح ہلکا کر لے۔ اسے اس لڑکی کے بے پناہ صبر و ضبط سے اب خوف سا آنے لگا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اگر آسیہ کے اندر موجود غبار نہ چھٹا تو کہیں وہ اچانک ہی نہ پھٹ پڑے اور اس کی جان لے لے۔

"اوہ معافی چاہتی ہوں۔ مجھے اس طرح آپ کے سامنے رونا نہیں چاہیے تھا۔" وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

"نہیں آسیہ!" شیرو کی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ "اچھا ہے آدمی اپنے دکھ درد پر رو لے۔ یہ اندر اندر کی گھٹن بسا اوقات بڑی جان لیوا ہو جاتی ہے۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ خلا میں گھورنے لگا تھا۔

آگ پر نظریں جمائے کھڑے ہوئے شیرو پر اس لمحے آسیہ کو بڑا رحم آیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے شیرو تو اس سے بھی زیادہ مظلوم ہے۔ اس سے بھی زیادہ ہمدردی کا مستحق۔

نہ جانے اس کے اس فقرے میں ایسی کیا بات تھی جو آسیہ کو کھا گئی۔

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" اس نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"پونچھ۔" شیرو نے جواب دیا اور آسیہ نے بڑی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ پونچھ سے ہیں....." اس نے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

"ہیں قدرت کے نام ہیں۔ میں نے تو کبھی زندگی میں لوگری کرنے کا تصور ہی نہیں کیا تھا۔"

پھر آسیہ کافی دیر تک یہی سوچتی رہی کہ وہ اس کے گھر بار کی بھی خبر لے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے اس سے سوال کر ہی ڈالا۔ "آپ نے شادی بھی تو نہیں کی وہاں؟"

شیرو اس کا مدعا جان گیا تھا۔ مسکرا کر "نہیں" کہہ دیا۔ پھر بڑی تلخی سے بولا۔ "میں نے ابھی شادی نہیں کی۔ میری ماں نے ابھی ایسا سوچا ہی نہیں۔ میری صرف ماں ہی ہے۔ اور زبراں۔ خدا جانے وہ لوگ کس حال میں ہوں گے؟ گئے ہوئے قریباً ایک مہینہ ہو گیا ہے۔"

"اوہ! آپ کو پونچھ میں انہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہاں تو حالات بہت ہی خراب ہیں۔ سنا ہے لوگ مہاراجہ کی فوج سے لڑ رہے ہیں۔"

"صرف مہاراجہ کی فوج کہاں۔ اب تو سارے بھارت کی فوج بھی وہاں پہنچ چکی ہو گی۔" شیرو نے آہ بھری۔

"پونچھ کے لوگ بہت بہادر ہیں۔ وہ کبھی نہیں ہاریں گے۔" آسیہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

پونچھ کے مجاہدوں کی کہانیاں کشمیر کے گھر گھر میں پہنچ چکی تھیں اور آسیہ سے زیادہ اور کس کو ان کی خبر ہو گی کیونکہ اس کا باپ خود سیاسی آدمی تھا اور سارے کشمیر کیا سارے ہندوستان کی خبر رکھتا تھا۔

"آپ بہت بہادر لوگ ہیں۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ "آپ نے بہت اچھا کیا جو لڑائی جاری رکھی' لیکن یہ ہوم گارڈز تو فراڈ ہیں۔ شیر کشمیر کا سیاسی فراڈ۔"

شیرو چونکا۔ لڑکی خاصی عقل مند تھی' لیکن آسیہ کو یوں لگا جیسے اس نے یہ کہہ کر غلطی کی ہو کیونکہ شیرو بھی تو ہوم گارڈز ہی تھا۔

"آپ میری بات کا برا مت مانئے۔ شاید صدمے نے میری یہ حالت کر دی ہے۔ آپ کو علم نہیں کہ میرا بابا بھی گاندھی کا زبردست پیروکار تھا اور کانگریس کے مقامی حلقوں میں ان کا بڑا احترام تھا۔ ملک آزاد ہونے پر ہمارے گھر پر کانگریس اور بھارت کا ترنگا لہرایا گیا تھا۔ جب جن سنگھ والوں نے ہمارے گھر پر حملہ کیا تو بھی ہمارے گھر پر ترنگا لہرا رہا تھا' لیکن انہوں نے میرے ماں باپ کو صرف مسلمان ہونے کے جرم میں مار ڈالا۔ میں کانگریس بھی

بڑا احترام کرتی تھی لیکن اب مجھے سارے ہندوؤں سے نفرت ہو گئی ہے ـــــ شدید نفرت۔ یہ لوگ کبھی ہم پر اعتماد نہیں کریں گے۔ ہوٹ میں ساری جنتا مہاراجہ کے اشارے پر ہمیں میں لوٹنے گئی۔ اس نے مظفر آباد سے آئے ہوئے سکھوں کو کہا تھا کہ مسلمانوں کو مار ڈالو، اگر وہ لوگ جن سنگھ کی مدد نہ کرتے تو ہمیں آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے ـــــ" وہ جنون میں نہ جانے کیا کیا کہتی رہی، پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہمیں چلنا چاہیے، صبح ہونے والی ہے۔" شیرو نے اس کے خاموش ہونے پر گردن جھکائے جھکائے کہا۔

ان کے سامنے دھری آگ اب ٹھنڈی پڑنے لگی تھی، لیکن رات بھر وہ سردی کے جس عذاب میں مبتلا رہے اس کی اذیت اب خاصی کم پڑ چکی تھی۔ شیرو نے آستین گن کو اس طرح اپنے کپڑوں میں چھپا لیا تھا کہ اب وہ اس کے جسم کا حصہ بن گئی تھی، دونوں باہر نکل آئے۔

"میری اطلاعات کے مطابق ابھی مسلمانوں کے کچھ گاؤں بچے ہوئے ہیں، لیکن ہمیں ان سے مدد کی توقع نہیں، ہمیں صرف سری نگر پہنچ کر ہی امان مل سکتی ہے۔ اردگرد کے تمام علاقے میں جن سنگھ کے غنڈوں نے ہندو فوج کی مدد سے اسلحہ تقسیم کر رکھا ہے اور وہ بے دریغ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ ہوم گارڈز بھی ان کی کوئی خاص مدد نہیں کر سکتے، بے چارے مجبور ہیں۔ ہم نے بھی جو کچھ کیا، اس کی سزا ہمیں بھگتنی پڑے گی، لیکن تم گھبرانا نہیں۔ میں صرف ہوم گارڈ ہی نہیں، کشمیری مسلمان بھی ہوں اور میرے اجداد نے مجھے اپنی غیرت بچانے کے لیے مرنے کا ڈھنگ سکھایا ہے۔ میرے جیتے جی کوئی میلی نظر سے تمہاری سمت دیکھ نہیں سکے گا۔" شیرو کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے آسیہ کو بالکل اطمینان دلا دیا۔

پو پھٹنے لگی تھی اور انہیں قریبی دیہات کے آثار واضح دکھائی دے رہے تھے۔ شیرو نے گاؤں کی طرف جانے والا راستہ چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اپنایا تھا جو لمبا ضرور تھا لیکن محفوظ تھا۔ وہ لوگ دیہات سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے۔ سورج نے اب پہاڑوں کی اوٹ سے ڈرتے ڈرتے سر باہر نکالنا شروع کیا تھا۔ اس کی سہمی ہوئی خوفزدہ کرنیں زمین پر پھیلی کہرے کی چادر پر کانپ رہی تھیں اور دونوں کو اسی روشنی میں گاؤں کے مکانوں پر جھانکتے کیسری رنگ کے ترشول بخوبی دکھائی دے رہے تھے جو ان کے یہاں سے بچ کر گزر جانے کے عقل دنگ کر دینے والے فیصلے پر دلالت کرتے تھے۔

☆○☆

پانچ کو مجاہدین نے اپنی استعداد کوشش کے بعد بلتی کشمیر سے کاٹ دیا تھا۔

اور ترتیبر کے اندر بریگیڈیئر پریم سنگھ کی فوج مسلسل محاصرے کی حالت میں تھی۔ پریم سنگھ کی فوج اور اندر موجود گاؤی کو سپلائی صرف ہوائی سے جا سکتی تھی، لیکن جنرل طارق نے نومبر کے مہینے میں اوڑی، پانچ روڈ کو بند کر دیا تھا اور متبادل راستہ (سری نگر۔ جس پر صرف کچھ ہی سفر کر سکتے تھے، کھرگ کی پہاڑیوں سے ہو کر اوڑی کی طرف جاتا تھا) برف باری کی وجہ سے قریباً قریباً ناقابل عبور ہو چکا تھا۔

پانچ کو آنے والے راستے بند ہونے کی وجہ سے اب بھارتی فوج کی امیدیں صرف ہوائی فضائیہ سے وابستہ تھیں، لیکن یہاں طیاروں کے لینڈ کرنے کے لیے جو مختصر سا گراؤنڈ تھا وہ مجاہدین کی فائرنگ کی زد میں تھا اور ان کی فائرنگ سے بچ کر جو اکا دکا جہاز یہاں اترتے تھے، وہ انتہائی ضروریات کا سامان ہی لا سکتے تھے، پھر مجاہدین نے مزید جانفشانی دکھائی تو طیاروں کی لینڈنگ بھی ناممکن بنا دی۔ اس صورت حال نے فوج کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

عین ان لمحات میں سیکٹر کمانڈر کرنل صادق خان کو ایک ایسا حکم ملا جس نے خود انہیں بھی حیران کر رکھ دیا۔ جی۔ایچ۔کیو سے پیغام آیا تھا کہ عارضی فائر بندی ہو گئی ہے۔

کرنل صادق نے اس کی وجہ پوچھی تو انہیں بتایا گیا کہ بھارتی حکومت نے زخمیوں، بیماروں اور لاشوں کو نکالنے کی مہلت مانگی ہے۔

کرنل صادق اس دلیل پر تلملا کر رہ گئے۔ انہوں نے اس "عارضی فائر بندی" کے پس پردہ برہمنی ذہنیت سے اپنی ہائی کمان کو آگاہ کرنا چاہا تو کسی نے ان کی بات پر کان نہ دھرے اور ان کے خدشات صحیح ثابت ہوئے۔

زخمیوں، بیماروں کو نکالنے اور یہاں موجود سویلین آبادی کو اناج مہیا کرنے کی آڑ میں بھارتی فوج نے نہ صرف بے پناہ ایمونیشن اور سامان رسد ہی شہر میں پہنچایا بلکہ اطراف کی پہاڑیوں میں بھی کمال عیاری سے اپنی بیڑیاں منتقل کر دیں اور جب صورت حال کی نزاکت کا احساس خداوندان سیاست و سیادت کو ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔

جنرل طارق ان تمام باتوں سے لاتعلق اوڑی کے برف زاروں میں دشمن پر کاری ضرب لگانے کے منصوبے بنا رہا تھا جب اسے یہ اطلاع ملی کہ بغیر چھٹی لیے نوکری سے غیر حاضر رہنے پر اس کو تین ماہ کی "کمانڈ تنخواہ" سے محروم کرتے ہوئے اس کی ترقی بھی بند کر دی گئی ہے اور اس سے دو جونیئر افسران کو ترقی دی جا رہی ہے۔ اندریں حالات جنرل نے

محسوس کیا کہ اب اس کا علاقہ پر رہنا کیس کشمیر کی جنگ آزادی کو نقصان نہ پہنچانے کی وجہ صرف اور صرف اس کی ذات تھی اور وہ سارے کشمیر کو اپنی ذات کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا تھا۔

لاہور میں وزیراعظم کے ساتھ کانفرنس کے دوران جنرل طارق کو تین دن تک جنگ بندی رکھنے کے درخواست کے تھے۔ اس نے تین دن تک بڑی سے بڑی سنگینی اور صبر و تحمل کے ساتھ ایوبوں اور پرایوں کے حملے برداشت کیے تھے۔ اوڑی سیکٹر پر تک سے دبا پڑا تھا۔ باقی تمام محاذوں پر بھی جمود طاری تھا۔ پاکستان کے کشمیر پر حق کا دعویٰ اقوام متحدہ میں زیر بحث تھا اور عالمی رائے عامہ خاصی حد تک پاکستان کے حق میں ہموار ہو چکی تھی۔

اس دوران آزاد کشمیر کا اپنی ایج کیو بھی قائم ہو چکا تھا۔ "لبریشن کمیٹی" نے سیاسی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی تھی جہاں انتظامی امور کے بجائے سیاسی امور زیادہ زیر بحث رہتے تھے۔ ہر کوئی دوسرے پر الزام لگانے اور اپنی پوزیشن صاف کرنے کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ عہدوں کی بندر بانٹ کے لیے جوتیوں میں دال بٹ رہی تھی۔ یہ تھے وہ سنگین حالات جن میں جنرل طارق نے اس گندی سیاست سے نکلنے کا فیصلہ کیا اور حکومت سے درخواست کی کہ اسے کشمیر کی کمانڈ سے فارغ کر دیا جائے۔

☆○☆

نوروی کو حسن کی آمد کی اطلاع شرفو کے قریب ہی بیٹھے ہوئے ملی تھی۔ وہ لوگ وہاں ایک اہم فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ پونچھ میں بھارتی فوج کی مضبوط پوزیشن اور دوسرے محاذوں پر ابھی تک پاکستانی فوج کے پس و پیش نے انہیں اپنی خواتین اور بچوں کے مستقبل کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

——نوروی کی جہاندیدہ نظروں نے حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد ہی یہ نتیجہ مرتب کر لیا تھا کہ عورتوں اور بچوں کو سرحد پار پاکستان بھیج دیا جائے اور وہ اگر پاکستان نہ بھی پہنچیں تو کم از کم کشمیر کے آزاد کردہ علاقے میں چلے جائیں۔

اس کے ساتھیوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے بوڑھے نوروی کی باتیں سنیں اور خاصی بحث کے بعد وہ لوگ عورتوں' بچوں' ضعیف اور زخمی مردوں کو سرحد پار بھیجنے پر رضامند ہوئے تھے۔ جوانوں کا ایک دستہ بھی انہوں نے اس قافلے کی حفاظت کے لیے تیار کیا تھا کیونکہ لکڑیوں کی شکل میں اس سے پہلے پونچھ سے نکلنے والے مسلمان قافلوں پر جو قیامت مقامی غیر مسلم آبادی اور فوج کے ہاتھوں ٹوٹی تھی' اس سے وہ لوگ بخوبی آگاہ تھے۔

[illegible] کے لیے [illegible] ہوا تھا اور یہاں سے جانے والے [illegible]
[illegible] اس نے [illegible] کہا تھا کہ وہ [illegible]
[illegible] جائے اور اس طرح کم از کم وہ اس [illegible] سے نجات حاصل کر لے گا جو
[illegible] کی [illegible] اس پر طاری کر رہی تھی اسے [illegible]
[illegible] نے [illegible] کی امانت کی صحیح طریقے سے [illegible]
[illegible] خاں نے [illegible] کو دیکھ کر سر اٹھانا شروع کر دیا تھا اس سے [illegible]
[illegible] وہ بنیادی طور پر [illegible] طالب علم تھا اور جنگ آزادی میں شمولیت سے [illegible]
[illegible] کی ساری صلاحیتیں صرف ذکر سامراج کے خلاف جنگ کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھیں
لیکن زہراں۔۔۔۔؟

زہراں کی اچانک آمد نے اسے کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔ اس کے اندر ایک انجان سی جوان شروع ہو چکی تھی جس نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ خواہ مخواہ خود کو مجرم گردانے لگا تھا اور یہ احساس جرم اب شدید سے شدید تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

نوروی کے اس فیصلے نے اس کی مشکل خاصی آسان کر دی تھی لیکن زہراں کے انکار نے اسے پھر سوچوں کے گرداب میں لا کر پھینک دیا تھا۔

پہاڑی کا موڑ مڑتے ہوئے وہ یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ زہراں اپنا فیصلہ بدل دے۔

اچانک کسی آواز کی بازگشت نے اس کے قدم تھام لیے۔ پہاڑی کے دوسرے کونے سے کسی نے اس کا نام لے کر اسے پکارا تھا۔ آواز ایک گونج پیدا کرتے ہوئے اس تک پہنچی تھی۔

"خدا خیر کرے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور واپس چلا گیا۔

پہاڑی موڑ مڑتے ہی جس شخص پر اس کی نظر پڑی' اسے دیکھتے ہی شرفو کی دھڑکنوں میں شدت پیدا ہو گئی۔

"فرزند تم!" اس نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

"شرفو!" فرزند اس کی بانہوں میں سمٹ گیا۔ "میں تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لایا شرفو' مجھے معاف کر دینا۔" فرزند نے اس کے گرد اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے شرفو کی پیٹھ کو تھپتھپایا۔

نوروی بھی اس اثناء میں وہاں چپ چاپ آ کر کھڑا ہو گیا۔ فرزند کی کسی سوئی بات پر

HBC

نورولی کی سرگوشی نے شرفو کو جیسے بکھیر دیا تھا' لیکن اس حالت میں بھی وہ تحمل کو ہاتھ سے نہ چھوڑ سکا۔

"کیا بات ہے فرزند؟" اس نے بڑی نرمی سے فرزند سے پوچھا جس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

فرزند نے بھی کچھ کہنا چاہا' لیکن اچانک جیسے کسی طاقت نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی۔ سامنے کے موڑ سے اچانک زہریلی دھواں نمودار ہوئی تھی۔ شاید یہ خبر اس تک پہنچ چکی تھی۔ وہ چپ چاپ نورولی کے زویک آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

"خدا کو یہی منظور تھا بیٹی کہ شیرو ہم سے الگ ہو جائے۔ شاید خدا کو مجھ بوڑھے کی قربانی منظور نہیں۔ بخدا وہ سرشتوں میں سرشت تھا کہ عظیم فرض کی ادائیگی میں اس نے شہادت پائی اور ہمیں اکیلا چھوڑ گیا۔" نورولی کی آواز بھرا گئی۔

"صبر—— میری بچی صبر کرو۔ یہ کمزور نہ بنو۔ شہیدوں کو رویا نہیں کرتے میری بچی۔" نورولی کا گلا رندھ گیا۔

فرزند نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا اور شرفو کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا' وہی بات تھی جو اس نے سوچی تھی۔

"اف خدایا! یہ کیا ہو گیا؟" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کے اندر جیسے کچھ چٹخنے لگے تھے۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا' پھر اسے اپنے گالوں پر گرم آنسوؤں کے نظر آنے کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ غبار جس نے اس کا دم گھونٹنا شروع کر دیا تھا' اس کے پیٹ سے حلق کی طرف سفر کرنے لگا۔ شرفو نے انتہائی ضبط سے کام لیا' لیکن اس ریلے کی طغیانی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"شرفو!" فرزند نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "اگر تم ہی ہمت ہار گئے تو زہراں....."

اور اس نے سوچا واقعی اب اسے زہراں کا سہارا بننا تھا۔ حالات نے جس بری طرح اس لڑکی کو رگیدا تھا' اس کے بعد شرفو کے سوا اس کا رہا ہی کون تھا۔

"مجھے ساری کہانی سناؤ فرزند۔" شرفو نے حیرت انگیز ضبط کا مظاہرہ کیا' پھر وہ زہراں سے مخاطب ہوا۔ "تو زہراں تم بھی سن لو۔ فرزند اس کے ساتھ بنوٹ میں تھا۔ وہیں ہمارا شیر شہادت کے منصب پر سرفراز ہوا ہے۔ چپ ہو جاؤ زہراں۔ ان آنسوؤں کو یوں مت بہاؤ۔ ابھی ہمیں بہت سا اپنے پیاروں کا ماتم کرنے کے لیے ابھی ہمیں بہت لمبی زندگی

[illegible] ہو گئی۔ ہاروں اس لمحے میں کھو گئے۔
[illegible] ہمیں ہماری زندگی ان دنوں کو رلائے گی۔

☆○☆

ہمیں شیرو کے ساتھ گزرے ہوئے بچپن کی فرزند نے ہمیں سری نگر سے ہونے والی گفتگو سنانا شروع کر دی۔ ہم اگلے فارغ کرتے ہوئے چیچے تھے۔ میں یہ سمجھ نہ سکی کہ میں کہانی سنانے کے لیے زندہ بچا ہوں۔ کتنا بدقسمت ہوں میں۔ شاید ہی نورولی! بخدا میں بزدل نہیں ہوں' لیکن یہ بے مقصد کی بے وقعت موتیں اب میری برداشت سے باہر ہیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "میں نے وہ وہ منظر دیکھے ہیں کہ لب سیرا ایمان ہی انسانیت سے اٹھنے لگا ہے۔ نورولی! چھان بھاگ رہے ہیں۔ ہندو فوج آگے بڑھ رہی ہے۔ لاہر پاکستان سے کوئی فوج ہماری مدد کو نہیں آ رہی۔ ہم اتنے موسن نہیں کہ آسمان سے فرشتے ہماری مدد کو اتریں گے۔"

——اس کے آخری فقرے کی کاٹ اتنی گہری تھی کہ بوڑھا نورولی تلملا اٹھا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس نے بڑی ہمت سے کام لے کر اپنے لہجے پر کنٹرول کیا تھا۔

"نورولی!" فرزند کی آواز خاصی بلند ہو گئی تھی۔ "کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے بلی کا خطرہ ٹلا نہیں کرتا۔ خدا کے لیے حالات کو سمجھو۔ ہم اس بے سروسامانی کی حالت میں آخر کب تک لڑ سکتے ہیں—— کب تک؟ اور ہم آخر لڑ کس کی امید پر رہے ہیں؟ دشمن اپنی پوزیشن مستحکم کرتے ہی ایک ایک کو سسکا سسکا کر مار ڈالے گا۔ جتنی جلدی ممکن ہو' یہاں سے نکل جاؤ۔" اس نے اپنی بات مکمل کر کے نظریں جھکا لیں۔ شاید اس میں کسی سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں تھا۔

وہاں موجود چاروں میں سے ہر کوئی دوسرے سے نظریں چرا رہا تھا جیسے وہ چاروں ایک دوسرے کے چور ہوں۔ تینوں مرد خود کو شیرو کی موت کا ذمے دار سمجھ رہے تھے۔ ان سب پر سکوت طاری تھا' پھر نورولی نے ہی ہمت کی۔

"فرزند! میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں جلد یا بدیر یہ حصار بالآخر ٹوٹ جائے گا' لیکن ہم کو لڑنا ہے۔ آخر دم تک—— آخری آدمی تک۔"

——ہم ہراول دستے کے سپاہی ہیں اور اگر ہم ہی ہمت ہار گئے تو وادیٔ کشمیر سے [illegible]

چپ پر بیلی ہے مداخلت دم توڑ جائے گی۔ وہ لوگ صرف ہم سے امیدیں لگانے والے پہلے پہلے پنکاری ہم نے سنبھالی تھی۔۔۔۔ ہم پر بھروسہ کرنے والے لوگوں نے اور اس ملک کا بچہ بچہ جس بھی ہم ہی کو بنانا ہوگا۔"

اس کی بات ابھی بمشکل مکمل ہی ہوئی تھی کہ دروازے کے باہر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ اشرف خان نے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ فرزند واکنل پکڑ کر اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازے سے چپک گیا۔ نورولی خود آگے بڑھا۔ اس نے زہراں کو شرفو کے پیچھے کھڑے ہونے کو کہا۔

"کون ہے؟" اس نے باہر نکل کر للکارا۔

"میں ہوں چاچا نورولی۔" ایک مجلد کی آواز آئی۔

"آ جاؤ۔" اس نے آواز پہچان کر آنے والے کو اجازت دی۔ "تم یہاں کیسے فضل داد؟" نورولی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

اس اثناء میں باقی تینوں بھی مطمئن ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

"میں بڑی مشکل سے ان لوگوں کو دھوکا دے کر یہاں تک آیا ہوں چاچا نورولی۔" فضل داد کی گھبراہٹ نمایاں تھی۔

"کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟" نورولی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"چاچا حوالدار صاحب شہید ہو گئے۔" اس نے شرفو کی طرف بڑی ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

"انا للہ و انا الیہ راجعون۔" نورولی کے منہ سے نکلا۔

"کیا؟" شرفو نے فضل داد کو آگے بڑھ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ اس کی سماعت غیر ہونے لگی تھی۔

"ہاں شرفو بھائی۔ تمہارے والد شہید ہو گئے۔ میرا بھائی کرم داد بھی ان کے ساتھ شہید ہوا ہے۔ بریگیڈیئر پریتم سنگھ کے سپاہیوں نے ان دونوں کو گھیرا ڈال کر زندہ گرفتار کر لیا تھا' پھر ایک درخت سے لٹکا کر دونوں کو پھانسی دے دی۔ ظالموں نے ہمیں لاشیں بھی نہیں دیکھنے دیں۔"

فضل داد بولتا جا رہا تھا اور شرفو کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ اس کے منہ کا ذائقہ اچانک کڑوا ہو گیا تھا' حلق سوکھنے لگا تھا اور ایک مرتبہ پھر وہ بے پناہ شدت کے ساتھ اسی کیفیت کا شکار ہو چلا تھا جس سے وہ ابھی تھوڑی دیر

کے بعد ہوا تھا۔۔۔ ایک باپ کی موت کی خبر سننے

کمزی ہوئی' لیکن شرفو اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ وہ بند کھاتے ٹانگی باندھ کے پہلی پہلی لکیروں سے نوروی کو گھورتا رہا۔

"چاچا" ایک کربناک آواز اس کے گلے سے بلند ہوئی اور وہ لونی ہوئی اونی کی طرح نوروی کے بازوؤں میں گر کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ فضل داد اور فرزند سے اسے سنبھالا اور دوسری طرف موڑ لیے اور زہراں پھر سسکنے لگی۔

☆○☆

تین دن تک نوروی نے انھیں مسلسل اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔ یہ تین دن پونچھ کے مسلمانوں کے لیے قیامت سے ہرگز کم نہ تھے۔ مسلمانوں کا قتل عام روزانہ کا معمول بن چکا تھا۔ نوروی کو شرفو اور زہراں کے متعلقین کی قربانیوں کا شدت سے احساس تھا۔ وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا کہ ان دونوں کو محفوظ مستقبل کی ضمانت دے لیکن کس طرح؟ یہی سوال اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ تیسرے دن مسلسل سوچ بچار اور برادری کے ان سرکردہ لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد جو ابھی پونچھ میں تھے' نوروی ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

اور اس روز وہ اسی ارادے سے شرفو کے پاس آیا تھا کہ اسے بلول نخواستہ اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کرے اور پونچھ سے ہجرت پر بھی تیار کرے۔ شرفو اسے "پنڈ گلہ" کے باہری ل گیلہ وہ اپنی رائفل کھول کر اسے صاف کر رہا تھا جب نوروی اس کے سر پر جا پہنچا۔

"سلام چاچا۔" اس نے نوروی کو دیکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"جیتے رہو۔" نوروی نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا۔ اس دوران شرفو نے رائفل دوبارہ بند کر لی تھی۔

"میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں بیٹا۔ گو کہ ایسی باتیں خاص مواقع پر ہی کی جاتی ہیں' لیکن حالات جس نہج پر جا رہے ہیں وہاں میں کسی بات کو ادھوری چھوڑنے یا کل پر ٹالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"کہو چاچا تم کوئی فیصلہ تو نہیں ہو۔" شرفو نے خلا میں کسی کھوئی ہوئی شے کو ڈھونڈتے ہوئے کہا۔

نوروی نے پہلے تو اسے اس کی ذمہ داریوں اور مستقبل کے خدشات کا احساس دلایا' پھر ... ی ... ہ ... پوزیشن سے آگاہ کرنے کے بعد بالآخر ہمت کر کے کہا۔ "میں برادری کے ... سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ تم دونوں کا نکاح کر کے ... پھر سے ... ہانکنے کی طرف بھیج دیا جائے۔۔۔۔ زہراں نی اکیلی میرے گھر

رہنے کی اور تم اسیتہ بابا کے ساتھ۔ بچے ... ساتھ سکھی رہیں گے۔ تم دونوں اپنی ازدواجی زندگی شروع کر دینا۔"

۔۔۔۔ اپنی بات مکمل کر کے اس نے امید بھری نظروں سے شرفو کے چہرے کی طرف دیکھا' جس نے سر جھکائے ہوئے قبل سے اس کی ساری گفتگو سنی تھی۔

"میں آپ کے ہمدردانہ جذبات کی قدر کرتا ہوں چاچا' لیکن اول تو کسی معاملے میں میری رضامندی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ پھر آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ جس عظیم مقصد کے لیے میرے ماں' باپ اور بھائی نے اپنی جانیں قربان کیں' میں اس مقصد کے حصول تک میدان کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے بھی ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا' لیکن میں اس مقصد کے روز ان کے سامنے شرمسار نہیں ہونا چاہتا۔"

"دیکھو بیٹے۔" نوروی نے اس کے جواب سے قدرے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں خدانخواستہ میدان جہاد سے بھاگنے کی ترغیب نہیں دوں گا' یہ بات ہماری غیرت کے خلاف ہے' لیکن بعض ذمے داریاں اتنی اہم ہوتی ہیں کہ دوسرے تمام اہم معاملات کو ان پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ میں صرف تمہارے لیے میدان بدل رہا ہوں۔ تم یہاں سے جا کر آزاد کشمیر کی باقاعدہ فوج کے ساتھ لڑائی میں شامل ہو جاؤ' پھر تمہیں اپنی تعلیم کا بھی خیال کرنا چاہیے۔ حوالدار مرحوم کی شدید خواہش تھی کہ تم اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن میں لوٹ جاؤ' پھر تم خود ہی بتاؤ آخر زہراں کو ہم اکیلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ خصوصاً ان حالات میں! شرفو یہ مت بھولو وہ تمہارے مرحوم دوست کی امانت ہے' جو یہاں سے رخصت ہوتے وقت اس کی ذمے داری تمہیں سونپ گیا تھا۔۔۔۔۔"

کافی دیر کی بحث کے بعد بالآخر نوروی کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی' لیکن شرفو نے اس سے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا۔ "چاچا! مجھے اس بات کی خفت بھی ہے کہ زہراں نے بغیر کسی دباؤ کے اس فیصلے کو قبول کیا ہے' ورنہ یہ بات یاد رکھنا کہ تم دو زندگیوں میں جو پہلے ہی نیم مردہ ہیں' زہر گھول دو گے۔"

"تم مطمئن رہو شرفو۔ مجھے خدا کے سامنے بھی اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہونا ہے۔" اور وہ واپس آ گیا۔

☆○☆

زہراں نے نوروی کی بیوی کی ساری بات بڑی توجہ سے سنی تھی۔

۔۔۔۔ صدمات نے اسے نڈھال ضرور کر دیا تھا' لیکن اب وہ زندہ حقیقت پسند تھی۔

HBC

گئی تھی۔ حالات اس کے سامنے تھے اور مستقبل کے خدشات کا وہ اپنے حساب سے جائزہ لے رہا تھا۔ زہراں جانتی تھی کہ کھلے بڑی تیزی سے اسے لگنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زہراں جانتی تھی کہ اس کی حیثیت خزاں کے اس پتے جیسی ہے جو ڈالی سے الگ ہو کر گر پڑا ہو۔ اسے زندگی کے طویل صحرا کو پانے کے لیے ایک مضبوط سہارا درکار تھا ورنہ ہوا کا کوئی بھی تیز جھونکا اسے اپنے ساتھ اڑا کر کہیں بھی لے جائے گا۔

شرفو اس کے مرحوم شوہر کا جگری یار تھا اور دونوں میں کئی قدریں مشترک تھیں۔ شیرو نے روانگی کے وقت اسے زہراں کی حفاظت کی ذمہ داری سونپ کر اس پر مکمل اعتماد کا اظہار ہی نہیں کیا تھا بلکہ اسے ہر معاملے میں اپنا دست راست بھی جانا تھا' پھر شرفو بھی تو اکیلا ہی رہ گیا تھا۔ اسے بھی تو کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ شیرو اور اس کے گھر والوں کی غیر موجودگی میں خصوصاً" اس کے باپ اور شیرو کی ماں کی شہادت کے بعد اس نے جس طرح زہراں کی ذمے داری اٹھائی تھی اور اس کے دکھ درد بانٹے تھے' وہ کچھ اسی کا حصہ تھا۔ مستقبل کے تحفظ کا احساس ہی اس کے لیے نعمت خداوندی تھا۔ اس نے جواب میں "چاچی جی" کہہ کر گردن جھکالی اور چاچی اس کا مدعا جان گئی۔

"اچھا تمہیں خوش رکھے بیٹی۔" وہ اٹھ گئی۔

اسی رات ایک سادہ سی تقریب میں دونوں کا نکاح ہو گیا۔ برادری کے قریباً" سب ہی لوگوں نے نوردلی کے اس فیصلے کو سراہا تھا اور دونوں کی کامیاب زندگی کے لیے دعا کی تھی۔ نوردلی نے زہراں کو ساری برادری کے سامنے اپنی بیٹی بنانے کا اعلان کیا تھا اور بتایا تھا کہ حالات سدھرنے پر خود زہراں کو اپنے ہاتھوں رخصت کرے گا۔

دوسرے روز ایک قافلہ پونچھ سے پاکستان کی طرف ہجرت کر رہا تھا۔ اس قافلے کی حفاظت کے لیے مٹھی بھر جوان مرد بھی اپنی رائفلیں لیے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ قریباً" ہر سدھن عورت کے پاس اپنی حفاظت کے لیے چاقو یا کلہاڑی موجود تھی۔ شہر سے باہر جانے والے "محفوظ راستے" تک نوردلی اور اس کے جانباز بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ یہاں رہ جانے والے قریباً" سب ہی جوان مردوں نے اپنے اہل خانہ کو رخصت کر دیا تھا۔

یہ رخصت ہونے والے بدقسمت یہی گمان کرتے تھے کہ کچھ عرصے بعد ہی جب ان کے مسلمان پاکستانی بھائی مقامی مجاہدین کی مدد کو آ جائیں گے اور ان کے اجداد کی قربانیوں کا صلہ پاتے ہوئے پونچھ کو دشمن کے خونی پنجے سے نکال کر ان کے حوالے کر دیں گے' تب وہ سب یہاں فاتحانہ انداز میں داخل ہوں گے اور آزاد فضاؤں میں قیام کریں گے۔

سنے بدقسمت لوگ تھے وہ۔۔۔!

☆○☆

ہجرت سے سردی گھر تک کا سفر شروع ہونے کے لیے پل صراط کا سفر بن گیا تھا۔ موسموں اور مسافتوں کا عذاب بھوگتا وہ قافلہ سے بچھڑ گئے تھے۔ دن بھر چھپے رہتے' رات کو سفر کرتے۔ جنگلوں اور پہاڑوں سے سامنا ہونے کے بعد سردی کے ہاتھوں بھی کئی لوگ زندہ نہ بچ سکے۔

آسیہ کو اس سفر کی میں اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ شیرو کی ذات میں اسے اپنا "تحفظ" نظر آ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ محافظ ہر بات کہنے سے پہلے ضرور کر گزرے گا اور ہوتا بھی اسے اس کے بھائیوں سے ضرور بچا لے گا۔ اس شکل میں اس نے اپنا مستقبل بھی دیکھ لیا تھا۔

اس دوران دونوں نے جی بھر کے ایک دوسرے سے باتیں کی تھیں۔ اپنے گھر کی' اپنے بھائیوں کی' کشمیر' مجاہدین کی' پونچھ اور سردی گھر کی باتیں۔ کئی مرتبہ آسیہ کا جی چاہا کہ وہ کھل کر شیرو سے اظہار محبت کر دے۔ وہ ایسی ہی دلیر لڑکی تھی۔ اس نے امیرانہ اور آزادانہ سیاسی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس ماحول نے اس میں سے بلا وجہ کی جھجک کو کھرچ ڈالا تھا' لیکن وہ شیرو سے کبھی اس موضوع پر بات نہ کر سکی۔

شیرو نے بھی اس سے زمانے بھر کی باتیں کی تھیں' لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی اس سے زہراں کے متعلق کوئی بات نہ کر سکا۔ اصل میں وہ زہراں کی یادوں میں کبھی کسی کی شرکت گوارہ نہیں کرتا تھا۔ اس نے زہراں کی یادوں کو صرف اپنا سرمایہ حیات بنا رکھا تھا۔ کئی دفعہ اس کا جی چاہا کہ وہ کم از کم آسیہ کو یہی بتا دے کہ دہلی زہراں نام کی ایک لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہے جسے وہ کبھی بھلا نہ سکا۔ کبھی خود سے الگ نہ کر سکا۔ میدان کارزار میں جب کبھی اسے فرصت کے چند لمحات میسر آئے' زہراں چھم سے اس کے نہاں خانہ دل سے باہر نکل آئی' لیکن وہ آسیہ سے کبھی اس مسئلے پر بات ہی نہ کر سکا۔ ہر دفعہ اس کا رواجی حجاب آڑے آیا۔

آسیہ کے بھائیوں نے اس کو پوجا کی حد تک تعظیم دی تھی۔ انہوں نے شیرو کی منت کی کہ وہ ان سے احساس تشکر کے طور پر کچھ قبول کر لے' لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ لوگ اسے روکنے اور اس کی مہمانداری پر بضد تھے' لیکن شیرو کو تو آ کر پونچھ پہنچنے کی پڑی تھی۔

"میں آپ کی واپسی کی منتظر رہوں گی۔" آخر آپہ نے اس سے کہہ ہی دیا اور نبی
نے جب اس بات کی گہرائی کو پایا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔
"میں جس منزل کا مسافر ہوں آپہ اس پر جانے والے ہر ہی لوٹ کر آیا کرتے ہیں۔"
بڑی مشکل اس نے کہا اور آپہ کا جواب سنے بغیر ہی "خدا حافظ" کہہ کر باہر آ گیا۔
آپہ کا بڑا بھائی اس کے ساتھ بڑی دور تک آیا تھا۔ "شیرو بھائی! اس گھر کے دروازے
تم پر ہمیشہ کے لیے کھلے ہیں۔ اگر کبھی سلامت ملے تو ضرور آنا۔" اس نے دم رخصت اس
سے کہا تھا۔
شیرو اس سے الگ ہو کر سید حاجی خان سے آ کر ملا تھا جس تک ملاقات کی سب خبریں
اس کی آمد سے پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ دونوں رات گئے تک تیکری کی اسی دکان کے پیچھے
بنے تہہ خانے میں بیٹھے رہے۔ شیرو نے اسے ہوٹ کے ایک ایک لمحے کی کہانی سنا دی
تھی۔ پونچھ کے عام حالات کی خبر تو نبی خان کو تھی' لیکن وہ بھی اس سے بے خبر تھا کہ شیرو
کے گھر والوں پر کیا قیامت ٹوٹی ہے۔
"تم فوراً پونچھ پہنچو' وہاں ہمارے تمام شاہین جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ اپنے گھر
والوں کو آزاد علاقے کی طرف روانہ کر کے لوٹ آنا۔ اب ہمیں سری نگر کو مرکز بنانا ہے۔"
نبی خان نے اسے رخصت کر دیا۔
رات کے دوسرے پہر دو سائے ایک مکان سے برآمد ہوئے۔ یہ شیرو اور نبی خان تھے۔
نبی خان اسے سری نگر کے باہر تک چھوڑنے جا رہا تھا۔ ایک محفوظ مقام پر وہ اس سے
علیحدہ ہو گیا۔
"فی امان اللہ!" شیرو نے اس سے بغل گیر ہو کر الگ ہوتے ہوئے کہا۔
"فی امان اللہ!" نبی خان بولا۔
وہ کافی دیر تک وہاں کھڑا شیرو کو اندھیرے کی چادر میں غائب ہوتے دیکھتا رہا' پھر لوٹ
آیا۔

انجانی منزل کا مسافر

سورج اس کے عقب کی پہاڑیوں میں ڈوب رہا تھا جب وہ پونچھ سے [illegible]
داخل ہوا۔ اس نے اپنا چہرہ اس طرح عمامہ میں لپیٹ رکھا تھا کہ [illegible]
تک بھی نہ کرے اور وہ دیکھنے والی نگاہوں سے پوشیدہ بھی نہ رہے۔
---شہر کے گرداگرد پھیلی ہاروی سرگوں سے بچتے بچاتے اس نے جو راستہ
محفوظ راستہ اپنایا تھا۔ اس نے شہر کے باہری سورج کے غروب ہونے کا نظارہ کیا تھا۔
وہ ایک پہاڑی ٹیلے کی اوٹ میں سامنے پونچھ کی بکھری عمارتوں کو دیکھتا رہا تھا۔ پونچھ---
اس کی ہی نہیں کشمیر کے تمام حریت پسندوں کی آخری امید گاہ تھی۔ ہمارے [illegible]
جانے والی جدوجہد آزادی کا دارومدار پونچھ پر ہی تھا جہاں مجاہدین نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی
تھی لیکن--- ہر طلوع ہونے والی صبح ان کے لیے دشمن کی نفری میں اضافے اور ان
قافلہ بندیوں کی خبر لے کر آتی تھی۔
شیرو کی سوچوں کا محور زہراں تھی اور اس کی ماں---!
---اسے اس بات پر شرمندگی تھی کہ وہ جس مشن کے لیے گیا تھا' اسے مکمل نہیں
کر سکا اور حالات نے اسے راستے ہی سے لوٹ جانے پر مجبور کر دیا' لیکن اس کا ضمیر بہرحال
مطمئن تھا کہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اس سلسلے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی
تھی--- وہ اپنے فرائض میں کوتاہی کے گناہگار نہیں ہوئے تھے' پھر بھی نہ جانے کیوں
ایک بے نام سی خلش اسے ستا رہی تھی۔
اس کے بعد اس کی ماں اور زہراں پر کیا گزری تھی؟ اس کی خبر اسے بھی نہ ہو سکی۔
اسے تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ اس وقت کہاں ہوں گے۔ اس نے صرف شرفو کو اطلاع
میں لیا تھا اور اب وہ شرفو ہی کے ایک ٹھکانے کی طرف جا رہا تھا۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ
اپنوں کے ہاتھوں پونچھ میں ان کی بازی پٹ گئی ہے اور دشمن کے قدم روز بروز مضبوط ہو
رہے ہیں۔ یہ بات شیرو کے لیے اگرچہ چونکا دینے والی تھی' لیکن فی الوقت اس خبر نے

HBC

چاہتے ہوئے بھی اسے ایسا لگا بڑا اور اب وہ پرچھ کے باہر ایک بھاری پر بیٹھا اپنی آنکھوں سے بدلے ہوئے حالات دیکھ رہا تھا۔

"کیا گزری ہو گی میرے گھر والوں پر؟" یہی سوچ اسے گھلائے جا رہی تھی۔

اور اس کی سوچوں کا تانا بانا آخر فائر کے زوردار دھماکے کی آواز سے ٹوٹا۔ ہوم گارڈ کے ساتھ کچھ عرصہ گزارنے کے بعد وہ کم از کم اس قابل ضرور ہو گیا تھا کہ فائر کی شدت کا صحیح اندازہ کر سکے ـــــ یہ نی کی آواز اور اس کے بعد کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے دھماکے نے انکشاف کر دیا تھا کہ یہ میڈیم گن کا فائر ہے۔ یہ انکشاف ہی اس کے لیے کسی زوردار دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ "کتنی جلدی اور اچانک یہ تبدیلی آ گئی تھی۔"

وہ اپنے سائے سے بھی ہوشیار بڑے بچے تلے قدموں سے نیچے اتر آیا کیونکہ اس زوردار فائر کے بعد ہلکے اسلحے کی مسلسل فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔

ـــــ ایسی آنکھ مچولی وہاں اکثر ساری ساری رات جاری رہا کرتی تھی۔ فریقین اپنے اپنے کیمپ میں سے ایک دوسرے پر گولہ باری کرتے رہتے تھے۔ مجاہدین کے پاس ہلکا اسلحہ تھا اور وہ لوگ چھپ کر اکا دکا بھارتی فوجی پٹرول پر گھات لگایا کرتے تھے جب کہ ذرا سا شک گزرنے پر بھارتی فوج ان کے ٹھکانوں پر اندھا دھند گولہ باری کرنے لگتی تھی اور یہ سلسلہ صبح تک جاری رہتا تھا۔

شیرو کو اب یہ بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھیوں نے اپنے ٹھکانے وہیں رکھے ہوں گے یا بدل لیے ہیں۔

ـــــ اس کا رخ پونچھ کے اس گھنے جنگل کی طرف تھا جہاں اس کی دانست میں ابھی تک اس کے ساتھیوں کو ضرور موجود ہونا چاہیے تھا۔ نبی خان نے اسے بتایا تھا کہ حسین خان اپنے دستے کے ساتھ جموں کی طرف نکل گیا تھا اور بنوٹ میں اس سے الگ ہو جانے والے اس کے ساتھی مقلوم عورتوں کے ساتھ بہ حفاظت سری نگر پہنچ گئے تھے۔ انہی کی زبانی نبی خان کو بنوٹ والے حادثے کی اطلاع ملی تھی ـــــ گھیرے میں آ جانے والے ہوم گارڈز میں سے صرف شیرو ہی اسے مل سکا تھا۔

جنگل میں داخل ہوتے وقت شیرو سوچ رہا تھا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک اس جنگل میں دور دور تک کسی ڈوگرہ سپاہی کو پھٹکنے کی جرات نہیں ہوتی تھی اور آج وہ ڈر ڈر کر اور چھپ چھپ کر اپنے ساتھیوں کے پاس جا رہا تھا۔ اس جنگل کا کونہ کونہ اگرچہ اس کا دیکھا بھالا

تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے اس وقت یہ سب کچھ غیر مانوس سا نظر آ رہا تھا۔

پہاڑی سلسلے میں بظاہر وہ بڑا محفوظ ہو کر چل رہا تھا لیکن ایک دوسرا حصہ اس سے الگ ہوش مند تھا جو اچانک ہی اس کے سر پر سوار ہو گیا۔

"ہلاک" ایک پیغام اس کے پہلو میں گونجا۔

شیرو نے مڑ کر دیکھنا چاہا لیکن اس راکٹل کی مہلک مار شہ رگ سے ذرا ہی ادھر تھی۔ اسے واپس مڑنے پر مجبور کر دیا۔

"زیادہ چالاکی نہ دکھانا۔ ہاتھ اوپر اٹھائے رکھو۔ کون ہو تم؟"

"شیرو۔" اس کے منہ سے بہ مشکل اپنا ہی نام نکل سکا تھا کہ اسے اپنے منہ سے نکلتے ہوئے اور حیرت زدہ لہجے میں "شیرو؟" کی تکرار سنائی دی۔

وہ غیر ارادی طور پر آواز کی طرف گھوما۔ اس کے سامنے فرزند کھڑا تھا ـــــ اس کا ساتھی جو بنوٹ سے اس کے ساتھ ہی بھاگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شیرو کا ہاتھ اپنے منہ کی طرف اٹھا اور اس نے اپنے چہرے پر پسپچے کپڑے کو کرا دیا۔

"فرزند! تم..... تم زندہ ہو؟ اوہ میرے خدایا!" شیرو کو تو جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا' لیکن وہ فرزند کے دل و دماغ پر ٹوٹنے والی قیامت سے بے خبر رہا۔

"شیرو!" فرزند نے بمشکل اپنے بند گلے کو کھولا۔ اس کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھا اور بے تابانہ اس سے لپٹ گیا۔ "میرے خدایا مجھ سے انجانے میں کیا ظلم ہو گیا؟" وہ چیخا۔

"کیا بات ہے فرزند؟ کیا ہوا؟" شیرو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ادھر آ جاؤ۔" فرزند نے ایک سمت اس کی راہنمائی کی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح شیرو پر ٹوٹنے والی ان قیامتوں سے اسے آگاہ کرے جن کا شکار شیرو یکے بعد دیگرے ہو چکا تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس کا تو سب کچھ لٹ چکا ہے ـــــ سبھی کچھ۔ لے دے کے ایک زہراں رہ گئی تھی جو فرزند کے بہانے حالات کی بھینٹ چڑھ گئی۔

ـــــ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر قدرت نے شیرو کو روحانی عذاب کے ایک طویل سلسلے سے نکالنے کے لیے چن ہی لیا تھا تو وہ اس کھیل کا مہرہ کیوں بنا؟

وہ سوچ رہا تھا کہ خود میں اتنی ہمت کیسے لائے کہ اسے کچھ بتا سکے اور شیرو حیرت زدہ سا اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ دونوں قدرے محفوظ ایک گوشے میں آن کر ٹھہر گئے۔ یہاں مجاہدین کی ایک عارضی قیام گاہ شیرو کو درختوں کے جھنڈ میں خیمہ نما جھونپڑی کی شکل میں

نظر آ رہی تھی جو اس وقت بالکل خالی تھی۔ بس ایک کونے میں ایک لالٹین اور مٹی کا بالٹ سے بھرا ہوا کنستر رکھا تھا اور دوسرے کونے میں زمین پر گھاس پھونس سے بنی ایک چٹائی بچھی تھی۔

"بیٹھ جاؤ شیرو!"

وہ خود شیرو کے سامنے چٹائی پر بیٹھ گیا اور اپنی تمام تر قوتیں مجتمع کر کے اس نے شیرو کو ایک ایک کر کے ان تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔ اسے امید تھی کہ شیرو یہ سب کچھ سن کر دھاڑیں مار مار کر روئے گا اور بالآخر پاگل ہو جائے گا' لیکن وہ حیران رہ گیا کہ صبرو ضبط کا مجسمہ اس کے سامنے پتھر کے بت کی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

——— آنسوؤں پر تو اس کا اختیار نہیں تھا' لیکن اس نے کمال ہمت سے اپنے اندر ہی اندر اٹھنے والی سسکیوں اور آہوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

"میں تمہارا مجرم ہوں شیرو بھائی۔" اس نے رندھے ہوئے گلے سے شیرو کو مخاطب کیا۔

"نہیں فرزند! قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ میں ماں اور چچا کے بعد اپنی مکیتر کو بھی نہ پا سکوں۔ تم بھی بچے تھے فرزند۔ واقعی وہاں سے کسی کے بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ قدرت کو شاید اسی طرح زہراں کی بہتری منظور تھی' پھر شرفو کوئی غیر تو نہیں' آخر میرا دوست ہے——— میرا بھائی!" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے لیے اپنے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"شیرو بخدا! تم انسان نہیں۔ دنیا کے کسی انسان میں اتنا حوصلہ نہیں ہو سکتا۔ میں ان پہاڑوں کے حوصلے پر حیران ہوا کرتا تھا کہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں پر ہونے والے ایسے مظالم کو یہ صدیوں سے دیکھتے آ رہے ہیں اور ان کا سینہ شق نہیں ہوتا لیکن تم..... تم تو ان سے بھی بازی لے گئے شیرو۔" وہ سسک پڑا۔

شیرو نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے اپنے کندھے پر رکھی چادر سے اپنے آنسو پونچھے اور جب دوبارہ منہ پھیرا تو فرزند بھی خود پر قابو پا چکا تھا۔

دونوں کو اندر گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ دونوں جھونپڑی سے باہر آئے۔ ان کے سروں پر بوڑھا اور سرد آسمان اپنے دامن میں بکھرے ہوئے ستاروں کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ دور میدان راتوں کے بیمار چاند کی زرد کرنیں کپکپاتی ہوئی کشمیر کی منجمد فضاؤں سے ٹھوکریں کھا رہی تھیں۔

دونوں بہت دیر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ بالآخر شیرو نے ہی ہمت کر کے

کہا۔ "فرزند! وقت جلدی سے گزر رہا ہے۔ میرے خیال سے صبح ہونے والی ہے۔ ان کی کوئی تلاش ہماری طرف آئے اور تمہیں اپنے پہرے کی جگہ نہ دیکھ کر پریشان ہو جائے۔ یہاں بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔ تم مجھ پر ایک آخری احسان کرو۔"

"کہو بھائی!" شیرو نے اپنے گلے میں اٹکے غبار کو نگلتے ہوئے کمال ضبط سے کہا۔

"دیکھو فرزند! تمہارے سوا اور کسی کو میری یہاں موجودگی میں آمد کی خبر نہیں۔ میں ابھی یہاں سے واپس چلا جاؤں گا۔ تم یہی سمجھنا کہ تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں——— بس یہی جاننا کہ شیرو واقعی مر چکا ہے۔"

"شیرو———!" فرزند نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں فرزند بھائی! اب مجھ میں زندہ رہنے والی بات بھی آخر کیا رہ گئی ہے۔ میرا اب رہا ہی کیا ہے اس دنیا میں۔ بس ایک اپنی جان ہے۔ وہ تو میں نے بھی کی کشمیر کے لیے وقف کر دی تھی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اگر اب شرفو یا زہراں کو میرے زندہ ہونے کی اطلاع مل گئی تو ان کے دلوں پر کیا گزرے گی؟"

"شیرو خدا کے لیے مجھے کسی اور امتحان میں نہ ڈالو۔ میں تو پہلے ہی اپنے ضمیر کے ہاتھوں جانے کتنی سزا ساری عمر کے لیے بھگتتا رہوں گا۔ اوہ میرے خدایا! مجھ سے بڑا ظلم ہو گیا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو رہا۔

میں یہ کیا ظلم ہو گیا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو رہا۔

"فرزند!" شیرو نے بڑے تحمل سے کہا۔ "اگر تم نے حقائق کا سامنا نہ کیا اور کسی جذباتی پن کا شکار ہو گئے تو تم ان دونوں کی زندگیوں میں زہر گھول دو گے۔ اگر ان کا نکاح نہ ہو گیا ہوتا تو میں اڑ کر پاکستان پہنچ جاتا لیکن اب..... اب یہ ظلم ہو گیا۔ ان دونوں معصوموں نے آخر کیا گناہ کیا ہے؟ اور پھر قدرت نے اگر کسی بہانے زہراں کو خوشی کے چند لمحات دے ہی دیئے ہیں تو ہمیں کیا حق حاصل ہے اس سے یہ خوشیاں چھیننے کا اور یوں بھی فرزند——— میرے بھائی! تم بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ بخدا مجھے اس بات کا قطعاً کوئی گلہ نہیں۔ شرفو سے بہتر خاوند زہراں کو اس روئے زمین پر شاید کوئی اور نہ مل سکے۔ وہ..... وہ اسے سب کچھ دے سکتا ہے——— سب کچھ۔"

فرزند نے سر جھکا لیا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ صبرو وفا کے اس پتلے سے آنکھیں ملا کر بات ہی کر سکے۔ اس نے بادل نخواستہ شیرو کی اس بات پر صاد کیا کہ وہ اس کی زندگی کے راز کو راز ہی رہنے دے گا۔

وہ شیرو کو پھونکنے کے لیے پہاڑی سلسلے کے آخری کونے تک آیا۔ دونوں جذباتی انداز میں بغل گیر ہوئے اور دم رخصت کو فرزند کے آنسو بے اختیار اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ لیکن شیرو نے انتہائی صبر سے خود کو نارمل رکھا۔

چاند کی دم توڑتی روشنی میں جب وہ اجنبی منزل کے مسافر کو رخصت کر رہا تھا تو نجانے فرزند کو کیوں اپنی یہ ساری جدوجہد بے سود نظر آ رہی تھی۔ کوئی طاقت، کوئی بھروسہ، کوئی ہستی اس کے ہاتھوں میں بار بار سرگوشی کر رہی تھی کہ ——— اب وہ پرچھ کو کبھی دشمن کے چنگل سے رہائی نہیں دلا سکیں گے۔

———بھاری قدموں اور بوجھل دل کے ساتھ وہ واپس ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت دیر تک اندھیرے کی اس چادر میں کھوئے ہوئے شیرو کو ڈھونڈتی رہی تھیں جو اس کے سامنے انسانی مظلومتوں کے نئے باب کھول کر اس سے رخصت ہو گیا تھا۔

☆○☆

شیرو جب اس مقام تک پہنچا جہاں فرزند نے اس کی ماں کی قبر کی نشاندہی کی تھی تو اسے اچانک اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ اب تک اس کے اندر پیدا ہونے والی جس قوت نے اسے حوصلہ دے کر مکمل مرد بنائے رکھا تھا، وہ جیسے اس کے جسم سے یک دم باہر نکل گئی۔ اور جب تک پتھروں کے اس ڈھیر تک پہنچا جسے مٹی کے اوپر کسی نے قبر کی طرح چنا ہوا تھا تو وہ ایک معصوم بچے کا مکمل روپ دھار چکا تھا۔

بے اختیار وہ پہلے قبر کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے کی سمت پھیلے اور وہ قبر سے لپٹ کر بچوں ہی کی طرح سسکیاں لینے لگا۔

———ضبط کے تمام بندھن کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ چکے تھے۔

———روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی، پھر آہستہ آہستہ جیسے اسے صبر آ گیا۔ اس کے اندر اٹھنے والے طوفان نے آنکھوں کے راستے نکاس کی راہ ڈھونڈ کر اسے بڑے لمبے کرب سے نجات دلا دی تھی۔ وہ پھانس جو فرزند سے ملاقات کے بعد سے اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی تھی، اب نکل چکی تھی۔ اسے اپنا وجود خاصا ہلکا محسوس ہونے لگا تھا۔

اس کے عقب میں سورج کی نکھرتی ہوئی کپکپاتی کرنوں نے ڈرتے ڈرتے پونچھ کے پہاڑوں اور مجاہد نوازوں کو بوسے دینے شروع کر دیئے تھے۔ شاید وہ ان سربلندوں کو اس طرح خراج عقیدت پیش کر رہی تھیں جنہوں نے اپنا تن، من، دھن سبھی کچھ کشمیر کی آزادی

شیرو اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھ [illegible] ہاری ہاری اس نے راہ آزادی کے شہیدوں کے لئے [illegible] جذباتی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

[illegible] تکرا گئے ہیں۔ ہماری اسی طرح مدد فرما جس طرح تو نے [illegible] نقاب سینہ سپر ہونے والوں کی مدد کی تھی۔ الٰہی! ہمیں [illegible] پھین سکیں۔" اس نے جھک کر ماں کی قبر کو بوسہ دیا اور جس راستے سے آیا تھا اسی راستے واپس ہو گیا۔

اب اس کی منزل سری نگر تھی———!

☆○☆

۲۰ اپریل ۱۹۴۸ء کو حکومت پاکستان کو پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی کی طرف سے ایک باضابطہ رپورٹ موصول ہوئی——— اس رپورٹ میں لکھا تھا۔

"قبائلیوں کو پاکستان سے براہ راست مدد نہ ملنے کی وجہ سے بھارتی فوج نے مظفر آباد کے علاقے میں جو فتوحات حاصل کی ہیں وہ حکومت پاکستان کے لیے اس پہلو سے بھی خطرناک ہیں کہ اس طرح طیش کھا کر وہ پاکستان کے خلاف ہی نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر حکومت پاکستان چاہتی ہے کہ وہ ۲۵ لاکھ کشمیری مہاجرین کے سیلاب سے خود کو محفوظ رکھے، بھارتی فوج کو اپنے پہلوؤں پر سانس لور عقب میں نہ بیٹھنے دے، فوج کا مورال نہ گرنے پائے، تخریب کار سیاسی قوتوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو تو پاکستان کے لیے لازم ہے کہ وہ بھارتی فوج کو اوڑی، پونچھ، نوشہرہ کی لائن سے آگے نہ بڑھنے دے۔

(بحوالہ: سیکورٹی کونسل الیس-پی-وی- ۸ فروری ۱۹۵۰ء)"

اس رپورٹ نے سیاسی ایوانوں میں کافی ہلچل مچا دی اور وہ لوگ جو اب تک اس کوشش میں تھے کہ پاکستانی فوج کا براہ راست تصادم بھارتی فوج سے نہ ہونے دیں، انہیں بھی اپنی سوچ بدلنے پر مجبور ہونا پڑا۔

———حکومت پاکستان کی ہدایت پر کچھ فوجی دستے کشمیر کی طرف اس ہدایت کے روانہ کیے گئے تاکہ وہ آزاد کشمیر فوج کے عقب میں رہیں۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ براہ راست

بھارتی فوج سے ٹکرانے کا خطرہ ناگزیر حالات ہی میں مول لیں اور صرف دفاع ہی پر اکتفا کریں۔

اپریل کے آخر ہی میں کوہاٹ چھاؤنی میں موجود جنرل طارق کو حکم ملا کہ وہ راولپنڈی پہنچے جہاں سے سی کے وسط میں ڈویژن کمانڈر نے ان کے بریگیڈ کا کچھ حصہ جنرل ہی کی کمانڈ میں محاذ کی طرف بھیج دیا۔

بھارتی فوج کا مرکزی ہیڈکوارٹر اب سری نگر بن چکا تھا اور ان کے دیلی ہیڈکوارٹروں کی پوزیشنیں دیکھ کر جنرل طارق نے اندازہ لگایا تھا کہ دشمن کا بڑا حملہ بارہ مولا اوڑی روڈ کی طرف مظفر آباد کی سمت ان کے سیکٹر پر ہو گا۔

دشمن کے ممکنہ حملے والی جگہ اوڑی کے سامنے سڑک کے دونوں اطراف جنرل طارق نے ایک بٹالین پاک فوج' کچھ دستے فرنٹیئر فورس کے' کچھ اسکاؤٹ جن کی تعداد بمشکل ایک سو تھی اور آزاد کشمیر کے کچھ دستے لگا دیئے۔ یہ باقاعدہ بٹالین نہیں تھی بلکہ رضاکارانہ طور پر جنگ میں حصہ لینے والے بلا تنخواہ فوجیوں پر مشتمل تھی جن کے پاس ہلکا اسلحہ اور رائفلیں تھیں۔

شمال کی طرف نیڑال سے آگے کرشن گنگا وادی بھی اسی سیکٹر کا حصہ شمار ہوتی تھی جسے پہاڑی سلسلے نے کاٹ کر بالکل الگ کر رکھا تھا جہاں ایک کمپنی پاکستانی باقاعدہ افواج کی رکھی گئی تھی۔ اس سے کچھ پیچھے جنرل طارق کے بریگیڈ کی تین کمپنیاں مظفر آباد' کوہالہ اور بارہ میں پوزیشن لیے بیٹھی تھیں جن سے صرف مقامی دفاع مقصود تھا۔ ان کے ایڈوانس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بریگیڈ کی آدھی بٹالین سری میں' باقی پونچھ کے بالمقابل مورچہ بند تھی جس کی کمان جنرل کے پاس نہیں تھی اسے بریگیڈ ہیڈکوارٹر سری میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔

جنرل طارق کی جہاندیدہ نگاہوں نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ اوڑی کے بالمقابل ان کی نفری دشمن کا حملہ روکنے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ جنرل نے تجویز پیش کی کہ بجائے رک کر دشمن کا حملہ روکنے کے پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن پر پہلوؤں سے گھاتیں لگائی جائیں۔ اس طرح وہ پریشان ہو کر سڑک سے ہٹ کر بکھر کر چلے گا۔ جنرل کی تجویز منظور ہو گئی اور اس نے توپخانوں نے قریباً پچاس میل لمبی سڑک کو کوہالہ سے بارہ کے علاقے تک مقامی آبادی کی مدد سے آمدورفت کے قابل بنا دیا۔

دشمن کا جنرل کو حکم ملا کہ بریگیڈ کی کمان کسی اور کے حوالے کر کے نیڑال کے راستے

پہاڑی علاقے کی طرف اگلی پوسٹ جہاں جنرل کو پانچ ہزار قبائلیوں کے ساتھ سری نگر کی طرف آگے بڑھ کر شب خون مارنے تھے۔

اس کارروائی کا مقصد یہی تھا کہ دشمن کی توجہ نظر نگر سے ہٹا کر شمال کی طرف کر دی جائے۔ اس طرح اس کی نفری بٹ جائے گی اور حملے کی قوت میں بھی کمی آ جائے گی۔ قبائلیوں کو جمع کرنے میں کم از کم پندرہ دن لگتے۔ بس کے بعد نیڑال سے آگے پہاڑیوں میں جہاں ان کا سفر کرنا تھا۔ یہ تجویز تو اچھی تھی لیکن وہ سے عمل میں آئی تھی۔ ۲۶ مئی کو جنرل نے رپورٹ دی کہ قبائلیوں کی آمد تک انہیں اس "نازک محاذ" پر رہنے دیا جائے کیونکہ دشمن کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ اس رپورٹ کی روانگی کے بمشکل ایک گھنٹہ بعد بھارتی فوج نے زبردست حملہ کر دیا۔ دشمن نے اپنے حملے کا زور دریائے جہلم کے دونوں پہلوؤں اور شمال میں نیڑال کی سمت رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل طارق کو یہ پریشان کن اطلاعات بھی ملنے لگیں کہ ہمارے ہراول دستے منظم انداز میں پسپائی اختیار کر رہے ہیں' لیکن بعض مقامات پر دشمن کو زبردست زک اٹھانی پڑی تھی۔ جہاں تک نیڑال کے شمالی علاقے کا تعلق تھا' جنرل کے لیے وہاں کچھ بھی کرنا ممکن نہیں تھا۔ موجودہ کمپنی کو پیچھے ہٹ آنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سڑک کے کناروں والے محاذ کو مضبوط کرنے کے لیے جنرل نے سری میں موجود کمپنی کو اس طرف روانہ کر دیا۔ اسے امید تھی کہ اگر ان لوگوں کو پسپا بھی ہونا پڑا تو وہ چکوٹھی میں آ کر دفاعی پوزیشن اختیار کر لیں گے جہاں دشمن کو روکنے کا کام زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔

۲۰ مئی کی شام بٹالین کمانڈر کا پیغام ملا کہ اس کے دستے دشمن کی ہلکی کن گولہ باری اور انفنٹری کے حملوں کی زد میں ہیں اور وہ لوگ مسلسل پسپا ہو رہے ہیں۔ دشمن اوڑی اور چکوٹھی کے درمیان پہنچ چکا ہے۔

یہاں آزاد کشمیر کے دستوں پر حملہ ہوا اور وہ بھاگ اٹھے۔ اب ایک وسیع و عریض علاقے کی حفاظت کی ذمہ داری پاکستانی فوج کی مختصر سی جمعیت کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔

جنرل نے بریگیڈ ہیڈکوارٹر سے نکل کر محاذ پر پہنچنے کا فیصلہ کر لیا اور اسی شام وہ اپنے دو اسٹاف افسروں کی معیت میں مظفر آباد پہنچ گیا جہاں شہریوں کے بھاگتے ہوئے تانگوں کے پیچھے پیچھے فرنٹیئر سکاؤٹس کی دو پلاٹون بھی سر پر پاؤں رکھے بھاگے چلی آ رہی تھیں۔ جنرل نے ان لوگوں کو روک لیا تھا۔ وہ محاذ پر واپس جانے سے انکاری تھے۔ پٹھانوں نے رائفلوں کی زد میں ان سے اسلحہ رکھوا لیا۔ جنرل کے حکم پر ان کے دو افسروں کو حراست میں لے لیا

HBC

گیا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل کے ساتھیوں نے ان کی لاشوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ دونوں افسروں کو جنرل کے حکم پر رات میں لے کر ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا۔ چکوٹھی پہنچ کر جنرل کو اطمینان ہو گیا کہ تک یہاں موجود پاک فوج کے بریگیڈ کمانڈر' افسروں اور جوانوں کا مورال بہت بلند تھا اور وہ واقعی دشمن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن چکے تھے۔

وہ کمپنی جسے جنرل نے دریا پار جانے کا حکم دیا تھا' اسی خدشے کے پیش نظر دریا کے کنارے کھڑی رہی کہ دشمن دوسری طرف آ چکا ہے۔ جنرل کے ساتھیوں نے ریکی کر کے اس خدشے کو غلط قرار دیا اور اس کی خصوصی نگرانی میں اس کمپنی کو دریا پار پہنچا کر مورچہ بند کیا گیا۔ جنرل طارق خود بھی چکوٹھی پہنچا جسے اب دفاعی قلعے میں تبدیل کرنے کا پروگرام طے پا چکا تھا۔۔۔۔ اس کا بریگیڈ انٹیلی جنس آفیسر اس دوران آزاد کشمیر کے جی۔ایچ۔کیو سے خاصی معلومات فراہم کر چکا تھا۔

☆○☆

اندلو و شمار نے جنرل کو آگاہی دی کہ اس علاقے میں موجود دشمن کی نفری ۱۲ پلٹنوں پر مشتمل ہے جن کے پاس ۱۲ بھاری مشین گنیں' ۲۴ توپیں' ۱۲ ٹینک شکن توپیں اور ۹ بکتر بند گاڑیاں ہیں جب کہ ان کی ایئر فورس اپنی تمام تر قوت کے ساتھ ان کے سروں پر موجود ہے۔ اس فوج کو روکنے کے لیے جنرل طارق کے پاس اس علاقے میں ساڑھے تین پلٹنیں اور صرف ۴ بھاری مشین گنیں تھیں۔

ان حالات میں مختصر جیت کے ساتھ دشمن کے منہ لگتا جوانوں کو حرام موت مارنے کے مترادف ہوتا۔ اگر جنرل دفاعی پوزیشن بھی اختیار کرتا تو بھی غنیم اپنی طاقت کے بل پر ان کی پوزیشنوں کو جلد یا بدیر روند کر آگے نکل جاتا۔ لہٰذا اس نے اپنی جنگی حکمت عملی بدلی اور پابند یہ بنا کہ دشمن کے پہلوؤں کو پہاڑی کے اندر دور تک حملے کر کے اس طرح بکھیر دیا جائے کہ اسے اپنی قوت ایک جگہ مرکوز کرنے کے مواقع میسر نہ آئیں۔

بھارتی فوج پر پٹھانوں کی دہشت طاری تھی اور جنرل جانتا تھا کہ دشمن قبائلیوں کے حملوں سے اپنی عین فورس کو بچانے کے لیے پہلوؤں کو پھیلا دے گا۔ ابھی تک زیادہ تعداد میں قبائلی پٹھان جنرل کو میسر نہیں تھے' اس لیے اس نے پٹھانوں کا کام بھی پاکستانی فوج کے جوانوں سے ہی لیا تھا۔

جس نے ایک بٹالین کو دریا کے کنارے چکوٹھی پر رکھا اور دوسری کو دریا کے پار "ب" ڈویژن کی "بی" پوزیشن کے بائیں طرف بلند پہاڑی پر پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ ہی قبائلیوں اور پاک فوج کے

جوانوں کے ملے جلے دستے ترتیب دے کر دشمن کے پہلوؤں پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دیئے۔

اس سے یہ فائدہ تو کم از کم شروع میں حاصل ہوا کہ دشمن کے پہلوؤں پر حملے ہونے لگے لیکن اس کی فائر پاور اور اس کی ٹینک شکن توپوں کے مقابلے میں قبائلی ٹھہر نہ سکے اور آہستہ آہستہ چکوٹھی اور ب ڈویژن کی طرف پیچھے ہٹنے لگے۔

رات کے آخر تک دشمن اتنی تعداد میں جمع ہو گیا تھا کہ اس نے چکوٹھی کے سامنے تازہ حملے کے لیے پر تول رہا تھا۔

۔۔۔۔اسی اثناء میں چکوٹھی کے محاذ کا پیمانہ مار پارٹیوں' دشمن کو ہلکی سست اور چھاپا مار کارروائیوں سے پریشان کرنا چاہا گیا۔ صورت حال خاصی اطمینان بخش تھی۔ پھر اس کے بعد دشمن پر زوردار حملہ کرنا چاہا گیا۔ لیکن ہر دفعہ منہ کی کھائی اور پیچھے ہٹ گیا۔

اب دوری پر جنرل نے اپنے دستوں کو چکوٹھی اس طرح ترتیب دیا تھا کہ دشمن نے اس طرف سے کھلا حملہ کرنے کی جرات ہی نہ کی۔

کافی عرصے تک ان کے درمیان آنکھ مچولی جاری رہی۔

۔۔۔۔اس دوران جنرل کے برق رفتار دستے دشمن پر قہر بن کر ٹوٹتے رہے۔ انہوں نے اسے مختلف پہلوؤں سے اس قدر نقصان پہنچایا کہ دشمن کا مرکز کمزور ہوتے ہوتے بالآخر بکھر کر رہ گیا اور وہ ایڈوانس کرنے کے بجائے رک کر اپنی نفری کو ایک مرکز پر سمیٹنے لگا۔

شمالی محاذ پر دشمن نے نیزوال سیکٹر میں چار پلٹنوں کے ایک بریگیڈ سے پیش قدمی کی۔ اس علاقے کی کمان بریگیڈیئر افتخار احمد کو سونپی گئی تھی جو کافی عرصے تک صرف ایک راکٹل پردار کمپنی کے ساتھ دشمن کے لیے باعث عذاب بنے رہے۔

اس دوران جنرل طارق کے بریگیڈ کو مزید ایک پلٹن اور ۲ فیلڈ گنوں کی کمک پہنچ گئی۔ جون کے آخر تک دشمن اپنے قریباً" بارہ سو جوان ہلاک اور زخمی کروا کر اپنے زخم چاٹنے پر مجبور ہو چکا تھا۔

وی۔پی مینن اپنی کتاب Integration of Indian State میں لکھتا ہے:

"آٹھ صدیوں سے محمود غزنوی کے دور سے ہندوستان شمال مغرب کی سمت سے مسلسل حملوں کی زد میں رہا ہے۔ اکیلے محمود غزنوی نے ۱۷ حملے کیے۔ اب مملکت پاکستان کے وجود میں آنے کے محض دس ہفتے بعد ہم پر شمال مغرب سے قبائلی حملہ کروایا گیا تھا۔

جب میں نے بھارت سے کشمیر کے الحاق کی سفارش کی تو میرے ذہن نظر میں صدیہ تھا کہ تاریخ کہیں خود کو دہرانے نہ لگے اور یہ طوفان ایک مرتبہ پھر سری نگر کو روندتا ہوا بھارت میں داخل ہو جائے۔ آج سری نگر تو کل دہلی کی باری بھی آ سکتی ہے۔ جو قوم اپنی تاریخ اور جغرافیہ بھول جائے' جلد ہی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔"

مینن نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے' وہ بنیاد تھے اس جنگی حکمت عملی کے جو بھارتی فوج نے کشمیر میں اپنائی۔ وہ لوگ قبائلیوں سے اتنے خوفزدہ تھے کہ انہیں کشمیر ہی میں روک دینا چاہتے تھے تاکہ یہ سیلاب اپنا رخ بدل کر کہیں سارے بھارت ہی کو نہ نگل جائے۔

اوڑی محاذ سے آگے بھارتی فوج اپنی طاقت کے بل بوتے پر مزید آگے بڑھ سکتی تھی' لیکن وہ جانتی تھی کہ اس سے آگے کا علاقہ قبائلیوں کی بہترین شکار گاہ تھا۔ وہ اب قبائلیوں کی بھینٹ چڑھنے پر تیار نہ تھے۔

☆○☆

بھارتی افواج کے زوردار حملوں کا دم خم تو ٹوٹ چکا تھا' لیکن ابھی اوڑی کا محاذ خاموش نہیں ہوا تھا۔ وہاں جنگ مسلسل ہو رہی تھی۔ خصوصاً" ایئر فورس کے جہازوں نے تو تباہی کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ وہ سورج کی روشنی پھیلتے ہی اپنے حملوں کا آغاز کر دیتے اور شام ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔

ایک روز جنرل طارق کو حکم ملا کہ آگے بڑھ کر پانڈو کی پہاڑی پر قبضہ کر لیں۔

"پانڈو" نو ہزار فٹ بلند ایک پہاڑی تھی جو اپنے دامن میں بسے گاؤں کے نام کی نسبت سے جانی جاتی تھی۔ جنرل کے زیر قبضہ بب ڈوری کی پہاڑی کے بالکل سامنے یہ سلسلہ ہائے کوہ نظر آتا تھا جس کے دائیں جانب تین ہزار فٹ نیچے دریائے جہلم بہہ رہا تھا اور دریا کے پار نظر آنے والی سڑک پہاڑوں کے مختلف پہلوؤں کو کاٹتی ہوئی گزرتی تھی۔ اس سے تھوڑا آگے آٹھ ہزار فٹ بلند ایک اور پہاڑی سلسلہ تھا۔

بب ڈوری کی بائیں طرف واقع "تانگائیک" قریباً" دس ہزار فٹ بلند اور بب ڈوری کے بائیں اوپر جھکا ہوا نظر آتا تھا۔ اس سے آگے "روسی کوتا" ساڑھے گیارہ ہزار فٹ بلند اور اس کے سامنے دس ہزار فٹ کی اونچائی پر "بلند سنگ" تھا۔ اس طرح دریا کے متوازی یہ سلسلہ ہائے کوہ پھیلتا چلا گیا تھا جس کے دامن میں "پانڈو" واقع تھا۔

اسی پانڈو پہاڑی کی ایک ڈھلان پر نیم کے پہاڑی توپ خانے کا ایک سیکشن دریا کے دوسرے کنارے پر مورچہ بند تھا جس نے پچھلے قریباً" ایک مہینے سے چکوٹھی اور اس کے

سڑک کی پانچ میل لمبائی کو مسلسل اپنی زد میں لیا ہوا تھا۔ انہوں نے پانچ میل علاقے کے چپے چپے کو "مارک" کیا ہوا تھا اور وہاں اس تواتر سے گولہ باری کر رہے تھے کہ اس علاقے سے کسی پاکستانی ہوائی جہاز کے لیے سر اٹھانا بھی مشکل تھا۔

چونکہ یہ سیکشن بلندی پر مورچہ زن تھا اس لیے اس کی نگاہوں سے رات کے اندھیرے میں بھی بچ نکلنا مشکل تھا۔ ذرا سا غلط ہونے پر وہ لوگ "روشنی راونڈ" داغ رہے تھے اور اس روشنی میں نقل و حرکت کرتی کسی بھی شے پر گولوں کا مینہ برسا دیتے تھے۔ اس کمپنی کو ختم کرنے کے لیے ان پر اچانک حملہ کرنا ناممکن تھا۔ نہ ہی ان پر پہاڑوں سے حملہ ہو سکتا تھا۔ صرف ایک ہی صورت تھی کہ کسی بھی طرح پانڈو پہاڑی پر قبضہ کر لیا جائے جس کے بعد ہی یہ سیکشن ہمارے قابو آ سکتا تھا۔

پانڈو پر قبضہ کرنے کے لیے "بب اوری" سے اڑھائی ہزار فٹ بلندی تک چڑھنا پڑتا تھا جہاں سے دریا کا کنارہ شروع ہوتا تھا۔ اس علاقے میں ہمارویاں اور درہات تو کمیاب تھے لیکن چٹانیں اور برساتی نالے بڑی اچھی اوٹ فراہم کرتے تھے۔ بب اوری کے سامنے دشمن سیدھی پہاڑی سے ذرا دور تین بلند چوٹیوں حملہ آوروں کا راستہ روکنے کے لیے سینہ تانے کھڑی تھیں جن کی بلندی چھ ہزار فٹ سے سات ہزار فٹ تک تھی اور یہ چوٹیوں درختوں سے بڑے شاندار طریقے سے قدرت نے "کیموفلاج" کر رکھی تھیں۔

بائیں طرف ایک چوٹی سے قریباً" ڈیڑھ دو میل لمبا ایک راستہ پانڈو تک جاتا تھا' لیکن یہ راستہ گھنے درختوں سے گھرا ہوا' انتہائی دشوار گزار اور ناقابل عبور تھا۔ اس راستے سے ایڈوانس کرنا بے حد مشکل تھا کیونکہ دشمن نے اردگرد کے تمام درختوں میں توپیں نصب کی ہوئی تھیں اور اس کی محفوظ اور مضبوط مورچہ بندیاں اس راستے سے اونچائی پر اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔

ان حالات میں تمام جنگی فوائد بھارتیوں کو حاصل تھے کیونکہ ان کی ہر پوزیشن پر صرف سامنے سے اور وہ بھی ان سے انتہائی کم بلندی سے حملہ کیا جا سکتا تھا جو موت سے کھیلنے کے مترادف تھا۔

یہ اس قدر مضبوط مورچہ تھا کہ ہماری فوج نے اسے خفیہ طور پر "دہلی" کا نام دے رکھا تھا۔ گویا پانڈو کی تسخیر دہلی کی فتح سے ہرگز کم نہ تھی جب کہ بھارتی فوج نے اپنی ان مورچہ بندیوں کو "کراچی" کا کوڈ نام دے رکھا تھا۔

دشمن کی نفری یہاں پاکستانی افواج کے مقابلے میں کم از کم سات گنا زیادہ تھی۔ جنرل

طارق نے اندازہ کر لیا تھا کہ فتح کا دارومدار کسی ایسی چال چلنے پر ہے کہ دشمن اپنی تمام فوج کو ان کے مقابلے میں اس جگہ نہ لا سکے۔ چنانچہ کافی سوچ بچار اور ریکی کے بعد بالآخر ایک ایسا مقام چن ہی لیا اور وہ تھا پانڈو کا گاؤں —— یہ گاؤں ایک طرح سے اس علاقے میں مورچہ بند فوج کے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت رکھتا تھا۔

چکوٹی اور بب ڈوری میں جنرل نے ایسی پوزیشن میں اپنے جوانوں کو مورچہ بند کیا تھا کہ ان پر ایک ایک حملہ ہی ممکن تھا اور ایک بٹالین کے لیے کم از کم ایک بریگیڈ کو حملہ کرنا پڑتا۔ دو بریگیڈ سے کم اس علاقے میں جنرل کی اختیار کردہ پوزیشنوں پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس دوران جنرل نے انتہائی ہوشیاری اور جنگی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ایسی چالیں چلیں کہ دشمن کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

اس نے پٹھانوں کی مدد سے دشمن کے پہلوؤں پر مسلسل نقب لگائے رکھی اور اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی پوزیشنوں کو پھیلاتا چلا جائے۔ دشمن نے اپنی پھیلی ہوئی ہر پوزیشن پر کم از کم دو کمپنیاں لگا دی تھیں' جن کے درمیان فاصلہ تھا اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ ایک دوسرے کی مدد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔

☆○☆

پانڈو چھوں میں دشمن کی ایک بٹالین فوج تھی۔ جس پر حملہ کرنے کے لیے جنگی اصولوں کے مطابق کم از کم تین بٹالین فوج درکار تھی جب کہ جنرل کے پاس حملہ کرنے کے لیے بہ مشکل آدھی بٹالین تھی جسے بالآخر پٹھانوں اور کشمیری مجاہدین کی مدد سے ایک بٹالین تک پہنچا دیا گیا۔

——اور اس ایک بٹالین نے اپنے سامنے موجود سات ہزار فٹ بلند تہہ در تہہ پہاڑی سلسلے کو عبور کر کے پانڈو تک پہنچنا تھا جب کہ ان کے راستے میں دو بھارتی کمپنیاں' جن کی مدد کے لیے توپ خانے کی بیٹریاں موجود تھیں' مورچہ بند تھیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر پاک فوج کا تصادم ان کمپنیوں سے ہو جاتا تو حملہ آور فوج کا کافی حصہ یقیناً یہیں ختم ہو جاتا اور پانڈو پر حملہ کرنے کی قوت بمشکل ایک چوتھائی ہی رہ جاتی۔

جنرل طارق کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ کوئی ایسا راستہ مل جائے جس سے گزر کر وہ رات کے کسی حصے میں کوئی جھڑپ مول لیے بغیر پانڈو تک پہنچ جائیں۔

جنرل طارق نے چند قبائلی سرفروشوں کو "ریکی" کے لیے بھیجا اور بالآخر وہ لوگ ایک

ایسا راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے جس سے گزر کر وہ پانڈو گاؤں کے مغرب کی سمت سے پہنچ سکتے تھے۔۔۔۔ اس راستے سے ان لوگوں کو رات کی تاریکی میں دشمن کے مورچوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے چھ ہزار فٹ بلند پہاڑی عبور کرنا تھی۔

——اس دوران وہ اتنا تھک جاتے کہ ان کے لیے فوراً حملہ کرنے سے پہلے تھوڑا آرام کرنا بے حد ضروری تھا۔

یہ آپریشن ۳۶ گھنٹوں پر محیط تھا اور ان لوگوں کو ایک رات اور اگلا سارا دن دشمن کے بالکل سامنے اور اس کے اگلے مورچوں کے عقب میں اس کی نظروں سے بہرصورت اوجھل رہنا تھا۔ ذرا سا شک گزرنے پر دشمن ان لوگوں کو ہوائی حملے کے سرکش سے ملیا میٹ کر سکتا تھا اور مجبوس پرندوں کی طرح گھیر کر مار سکتا تھا۔

ان تمام خطرات کے باوجود جنرل نے اپنی سی کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا—— دو ہزار قلیوں کی مدد سے جنرل اپنا توپ خانہ ہارگٹ کے بالکل سامنے لے آیا۔ ان لوگوں نے دریا کے آر پار لوہے کا مضبوط رسہ باندھ لیا جس کی مدد سے بیک وقت دو آدمی اور تین سو پاؤنڈ وزن لایا اور لے جایا جا سکتا تھا۔

پٹھانوں کے تین لشکر جن میں سے ہر ایک کی نفری سو پر مشتمل تھی' ترتیب دیئے گئے۔ ان میں سے دو کے ذمے دشمن پر مسلسل حملے کرنا اور تیسرے کے ذمے بھاگتے دشمن کا تعاقب کرنا تھا۔

۱۷ جولائی ۱۹۴۸ء کو غازیان صف شکن اپنے سروں سے کفن باندھے تقسیم پر تیار کر رہے تھے۔

——اگلے روز عبداللہ کے سپاہی ندی عبور کر کے دشمن کے علاقے میں دور اندر تک گھس گئے۔ آسمان نے ان کی عظمتوں کو سرجھکایا اور ان کی مدد کے لیے گھنگھور گھٹائیں برسنے لگیں جس سے ان کی آواز دشمن تک نہ پہنچ سکی۔ یہ بٹالین ایڈوانس کرتی ہوئی راستے میں بڑی کامیابی سے ٹیلی فون کے تار بچھاتی چلی جا رہی تھی۔

بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں ان کا کمانڈر ان سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ رات گئے بٹالین کوئی جھڑپ مول لیے بغیر دشمن کے اگلے مورچوں کے عقب میں ایک میل اندر ایڈوانس کر گئی۔ صبح ہونے لگی تھی۔ وہ لوگ منصوبے کے مطابق روپوش ہو گئے اور اب انہیں اگلی رات کا منتظر ہونا تھا۔

☆○☆

دشمن کا خیال اپنی طرف مرکوز رکھنے کے لیے قبائلی پٹھان اور کشمیری مجاہدین اس کے پہلوؤں سے پے در پے مسلسل کاری ضربیں لگا رہے تھے جب کہ جنرل نے اپنا توپ خانہ بالکل خاموش رکھا ہوا تھا تاکہ دشمن کو کسی بڑے حملے کا گمان نہ گزرے۔

اگلی رات پھر حملہ آور فوج کا مطمئن سفر جاری رہا' سوائے ایک واقعے کے ——— وہ یہ کہ ان کا ایک کشمیری مجاہد جو گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا' دشمن کی گشتی پارٹی کے ہتھے چڑھ گیا۔

دشمن اس جوان مرد کو اپنے ہیڈکوارٹر میں لے گئے۔ اس پر انہوں نے جملہ بھر کے ستم توڑے کہ کسی طرح وہ یہاں موجود کسی "غیر معمولی کارروائی" کا اقرار کر لے' لیکن آفرین ہے اس مرد غازی پر کہ دشمن اس کے لب نہ کھلوا سکے۔ الا یہ کہ وہ مرتبہ شہادت سے سرفراز ہو گیا۔

یہ رات بھی بخیر و عافیت گزر گئی۔

حملہ آور بٹالین یہاں سے دو کالموں میں بٹ گئی۔ ان دونوں کالموں کو اب مزید پانچ ہزار فٹ بلند ایک پہاڑی سلسلہ عبور کرنا تھا ——— یہ پہاڑیاں نوکیلی تھیں جن کی چٹانیں عمودی اور راستہ ناہموار تھا۔ بارش نے جگہ جگہ پھسلن پیدا کر دی تھی اور جہاں اب پاؤں بمشکل زمین پر ٹکتا تھا۔

بہرحال اگلے روز جنرل کو خوش خبری ملی کہ دائیں کالم نے پانچ میں نو ہزار تین سو فٹ بلند ایک چوٹی پر قبضہ جما لیا ہے۔ یہ چوٹی پانچ کے بالکل سر پر کھڑی تھی۔ دشمن کو جب خبر ہوئی تو اس نے بلٹ میں حملہ کیا' لیکن اب میدان اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس لمحہ تیر وہ سرا کالم پانچ سے قریباً پانچ سو گز دور پہنچ چکا تھا۔ اس کالم کو خلاف توقع بہت زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اچانک دشمن کی ایک پارٹی کی زد میں آ گیا' جو پیچھے جا رہی تھی۔

تیرہ دم دشمن نے اس تھکی ہاری فوج پر جس کا رابطہ بھی ہیڈکوارٹر سے کٹ چکا تھا' اچانک حملہ کر دیا۔ اگرچہ کشمیری اور گلگت سکاؤٹس نے دشمن کا منہ پھیر دیا ——— ان کی کئی قیمتی جانیں ضائع اور زخمی ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اسکیم کے مطابق پانچ پر حملہ کر دیا۔

تیر ——— اب دیر ہو چکی تھی۔ دشمن کا توپ خانہ کی پوزیشن لے چکا تھا۔ یہ جیالے جو حملہ آور تھے' آخر حملے سے گزر گئے اور بچے کھچے زخمی و خستہ حالت میں کسی نہ کسی

طرح پسپائی اختیار کر کے اگلے روز صبح ہونے تک اپنی اڈوں پر واپس پہنچ گئے۔

——— ان کی واپسی سے پہلے ہی مارٹروں نے یہ علاقہ دشمن کی توپوں کی زد میں لا دیا تھا۔

واپس اپنے مرکز کی طرف آ گئے۔

☆○☆

صورت حال انتہائی سنگین نوعیت اختیار کر چکی تھی۔ جنرل کی اصل قوت جو تین ہزار تین سو فٹ کی بلندی پر تھی' دشمن کے علاقے میں نو ہزار تین سو فٹ کی بلندی پر دشمن کا توپ خانہ اور اس کی نفاست اندھا دھند گولہ باری کر رہی تھی۔ پیچھے ہٹنے کے راستے مسدود تھے کیونکہ جنرل طارق اور ان کے ساتھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے لیکن آفرین ہے ان جیالوں پر' کیا مجال کہ ان کے پائے ثبات میں لغزش آئی ہو۔

——— ان کی جواں ہمتی نے جنرل طارق کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی قوت کو بالائے طاق رکھ کر ان کی مدد کو پہنچے۔ ان تک پہنچنے کے لیے انہیں ایک فولادی عزم کی ضرورت تھی لیکن اسی رات جنرل نے اپنے تمام ریزرو دستوں کو اس جنگ میں جھونکنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا دیا۔

"رات آٹھ بجے کے بعد ایڈوانس شروع کرو اور اپنے کیمپ میں ——— جا ملو۔ میں کل صبح پانچ پر آخری اور فیصلہ کن حملہ کرنے والا ہوں۔ گولی ——— آخری جوان۔" اس نے اپنی فوج کو آخری حکم دیا۔

اس کے ساتھ ہی جنرل نے تمام توپخانے کو حکم دیا کہ وہ دشمن کو ——— اندر سے پھاڑ دینے کے اطمینان کے ساتھ روانہ کر دیے۔ اس مرتبہ یہ تمام گولے اور جذبے کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔

ان کے تابڑ توڑ حملوں نے دشمن کا توازن بگاڑ دیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر نوے۔ پہاڑی سلسلے میں فرنٹ کے باہر ان سے نیچے ——— نے جہاں دشمن کا کوئی یونٹ دیکھا اس پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

وہ آندھی کی طرح حملہ آور ہوتے اور ——— کی تین کمپنیوں کا صفایا کر دیا۔ ——— موجود بھرتی پوسٹن پر ——— دیے

——اس دوران مددگار فوج چوٹی پر چڑھ کالم سے جا ملی۔ یہ لڑائی کا پانچواں روز تھا۔ دشمن نے قبائلیوں کے شب خون کو ہی بڑا حملہ جان لیا اور انہیں پسپا کر کے قدرے مطمئن ہو گیا جب کہ قبائلی وہاں سے بھاگے نہیں' انہوں نے صرف "شکار گاہ" بدل لی تھی۔ وہ اب ٹکڑیوں میں بٹ کر دشمن کے پہلو چاٹنے لگے تھے۔

"دلی (پانڈو) پر عقبوں سے حملہ کر دو۔"

جنرل طارق کا نعرۂ مستانہ گونجا اور "اللہ اکبر" کے فلک شگاف نعرے بلند کرتے غازیان صف شکن دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

دشمن ابھی تک صورت حال کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس پر "بڑا حملہ" آ گیا۔ اب تک جنرل نے اسے اس بری طرح الجھائے رکھا تھا کہ دشمن کچھ کرنے کی پوزیشن ہی اختیار نہ کر سکا تھا۔ اس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا کہ وہ فی الوقت اپنی نفری کو سینے اور مورچوں میں دبکا رہے۔ اس دوران رات ہو گئی۔ نو ہزار فٹ کی بلندی پر رات کو خاصی سردی تھی۔ جوانوں نے سردی کی شدت سے نجات حاصل کرنے کے لیے جگہ جگہ الاؤ روشن کر لیے کیونکہ وہ پانڈو کی بلندیوں پر ہر طرف پھیل گئے تھے۔ اس لیے بادی النظر میں یہی دکھائی دے رہا تھا کہ پانڈو ہر طرف سے گھیرے میں آ چکا ہے۔ دشمن گھبرا گیا۔ اس نے یہی سمجھا کہ پاکستان کی تازہ دم فوج یہاں موجود جوانوں کی مدد کو آ گئی ہے۔ صبح ہونے تک ان کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ رات بھر قبائلی چھاپہ مار الگ ان کی جان کو آئے رہے۔ انہوں نے ساری رات دشمن کو سکی کا ناچ نچائے رکھا۔

علی الصبح پاکستانی فوج کے حملے سے پہلے ہی دشمن کے بھاری توپ خانے نے آگ اگلنا شروع کر دی' لیکن یہ داؤ بظاہر انہوں نے اپنی جان بچانے کے لیے کھیلا تھا۔ ان کی فوج اس بھاری بمباری کی آڑ میں دم دبا کر بھاگ اٹھی۔

جب جنرل طارق کے جیالے پانڈو پہنچے تو وہاں ایک بھی بھارتی فوجی موجود نہیں تھا۔ وہ دور تک جنگل کو محفوظ پناہ گاہ سمجھ کر اس طرف نکل گئے تھے' لیکن ان بوکھلائی ہوئی بھیڑوں پر قبائلی پٹھان چیتوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ انہوں نے جنگل کو جانے والے راستوں پر پہلے ہی گھیر لیا تھا۔

جنگل بھگوڑوں کی شکار گاہ بن گیا جہاں ان کی کئی کمپنیاں قبائلیوں کے خنجروں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

☆○☆

قافلہ راستے کی صعوبتیں برداشت کرتا کسی نہ کسی طرح آزاد علاقے تک پہنچ جاتا۔ پونچھ سے مظفر آباد تک کا سفر بڑا جان لیوا تھا۔ تقریباً ایک لاکھ (لاکھوں) بے گھر مسلمان اور ہندو پناہ گزیں اور زخمی مجاہد تھے جو پونچھ کی لڑائی میں زخمی ہوئے تھے۔ ان کے لیے مرہم پٹی یا ادویات کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔ اول تو مجاہدین میں کوئی ڈاکٹر ہی نہیں تھا اور اگر کوئی مرہم پٹی کا فرض ادا کرنے والا میسر بھی تھا تو اسے دوائیں دستیاب نہیں تھیں۔ زخموں کے لیے بھی دیسی طریقہ علاج تجویز کیے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے اکثر کے زخم بگڑنے لگے' بالآخر ان زخموں نے ان کی جان لے لی۔

اس کی نظر جب ان معصوم بچوں پر پڑتی جن کے باپ اس جنگ میں شہید ہو چکے تھے اور جو اب ننگے پاؤں' رسیوں سے بنی ہوئی جوتیاں پہنے یا اپنے پیروں پر چیتھڑے لپیٹے سردی سے کپکپاتے ان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے آ رہے تھے تو شدت غم سے اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا۔

اس نے ان بدقسمت بیواؤں کو بھی دیکھا جو بمشکل چند ہفتوں یا پھر چند مہینوں کے لیے سہاگنیں بنیں' جنہوں نے ابھی ازدواجی زندگی کا آغاز ہی کیا تھا کہ بیوہ ہو گئیں۔ وہ شریف زادیاں بھی اس کے ہمراہ تھیں جن کی ایک جھلک بھی کبھی کسی کو نظر نہ آئی تھی' لیکن جو آج ننگے سر کھلے بالوں اور پھٹے گریبان کے ساتھ بین کرتی ہوئی ان کے ہمراہ چلی آ رہی تھیں۔

اس کی نظریں ان بدبخت کشمیر کی بیٹیوں پر بھی تھی جو پناہ کی تلاش میں نکل آئی تھیں' لیکن انسانوں کے بھیس میں موجود بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ کر بازاروں کی زینت بن چکی تھیں۔

بڑے دلخراش نظارے کیے تھے اس نے۔

بڑے جگر پاش منظر دیکھے تھے اس کی آنکھوں نے۔

ان واقعات کا اس پر ایک ہی اثر ہوا کہ اس کا غم اب انفرادی سے اجتماعی ہو گیا۔ وہ سارے راستے اس آگ میں جلتا آیا تھا کہ اس دشمن سے کیسے ان ترنم زادیوں کا انتقام لے جو ان کی بربادی کا باعث بنا تھا۔ اس کے سینے میں الاؤ دہک رہا تھا اور شدید جلتا تھا کہ اس دہکتے الاؤ کو ٹھنڈا کر سکتا ہے تو دشمن کا بہتا ہوا خون—— صرف اس کا خون' ورنہ تو یہ آگ کسی روز اسے بھسم کر ڈالے گی۔

زہراں کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ وہ تمام راستے شیرو' اپنے باپ اور رشتے داروں کی موت کا ماتم کرتی آئی تھی—— کبھی کبھی قدرت کی ستم ظریفی پر حیران بھی رہ جاتی کہ آج وہ شرفو کی بیوی بن کر جا رہی ہے۔ اس نے قافلے میں شامل ہونے سے پہلے تک اپنے آپ کو کشمیر کی سب سے مظلوم لڑکی جانا تھا کہ جس کا پورا کنبہ آزادی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا' لیکن جب اس کے ہمراہ آنے والی عورتوں کی کہانیاں اس کے علم میں آئیں تو اسے اپنے دکھ ان کے سامنے بالکل ہیچ نظر آنے لگے۔ وہ اس لحاظ سے ان مظلومین میں شاید خوش قسمت ترین لڑکی تھی کہ اپنے ساتھ وہ شرفو کی شکل میں مضبوط سہارا لے کر جا رہی تھی—— شاید قدرت کو اس کے بزرگوں کی قربانیوں پر رحم آ گیا تھا کہ نطاق نے شرفو کی شکل میں زہراں کو قدرے محفوظ مستقبل کی ضمانت بہم پہنچا دی تھی جب کہ اس کی ہمراہیوں کو تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ان کا کل کیا ہے؟

وہ سب بے چاریاں تو ایک دیوانگی کی سی کیفیت میں غم کے ہاتھوں بے حال' بے بس پتھر کے انسانوں کی طرح قدم بقدم گرتی پڑتی' ڈگمگاتی چلی جا رہی تھیں۔ انہیں اپنی منزل کا' اپنے راستے کا احساس تھا نہ علم۔ کون جانے ان الم نصیبوں میں سے کتنی ایسی تھیں جنہیں گھر دیکھنا بھی نصیب ہوا یا وہ صرف انسانی ہوس کی بھینٹ چڑھ کر بازار کا بکاؤ مال ہی بن کر رہ گئیں۔

☆○☆

آزاد کشمیر افواج کے جی۔ایچ۔کیو میں شرفو کو کئی آشنا چہرے' مانوس نگاہیں نظر آئیں لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب وہ مجاہدوں کے نہیں' سیاست دانوں کے نرغے میں گھر چکا ہے۔ وہ لوگ پونچھ میں تھے تو اپنی جانوں سے گزر جانے کو سعادت جانتے تھے' لیکن یہاں آئے تو سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ان کی کمانڈ مجاہدوں سے چھن کر انگلی کو لہو لگا کر سورما کہلانے والوں کے ہاتھ میں آ گئی—— خون دینے والے گوشہ عزلت میں جا گرے اور دودھ پینے والے مجنوں اقتدار کی دیوی کے قدموں سے لپٹ گئے—— یہاں سب اپنی اپنی لڑائی لڑ رہے تھے۔

راشن کی لڑائی——!

عہدوں کی لڑائی——!

زمینوں اور پلاٹ کی لڑائی——!

عہدوں اور اقتدار کی لڑائی——!

وہ خارش زدہ کتوں کی طرح ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کے لیے ہمہ وقت مصروف تھے۔ اقتدار کے غلیظ نشے نے انہیں اندھا کر دیا تھا۔ انہیں اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بند ہی تھی کہ سلون کے اندھے کی طرح انہیں ہر طرف ہوا ہی ہوا دکھائی دیتی تھی۔ ان کی آنکھوں پر ہوس کی پٹی نئے بچوں کی طرح چیخنا چیخنا بھی کرنے لگے اور دشمن کی مراد بر آنے لگی۔

اس کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اسے کم عمری میں ہی آزاد کشمیر فوج نے اس کے خونخوار کی قربانیوں کے پیش نظر حوالدار کا عہدہ دے دیا اور برسوں ہوتے ہی اسے محاذ کی طرف جانے کے احکامات مل گئے۔

——اسے یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے' اپنے ہاتھوں سے' اپنی قوم کے لٹنے کا منظر تو نہیں دیکھے گا۔

محاذ پر روانہ ہونے سے پہلے وہ زہراں کے پاس آیا—— زہراں اور وہ دونوں خورشید کے گھر والوں کے ساتھ ہی قیام پذیر تھے۔ مکان میں داخل ہوتے ہی پہلا کمرہ اشرف کا تھا جب کہ آخری کمرے میں زہراں رہتی تھی۔ وہ دن میں ایک دو مرتبہ ایک دوسرے کے سامنے آتے اور بہت کچھ کہنے کی خواہش رکھنے کے باوجود کچھ نہ کہہ پاتے۔ بس ایک دو روایتی سے جملوں کا ان کے درمیان تبادلہ ہوتا اور اچانک ہی زہراں کو کوئی کام یاد آ جاتا اور وہ "اچھا جی چلتی ہوں" کہہ کر اشرف خان کو سوچوں کے منجدھار میں اکیلا چھوڑ کر چلی جاتی۔

آج جب زہراں اس کے لیے ناشتہ لے کر آئی تو شرفو کے ذہن کی الجھنیں اس کے چہرے پر بھی نمایاں ہونے لگیں۔ زہراں اس کی بیوی تھی جس کا سارا کنبہ ماں ہی میں کٹ چکا تھا۔ لے دے کے بس وہی تو اس کا سہارا رہ گیا تھا اور اب وہی اس سے محاذ پر جانے کو کہنے والا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے اس عمل کو کس بات سے تشبیہ دے؟ بظاہر تو شرفو کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ زہراں کو اپنے محاذ پر روانگی کی اطلاع دے کر اس کے ساتھ ہی نہیں' اپنے ساتھ بھی زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے' لیکن وہ اسے بے خبر بھی رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

"زہراں" اس نے برتن رکھ کر لوٹتی زہراں کو مخاطب کیا۔ جانے اس کے لہجے میں کیا بات تھی یا پھر زہراں کی چھٹی حس تھی جس نے اسے پہلے ہی سے اگلی اطلاع دے دی تھی کہ وہ ٹھٹھر کر رہ گئی۔

"جی" اس نے جیسے تھوک نگل کر ایک لمحے کے لیے شرفو کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا زہراں کہ میں تمہیں کیا کہوں؟ کل ساری رات میں اس الجھن کا شکار رہا کہ صبح میں اس خبر کے ساتھ تمہارا سامنا کیسے کر سکوں گا کہ میں محاذ پر جا رہا ہوں۔"

"کیا؟" زہراں اچانک گھبرا گئی' لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل چکی تھی۔

"ہاں زہراں۔ وہ عظیم مقصد جس کے لیے ہمارے آباؤ اجداد صدیوں سے قربانیاں دیتے آ رہے ہیں' جس کے لیے ہماری جان سے بڑھ کر پیاروں نے جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں' اس مقصد سے اگر میں پیچھے ہٹ گیا یا کسی ذمے داری یا بزدلی نے مجھے محاذ پر جانے سے منع رکھا تو روز قیامت ہم اللہ کے حضور تو جواب دہ ہوں گے ہی' اپنوں سے بھی آنکھیں نہیں ملا سکیں گے۔ مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے زہراں کہ اگر اپنے مقصد کے راستے میں مجھے موت آ جائے تو اس کا غم نہ کرنا' اس لیے کہ میری جان شیرو کی جان سے قیمتی ہرگز نہیں۔ پھر ہم دونوں نے اکٹھے جینے مرنے کے پیمان بھی تو کئی مرتبہ باندھے تھے۔"

وہ بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا۔

اسے یوں لگا جیسے اس نے آخری فقرہ بول کر کوئی غلطی کی ہو۔ زہراں آخر ایک عورت تھی' ایک کمزور سی لڑکی جو اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اسے تو چاہیے تھا کہ وہ زہراں کو حوصلہ دیتا' اس کی ڈھارس بندھاتا۔ شاید اسی ارادے کو ذہن میں لیے اس نے بالکل ہی آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

——اس کا یہ فعل قطعاً" غیر ارادی تھا لیکن زہراں کے رگ و پے میں ایک برقی رو سی دوڑنے لگی تھی۔ شرفو نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے قدرے بلند کر لیا۔

"مجھے معلوم ہے زہراں۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔ "کہ تمہیں یہ سب کچھ کہہ کر میں بہت دکھ دے رہا ہوں' لیکن ہم سب کے دکھ مشترک ہیں۔ ہمارا دکھ کشمیر کے دکھ سے بڑا نہیں۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے دل میں کوئی ملال نہ لانا۔" اس سے آگے وہ ہزار کوشش کے باوجود ایک لفظ نہ کہہ سکا۔

زہراں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے وہ منظر یاد آ گیا جب ایک مرتبہ بستے کے کنارے اور پھر اس کی پناہ گاہ پر شیرو نے اسی طرح اس سے باتیں کی تھیں' پھر وہ چلا گیا تھا اسے ہمیشہ کے لیے اکیلا چھوڑ کر—— کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ کیا شرفو بھی——؟ اس نے سوچا اور وہ اس تصور ہی سے لرز کر رہ گئی۔

"نہیں—— نہیں۔" بے ساختہ اس کے ہونٹ وا ہو گئے۔ وہ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کا گلا رندھ گیا اور وہ سسکیاں لیتے ہوئے بمشکل ہی کہہ سکی۔

"کشمیر کی بیٹیاں بہت حوصلے والی ہوتی ہیں زہراں۔" شرفو نے اسے مخاطب کیا اور زہراں کو یوں لگا جیسے وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے آنکھ جھپکتے ہوئے اپنے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

"مجھے معاف کر دینا۔ میں بہک گئی تھی۔ تمہیں کچھ اگر ہو جاتا تو میں بھی آپ کی موت کے بعد زندہ رہتے ہوئے آپ کی آزادی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیتی اور ساری زندگی آپ کی یاد میں گزار دیتی۔ خدا نہ کرے کبھی ہم میں سے کسی کی موت کا قرار کرتے ہوئے میں آپ کی کوئی کمزوری بن جاؤں۔"

اس کے لہجے کی اچانک تبدیلی نے شرفو کو حیران کر دیا تھا۔

"زہراں—— مجھے تم پر ہمیشہ ناز رہے گا۔"

"فی امان اللہ!" زہراں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور واپس جانے لگی۔

"خدا حافظ——!" شرفو بڑبڑایا۔ اس کی نظریں زہراں کے پیچھے جانے کتنی دیر تک بند دروازے پر جمی رہیں۔

☆○☆

شرفو ایک سیکشن کے ساتھ میندھڑ کی وادی میں مورچہ بند تھا۔ پچھلے دس پندرہ دنوں سے وہ لوگ مسلسل حالت جنگ میں تھے۔ ہر روز وہ اپنی پوزیشنوں سے نکلتے اور دشمن پر گھات لگا کر لوٹ آتے۔ انہیں چوبیس گھنٹے میں بمشکل چار گھنٹے سونا نصیب ہوتا تھا۔ ان پندرہ دنوں میں اس کے بے شمار ساتھی زخمی ہوئے اور کئی ایک نے اس کے ہاتھوں میں دم دیا۔

——اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ وہ کوئی لاش دشمن کے ہاتھ میں نہ رہنے دے۔

اسے گھر سے نکلے تین ماہ ہونے کو آئے تھے۔ اس دوران زہراں کی خیریت معلوم کرنے کا واحد ذریعہ وہ رضاکار تھے جو مظفرآباد سے بھرتی ہو کر اس طرف آتے رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی نورولی کے گھر والوں کا یا اس کا واقف نکل آتا جس سے وہ نورولی کے گھر والوں کی خیریت معلوم کر لیتا۔

اس کے سیکٹر کے جوانوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ انہیں کبھی آگے جانے اور کبھی پیچھے آنے کے احکامات ملتے رہتے تھے۔ اس نے تین مہینوں میں آزاد کشمیر کے جی۔ایچ۔کیو سے اپنی بہادری کا لوہا منوا لیا تھا اور اس کی کمان میں لڑنے والی پلٹون اور چھاپہ مار پارٹیاں جب لوٹ کر آتیں تو ہر کسی کی زبان پر شرفو کی بہادری کی کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی تھی۔

اس کی اپنی بس ایک ہی خواہش تھی کہ کسی بھی طرح وہ حملہ کر کے پونچھ میں موجود مجاہدین کی مدد کو پہنچ جائے۔ وہ ان فضاؤں میں دوبارہ سانس لینا چاہتا تھا جو اس کے اندر رچی بسی تھیں۔ وہ وہ کر اس کے بن میں ایک ہی آرزو مچلتی تھی کہ وہ ان گلیوں میں، ان پہاڑوں پر، ان بلندیوں میں جی بھر کے بھاگے اور بھاگتا چلا جائے جہاں اس کا بچپن بکھرا ہوا تھا، جہاں اس کے شیرو کی یادیں پھیلی ہوئی تھیں اور جہاں اب دشمن اپنے خونی پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔

مظفر آباد پر موسم گرما کے حملے سے مایوس ہو کر بھارتی افواج نے بھی اپنی جنگی حکمت عملی بدل لی، اب ان کی ساری توجہ پونچھ کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

——جموں سے مغرب کی طرف جو کچی سڑک پاکستانی سرحد کے متوازی بمشکل چند میل کے فاصلے سے گزرتی تھی، وہاں سے بھارتی فوج کا ایک بریگیڈ ایڈوانس کرتا ہوا نوشہرہ کی طرف بڑھا تھا۔ مجاہدین اپنی فنری اور ناکافی اسلحے کے ہاتھوں مجبور ہو کر پسپا ہو گئے اور یہ بریگیڈ نوشہرہ پہنچ کر ریاستی فوج سے "ملاپ" کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

یہاں پہنچ کر بھارتی فوج نے میرپور پر جو منگلا ہیڈورکس کے نزدیک واقع ہے، قابض ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس مقام سے جہلم نہر نکلتی ہے۔ اس کے اس حملے کو کشمیریوں، پٹھانوں اور پاکستانی رضاکاروں کے ملے جلے دستوں نے ناکام بنا دیا تھا۔ یہاں تاریخ حریت کا بھی نہ بھولنے والا معرکہ لڑا گیا اور مجاہدین نے بھارتی فوج کو میرپور کے گرد و نواح میں رک جانے پر مجبور کر دیا۔

عین اس وقت شمال مغرب میں کچھ فاصلے پر واقع کوٹلی کے علاقے سے مجاہدین اٹھے اور انہوں نے کوٹلی پر قبضہ کر لیا۔

☆○☆

ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اگست ۱۹۴۷ء سے اب تک مجاہدین نے پونچھ میں ریاستی افواج کو گھیرے میں دبائے رکھا تھا، لیکن اردگرد کے علاقے سے پسپا ہونے والی فوج اور غیر

مسلم پناہ گزینوں کے پونچھ شہر میں آ جانے کی وجہ سے وہاں کی آبادی تقریباً دگنی ہو چکی تھی۔ اب بھارتی فوج کے آ جانے کے بعد بھی مجاہدین نے پونچھ شہر کا محاصرہ ختم نہیں کیا تھا۔ وہ اپنا گھیرا دشمن کے گرداگرد روز بروز تنگ کرتے جا رہے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں اوڑی محاذ سے دشمن نے لاریوں میں پونچھ کا محاصرہ توڑنے کی کوشش کی تھی لیکن یہاں منہ کی کھائی اور دشمن کے ہاتھوں سے پونچھ کا علاقہ نکلتے نکلتے رہ گیا تھا۔ اس کے بعد سیالکوٹ کا محاذ بھی کھل گیا۔ اس وقت سے جنگی حالت نے فائر بندی اور مزاحمتی نوعیت اختیار کر لی۔ اس طرح پونچھ سارے کشمیر سے کٹ کر رہ گیا۔

۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کو جب اقوام متحدہ نے جنگ بندی کی قرارداد منظور کی تو پونچھ کے محاصرے کو تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔

اس انکار کی وجہ صرف یہی تھی کہ ان حالات میں فائر بندی ہونے سے پونچھ سے زمینی رابطہ قائم ہو جاتا۔ مسلم شہری اور فوجی پاکستانی اور کشمیری مجاہدین کے ہاتھوں میں یرغمال بن جاتے اور ہم بھارت کو رائے شماری کے لیے مجبور کر سکتے تھے۔ یہ حقیقت نہ صرف بھارت سرکار کو بھی تھا، اسی لیے اس نے اپنی تمام صلاحیتیں پونچھ کے محاصرے کو توڑنے پر صرف کر دیں۔

وادی میندھر کی ایک حفاظتی چوکی میں موجود حوالدار اشرف خان تمام روز بڑھتی ہوئی بھارتی فوج کی اطلاعات پہنچا رہی تھیں۔

۲۴ اگست کو دشمن کی طرف سے نوشہرہ سیکٹر میں تازہ مورچہ بندیوں کی خبر ملی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے نوشہرہ کے چاروں اطراف پھیلی مجاہدین کی پوزیشنوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ قریباً ایک ماہ مجاہدین اور دشمن کے درمیان آنکھ مچولی جاری رہی۔ اس ایک ماہ میں کئی جگہ دشمن کا اور کئی جگہ مجاہدین کا پلہ بھاری پڑا۔

۲۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کو دشمن نے نوشہرہ سے راجوڑی کو کمک پہنچانی شروع کر دی۔ یہاں ۹ اکتوبر تک بڑی خون ریز جھڑپیں ہوئیں۔

۱۰ اکتوبر کو راجوڑی کے شمال مشرق میں بھارتیوں نے زبردست حملہ کیا۔ حملہ آوروں کی تعداد خاصی تھی، لیکن مجاہدین نے انہیں پسپا کر کے پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تین چار روز شدید لڑائی جاری رہی۔ ہر روز دشمن نئی تیاریوں کے ساتھ حملہ آور ہوتا اور منہ کی کھا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ ان کی فضائیہ نے بڑھ چڑھ کر زمینی فوج کی مدد کی۔

۱۹ اکتوبر کو دشمن نے پورے بریگیڈ کے ساتھ راجوڑی پر حملہ کیا۔ اس روز نوشہرہ کے شمال مغرب میں پٹھانوں اور کشمیری مجاہدین نے دشمن کی کمک پر گھات لگائی اور اسے

زبردست نقصان پہنچا کر پیچھے ہٹ آئے۔

۲۶ اکتوبر کو پونچھ میں موجود گیریژن نے محاصرہ توڑنے کے لیے زبردست جوابی حملہ کر دیا۔

۲ نومبر تک دشمن کئی سیکٹروں میں اپنے بکتر بند ڈویژنوں کی مدد سے ایڈوانس کر چکا تھا۔

۴ نومبر کو راجوڑی چنگاس روڈ مجاہدین نے بند کر دی اور اس پر اس طرح رکاوٹیں کھڑی کر دیں کہ دشمن کے لیے ایڈوانس کرنا مشکل ہو گیا۔

۵ نومبر کو راجوڑی کے شمال میں اور ۸ نومبر کو راجوڑی کے شمال مغرب میں مجاہدین نے اپنے سروں کی فصل کٹوا کر دشمن کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔

۹ نومبر کو دشمن اپنے ٹینک بھی میدان کارزار میں لے آیا۔ ۱۳ سے ۱۵ نومبر تک اس کے ٹینک رسالوں نے بڑھ چڑھ کر حملے کیے' لیکن اپنے کمترین وسائل کے ساتھ بھی پاکستانی فوج' کشمیری اور پٹھان مجاہدین نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور غنیم کو حتی الوسع آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔

۱۸ نومبر کو جموں میں دو تازہ دم بریگیڈ اور ایک توپ خانہ رجمنٹ آ گئی جس کے بعد دشمن کے بڑے حملے کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ محصور فوج نے چلاس کی طرف پیش قدمی شروع کر دی' لیکن محاصرہ قائم رہا۔

☆○☆

۱۹ نومبر کی رات کو شرفو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کے حملے کا منتظر تھا۔

——ان لوگوں کو اطلاعات مل چکی تھیں کہ ریاستی پونچھ کے علاقے میں دشمن کے تین ڈویژن سرگرم عمل ہیں اور اس ساری فوج کی مرکزی کمان نوشہرہ میں رکھی گئی تھی۔ انہیں رات کو تیار رہنے کا حکم ملا تھا کیونکہ دشمن راجوڑی سے کوٹلی اور مینڈھر پر ایک زبردست حملہ کرنے والا تھا۔ مجاہدین نے راتوں رات دشمن کے علاقے میں "ریکی" کر کے اس کی بے پناہ جمع شدہ قوت کی نشاندہی کر دی تھی۔

اگلے ہی روز آزاد کشمیر کے فرسٹ بریگیڈ پر جس کے پاس رائفلیں یا چند مشین گنیں تھیں' دشمن نے زبردست حملہ کیا اور اسے دھکیلتا ہوا دریائے پونچھ کے کنارے مدار پور تک پہنچ گیا لیکن فرسٹ بریگیڈ کے غضب ناک جوابی حملے نے اسے دوبارہ شہر میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

ان دنوں پونچھ سیکٹر کے کمانڈر بریگیڈیئر (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) اعظم خان اپنے

ہیڈکوارٹر کو دشمن کے ارادوں سے خبردار کرتے رہتے تھے۔ [illegible]

میں نہ ہوئی۔

۲۰ نومبر کو صوبیدار اشرف خان نے ہوا کے [illegible]

زبردست نقل و حرکت نوٹ کی۔ اس نے دائیں طرف [illegible]

اچانک زوردار دھماکے کی آواز نے اسے خبردار [illegible]

اس سے محض چند گز دور دشمن کی میڈیم گن [illegible]

کے تابع تک نہ جاتا تو اس کے پرخچے اڑ گئے ہوتے۔ [illegible]

چہرے پر لگے۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ خون میں لتھڑ گیا۔ [illegible]

زخمی تھے۔

——اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا اور دوبارہ آنکھوں سے دوربین لگا لی۔

دشمن نے اچانک بڑی تیز گولہ باری شروع کر دی تھی۔ اس کے ہاتھ فن [illegible]

کے طیارے چنگھاڑتے ہوئے نمودار ہوئے—— انہیں کھل کر اپنا کام کرنے کا موقع دینے کے لیے دشمن نے گولہ باری روک دی۔

بے بس مجاہدین دشمن کے طیاروں کو آگ برساتے دیکھتے رہے۔ ان کے پاس کوئی طیارہ شکن گن بھی نہیں تھی۔

شرفو نے جھک کر ٹیلی فون اٹھایا کہ پیچھے کمانڈ کو دشمن کی نقل و حرکت سے مطلع کرے' لیکن ٹیلی فون کے تار کٹ چکے تھے۔ اس کے سامنے والے مورچے میں موجود وائرلیس آپریٹر شہید ہو چکا تھا اور اس بات کے امکانات بہت کم رہ گئے تھے کہ اس کا سیٹ سلامت رہ گیا ہو۔ مورچے سے سر باہر نکالنا خودکشی کے مترادف تھا لیکن وہ یہاں بیٹھ کر تماشا بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود وہ رینگتا ہوا مورچے سے نکلا اور قیامت کی گولہ باری میں اس مورچے تک جا پہنچا۔

اس نے مورچے میں اتر کر وائرلیس سیٹ پر کرنے شہید کو سیدھا کیا۔ شاید وہ شہادت سے پہلے اپنا آخری فرض ادا کرنا چاہتا تھا' لیکن موت نے مرحوم کو مہلت ہی نہیں دی تھی۔

شرفو نے جھک کر سیٹ کا جائزہ لیا اور اسے شدید دھچکا لگا کہ سیٹ بھی ناکارہ ہو چکا تھا۔

وہ پلٹا—— دشمن کے طیارے اپنا کام مکمل کر کے جا چکے تھے اور ایک مرتبہ پھر توپ خانہ حرکت میں آ گیا تھا۔ اس پر دیوانگی طاری تھی۔ وہ بھاگ بھاگ کر اپنے ساتھیوں کو [illegible]

HBC

رہنے اور دشمن کی انفنٹری کا انتظار کرنے کا حکم دے رہا تھا اور خود گھسٹتا ہوا پیچھے جا رہا تھا کہ کمانڈو کو صحیح صورت حال بتا سکے۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ بہہ کر اب آنکھوں میں گرنا شروع ہو گیا تھا اور شرفو کو بار بار آستین سے اپنی آنکھیں صاف کرنا پڑتی تھیں۔

لیکن ابھی اس نے بمشکل پہاڑی کا پہلا موڑ ہی کاٹا تھا جب اسے دشمن کی ایک سیکشن کے کچھ جوان بڑی چالاکی سے چھپ چھپ کر گولہ باری کی آڑ میں اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ دشمن کی نظر اس پر نہ پڑی ورنہ وہ بالکل اس کے نشانے پر تھا۔

دشمن کو دیکھتے ہی اس کی رگوں میں انگارے تڑپنے لگے۔

---- شرفو نے بے چینی سے نظریں گھما کر حالات کا جائزہ لیا۔ وہ کسی ایسی آڑ کی تلاش میں تھا جہاں سے دشمن کا یہ سیکشن اس کی زد میں آ سکے اور اپنی مطلوبہ جگہ نظر آتے ہی وہ بڑی پھرتی سے وہاں تک پہنچ گیا۔ اب وہ ایک چٹان کی آڑ میں اپنے پوچ سے دستی بم نکالے ایک خاص پوائنٹ پر سیکشن کی آمد کا منتظر تھا۔

اس نے دانتوں سے پن نکال دی کیونکہ دشمن بڑے محتاط طریقے سے پہلا اس کے پھندے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شرفو کے دل کی دھڑکن تنیم کے قدموں سے بہت تیز تھی۔ وہ زیادہ دو منٹ کے جان لیوا اور اعصاب شکن انتظار کے بعد گوہر مقصود اس کے ہاتھ آ گیا۔ گرنیڈ بد قسمت سیکشن کے عین درمیان پھٹا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شرفو کی اسٹین گن کی لمبی سرخ زبان انہیں چاٹنے کو لپکی اور سیکشن پر قہر ٹوٹنے لگا۔ اس کا مقابلہ تربیت یافتہ فوج سے تھا۔ اسی لیے شاید ایک گولی اس کے بازو میں گھس گئی اور اس کا ہاتھ ناکارہ ہو گیا۔

شرفو نے گلے میں اسٹین گن لٹکائے اور اس کے سلنگ میں ہاتھ اڑسے جب کمپنی کمانڈر تک پہنچا تو اس کے لیے سامنے دیکھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ سر بے تحاشا خون بہہ کر اس کی آنکھوں میں گرنے لگا تھا۔ دو جوانوں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

"سر!" اس نے ڈوبتی آواز میں اپنے سامنے کھڑے پاکستان آرمی کے میجر کو مخاطب کیا۔

"سر! او سر دشمن....."

میجر نے منہ پرلی طرف پھیر لیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے کانوں میں کہیں دور ہی سر سے کہیں سے آتی میجر کی آواز سنائی دی۔ "بہت دیر ہو گئی میرے بیٹے۔ ہم لڑائی ہار ..."

شرفو خان دو جوانوں کے بازوؤں میں جھول گیا۔

"——— اسے میری جیپ میں پیچھے ہسپتال لے جاؤ۔" میجر نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنے جوانوں کو حکم دیا۔

☆○☆

اسی روز شام تک دشمن مینڈھر پر قبضہ کر چکا تھا۔ دو تین روز بعد ہی اس نے پونچھ کا محاصرہ توڑ دیا اور نوشہرہ اور پونچھ کو آپس میں ملا دیا۔ اس طرح اس لائن کے مشرق کا تمام علاقہ بھارت کے قبضہ میں چلا گیا۔ اگلے چار پانچ روز میں اٹھائیس ہزار سے زائد مہاجرین کے لئے پے در پے قافلے جہلم پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے بھی مزید قافلے چلے آ رہے تھے۔

دشمن کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی اور اس نے پونچھ کا محاصرہ توڑ دیا تھا۔ دشمن نے یہ حملہ بے خبری میں نہیں کیا تھا۔ پاکستانی ٹی۔ایچ۔کیو کو اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً معلومات حاصل تھیں اور مقامی محاذوں کے کمانڈر ٹیلی فون کی اطلاعات روانہ کر رہے تھے۔

——— کشمیری حریت پسند دشمن کے علاقے میں دور اندر تک جانیں ہتھیلی پر رکھ کر ریکی کرتے اور اس کی منصوبہ بندیوں کی خبر پہنچا رہے تھے۔ انٹیلی جنس کا یہ مربوط جال ابتدا ہی میں بھارتی فوج کے خلاف بچھا دیا گیا تھا اور گو یہ سب کچھ عوامی سطح پر ہو رہا تھا لیکن جی۔ایچ۔کیو کو اس سے ہمیشہ باخبر رکھا گیا۔

مینڈھر کی تحصیل ہاتھ سے نکلی تو پاکستانی عوام نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اخبارات نے حکومت کو لتاڑنا شروع کر دیا۔ عوامی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے حکومت نے قبائلیوں، کشمیری حریت پسندوں اور پاکستان آرمی کی مختلف یونٹوں کو ملا کر پچیس ہزار کا لشکر ترتیب دیا——— اس لشکر میں پچاس توپیں بھی تھیں اور اس فورس کو آگے روانہ کر دیا، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس فورس نے جموں سے پونچھ تک دشمن کی طویل رابطہ لائنوں کو درمیان سے توڑ ڈالا اور دشمن کی ایک بڑی نفری کو جو نوشہرہ میں تھی، درمیان سے کاٹ کر "قریباً" مفلوج کر دیا۔ ان کا نوشہرہ سے آگے "قریباً" ایک سو میل تک فلینک (پہلو) ہماری زد میں تھا جو قبائلی اور کشمیری حریت پسندوں کی بہترین شکار گاہ بن سکتا تھا، لیکن اس محاذ پر کچھ نہ کیا گیا۔

دسمبر کے اوائل میں پاکستانی توپ خانے سے پانچ ہزار گولے بھارتی علاقے میں پھینک کر پاکستان نے ایک مرتبہ تو دشمن کی نبضیں ساکت کر دیں۔ بھارتی بھاگنے کی تیاریاں کرنے لگے کیونکہ جنگی اصولوں کے مطابق اس زبردست گولہ باری کے بعد انفنٹری کا حملہ ہونا چاہیے تھا، لیکن مقام حیرت ہے کہ یہ حملہ نہ کیا گیا اور پانچ ہزار قیمتی گولے ضائع کر دیئے

گئے۔ نہ صرف یہ کہ حملہ نہیں کیا گیا بلکہ چھاپہ ماروں کو بھی روک دیا گیا۔

۲۱ دسمبر ۱۹۴۸ء کی نصف شب کو ایک طویل لڑائی کا اختتام ہوا اور کشمیر کے تبوت میں پہلا کیل ٹھونک دیا گیا۔

جنگ بندی اب ہونی ہی تھی کیونکہ کوئی ایسا پہاڑی علاقہ یا محفوظ مقام اس وقت تک ہتھ نہیں رہ گیا تھا جس کی بھارت کو سری نگر، لداخ یا جموں کے تحفظ اور دفاع کے لیے ضرورت ہو۔

——کمونہ روڈ انگریز سرکار کی مہربانیوں سے پہلے ہی ان کے قبضے میں تھی اور اب جموں سے پونچھ اور سری نگر تک انہوں نے اپنی رابطہ لائن بڑی مضبوطی سے قائم کر لی تھی۔

دوسری طرف ہمارے ہاتھ کوئی بھی تاش کا ایسا پتہ نہیں رہ گیا تھا جسے دکھا کر ہم ہاری ہوئی بازی جیت جاتے۔ ہمارے پاس کوئی ایسا مضبوط محاذ نہیں تھا کہ بھارت پر دباؤ ڈال کر ہم اسے رائے شماری کے لیے مجبور کر سکتے۔

قائداعظم" کی رحلت کے ساتھ ہی اصل میں مسئلہ کشمیر کو بھی موت آ گئی تھی۔ بابائے قوم نے حکم دیا تھا "انہیں گولیوں اور بموں کی زبان میں سمجھاؤ۔"

——وہ جب تک زندہ رہے، کشمیر کے متعلق فکرمند رہے اور جب یہ آخری چراغ بھی بجھ گیا اور ایوان اقتدار میں جوتیوں میں دال بٹنے لگی تو ارباب بست و کشاد اپنی گدیوں کے متعلق فکرمند ہوئے۔ انہوں نے قائد کی وفات کے بعد جتنا عرصہ بھی جنگ جاری رکھی، انتہائی بددلی سے۔ بالآخر اسے کسی منطقی نتیجے پر پہنچائے بغیر ختم کر دیا۔

شرفو کو لڑائی ختم ہونے کی اطلاع ہسپتال کے ایک کمرے میں ملی تھی۔ وہ تڑپ اٹھا، لیکن وہ اکیلا ہی کیا سارا کشمیر تڑپ اور سسک رہا تھا۔ سارا پاکستان اس سانحے سے لرز اٹھا، لیکن یہ آہ و زاریاں کبھی حکمرانوں کے دل نہ پسیج سکیں۔ ان کی کراہیں اور چیخیں ایوان اقتدار کی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر اپنی موت آپ ہی مر گئیں۔

شرفو رو بصحت ہو کر واپس آ گیا۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا، لیکن اسے زہراں کے لیے بہرحال ایک محفوظ مستقبل تلاش کرنا تھا۔ فوج میں رہتے ہوئے اس نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ نورولی اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ انتہائی بددلی اور مایوسی کے عالم میں واپس آیا۔ جس روز زہراں دلہن بن کر شرفو کے گھر آئی، اس کے بمشکل تین ماہ بعد ہی اسے ملازمت اور مطلوبہ تعلیمی استعداد کے پیش نظر کمیشن مل گیا۔

اب وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ اشرف خان عرف پاشا تھا۔

☆○☆

اقوام متحدہ میں "کشمیر ایشو" پر پاکستان نے اپنے موقف کو اس دلیل اور شدومد کے ساتھ پیش کیا کہ بھارتی وفد کو لینے کے دینے پڑ گئے اور گو وہ سلامتی کونسل سے بھاگ نہیں گیا، لیکن وہ ہی میں عافیت جانی۔ اس نے اقوام متحدہ کو بتایا کہ اسے دہلی سے ہدایت ملی ہے کہ وہ حکومتی صلاح مشورے کے لیے واپس آ جائے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور اسٹیفورڈ کرپس کا رسوخ ہز برطانوی وزیراعظم ایٹلی پر تمام کر گیا۔ برطانیہ انتہائی منافقت کی پالیسی اپناتے ہوئے بھارت کو تحفظ فراہم کرتا رہا اور بالآخر وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ برطانوی مندوب لوئیل ہیکر کو مسٹر ایٹلی کے غضب کا شکار ہو کر اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا کیونکہ وہ اس معاملے میں پاکستان کو برحق جانتے اور رائے شماری پر زور دیتے تھے۔

اپریل ۱۹۴۸ء تک پاکستان کی لٹک شوئی کے لیے برطانیہ اور امریکہ نے Pakistan & U.N.C.I.P. (United Commission on India کمیشن" کا نام دیا گیا۔ مقرر کر دیا۔ اس کو بعد میں "کشمیر

پاکستانی مندوب نے اس دوران حالات کا جائزہ لینے کے بعد وزیراعظم کو اس مضمون کا Cypher تار دے دیا تھا۔

"کشمیر کا فیصلہ نیویارک میں نہیں، کشمیر میں ہو گا۔"

کشمیر کمیشن کے ارکان پہلی مرتبہ جنیوا سے ۷ جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی آئے۔ یہ کمیشن امریکہ، کولمبیا، بلجیم، چیکوسلاواکیہ اور ارجنٹائن کے نمائندوں پر مشتمل تھا، لیکن زبان ترجمہ چیکوسلاواکیہ کے نمائندے ڈاکٹر کوربیل کو کرنا ہوتا تھا۔ وہ حالات اور بھارت کے رویے سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ ۱۹۴۹ء کے آغاز میں مستعفی ہو گئے۔ ان کے الگ ہوتے ہی کمیشن نیم مردہ ہو گیا اور بالآخر اپنی موت مر گیا۔

انہوں نے علیحدگی کے وقت پاکستانی مندوب سے کہا تھا۔

All Yours Suspicions of Pandat Nehru Were More Than Fully Justified.

(پنڈت نہرو کے متعلق آپ کے تمام شبہات حق بجانب ہیں۔)

کشمیر کمیشن کی پہلی قرارداد کی رو سے جنگ بند ہو گئی۔ ۳ جنوری ۱۹۴۹ء کو دوسری

قراردلو پر عمل کرتے ہوئے کشمیر کمیشن موقع پر دونوں فریقین کے درمیان حد فاصل قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد کمیشن کو ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قراردلو کے مطابق Truce Agreement یعنی فوجی انخلاء کے معاہدے کو ترتیب دینا تھا۔ دلی میں فریقین کے نمائندوں کو اس سلسلے میں طلب کیا گیا۔ انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے ہمراہ "منصوبہ انخلاء" بھی تیار کر کے لائیں۔

وقت مقررہ پر پاکستان نے اپنا منصوبہ پیش کر دیا' لیکن بھارتی وفد نے حسب روایت ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ عذر پیش کیا کہ ان کے کمانڈر انچیف اور وزیراعظم ابھی منصوبے پر نظر ڈالنے کے لیے وقت نہیں نکال سکے۔ قریباً" دس پندرہ روز بعد انہوں نے بالآخر اس شرط کے ساتھ منصوبہ پیش کیا کہ اسے امن کمیشن تو دیکھ لے' لیکن پاکستان کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ یہ ان کی طرف سے پاکستان اور امن کمیشن کا تمسخر اڑانے کی پہلی کوشش نہیں تھی۔ فتح کے نشے نے بھارت کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

فوجی انخلاء کے متعلق یہ طے پایا تھا کہ مجاہدین آزادی (جو قبائلیوں' کشمیریوں اور پاکستانی رضاکاروں پر مشتمل تھے) ریاست کی حدود سے فوراً" نکل جائیں۔ اس کے بعد پاکستانی فوج ساری کی ساری ریاست سے باہر چلی جائے' جب کہ بھارتی فوج کا Bulk کثیر حصہ ریاست سے نکل جائے۔

اس Bulk کی تشریح پر کمیشن اور بھارت سرکار میں ٹھن گئی۔ چنانچہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ بھارتی منصوبے پر تو ہم بحث کرنے کے مجاز ہی نہیں کہ اس طرح بقول بھارت سرکار منصوبہ انخلاء انشاء ہو جائے گا۔ ذاتی غور وخوض کے بعد کمیشن کے الفاظ تھے:

The Plan Neither Quantitatively Nor Qualitatively Complies With the Terms of the Resolution. (کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے منصوبہ قراردلو کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔)

اس مرحلے پر کمیشن بھارت کے سرد رویے کی وجہ سے اپنے تقرر کو فضول سمجھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

مجلس امن نے آسٹریلیا کے ایک جج سر اوون ڈکسن کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا کہ وہ دونوں فریقین سے گفت و شنید کے بعد اس معاملے کو خوش اسلوبی سے طے کر لیں۔ مسٹر اوون نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ کوئی علیحدہ حل اس مسئلے کا تجویز کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے پنڈت نہرو سے پوچھا اگر کوئی ایسا منصوبہ ہو تو کیا وہ اس پر پاکستانی وزیراعظم

کی موجودگی میں مذاکرات کریں گے؟ پنڈت نے ہاں کر دی۔

جب مسٹر اوون کئی تجویز لے کر پاکستان آئے تو پاکستانی وزیراعظم نے بھی رضامندی ظاہر کر دی اور وہ اپنی دانست میں "قابل عمل منصوبہ" تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ احتیاطاً" انہوں نے پنڈت نہرو کو مطلع کرنا ضروری سمجھا کہ وہ اب اپنی تجویز تیار کر چکے ہیں۔ مسٹر اوون کو اپنے ٹیلی گرام کے جواب میں جو پیغام ملا اس نے وہ ششدر کر دیا۔ پنڈت نہرو نے لکھا تھا:

"مجھے تمہارے تار کی سمجھ نہیں آئی۔ مجھے تمہاری کسی تجویز کا علم نہیں۔ میرے لیے یہ بالکل نیا معاملہ ہے۔ تم دلی آؤ تو اس پر گفت و شنید کرتے ہیں۔"

سر اوون کا واسطہ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسے شخص سے پڑا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پنڈت جی کی دعوت پر دلی چلے گئے۔ دلی ہوائی اڈے پر سرگرجا شنکر باجپائی سے جب انہوں نے پنڈت نہرو کے اس ناقابل فہم رویے کا ذکر کیا تو انہوں نے کمال بے ساختگی سے جواب دیا:

Sir Owen! I Conceive the Prime Minister Must Have Suffered an Attack of Temporary Amnesia.

(سر اوون! میرے خیال سے وزیراعظم پر نسیان کا عارضی لیکن شدید حملہ ہوا ہے۔)

"آپ انہیں کسی ہسپتال میں داخل کروائیں۔ ایسے ذمہ دارانہ عہدے پر ایسے بھلکڑ آدمی کا تقرر مناسب نہیں۔" سر اوون نے فی البدیہہ جواب دیا۔ گرجا شنکر تماشا کر رہ گیا اور سر اوون پنڈت نہرو کے رویے کے خلاف احتجاجاً" لوٹ آئے۔

اس کے بعد مجلس امن نے کینیڈا کے جنرل میکناٹن سے درخواست کی' لیکن ان کی بھی بھارت کے سامنے کوئی پیش نہ چلی۔

میکناٹن کے بعد ڈاکٹر فرینک گراہم کا تقرر ہوا۔ انہوں نے فوجی انخلاء کے لیے کیے بعد دیگرے چھ رپورٹیں پیش کیں۔ پاکستان نے ہر رپورٹ سے اتفاق کیا جبکہ بھارت نے ہر تجویز کا تمسخر اڑا کر اسے رد کر دیا۔

پاکستان نے یہاں تک کہا کہ اعتراض تو Bulk of Force پر ہے۔ بھارت جسے Bulk سمجھتا ہے اسے نکال لے۔ جو حصہ اس کے خیال میں کم فوج پر مشتمل ہے' اسے رہنے دے لیکن بھارت نے یہ تجویز بھی نہ مانی۔

اس دوران بھارت سرکار نے کشمیری عوام کو اپنے حق میں پسپا نے کے لیے ہر حربہ آزما لیا۔ ان کے کچھ لیڈروں کو پکڑ بلاکر سے اور کچھ کو لالچ و تحریص سے خرید لیا گیا تھا۔ بالآخر کشمیر میں ایک نام نہاد مجلس آئین ساز کمزی کر کے کشمیر اور بھارت کے مکمل الحاق کا اعلان کروا دیا گیا۔

بھارتی نمائندے کرشنا مینن نے موشگافی کی کہ ریاست کا الحاق تو روز اول ہی سے غیر مشروط اور مستقل ہے۔ اس میں اب کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں' چونکہ پاکستانی افواج آزاد کشمیر سے واپس نہیں گئیں' اس لیے بھارت بری الذمہ ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حالات اب بدل چکے ہیں' لہٰذا بھارت سرکار "استصواب رائے" کی قطعاً" پابند نہیں رہی۔

ان کی اس لن ترانی کا شافی جواب دیا گیا لیکن جب کوئی کسی کا حق غصب کرنے پر مصر ہو تو اس کا علاج تقریریں' تحریریں یا دلائل نہیں ہوا کرتے۔ ظالم صرف طاقت کی زبان سمجھتا ہے جو پاکستان نے ذرائع' فکری' حالات ہونے کے باوجود کسی ان دیکھے' ان جانے خوف کے تحت کبھی استعمال نہ کی اور آہستہ آہستہ مسئلہ کشمیر صرف کاغذات پر زندہ رہ گیا۔

شیخ عبداللہ جو خود کو سیاسیات کا چیمپئن کہا کرتا تھا اور جس کو قائداعظم" نے کہا تھا کہ وہ گاندھی اور نہرو کے چکر میں نہ آئے ورنہ ایک روز اسے پچھتانا پڑے گا' بالآخر معتوب ٹھہرا۔ اپنا مقاصد کے حصول کے فوراً" بعد ہی نہرو نے جس کی دوستی پر شیخ عبداللہ فخر کیا کرتا تھا اور جو تمام بھارت بلکہ دنیا بھر میں شیخ عبداللہ کا سب سے بڑا حمایتی تھا' شیخ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا ـــــ اور کشمیر میں کٹھ پتلی سرکار قائم کر کے وہاں قابض ہو گیا۔

☆○☆

شیرو بڑی حیرت سے نووارد کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

ـــــ آنے والے نے خفیہ کوڈ کے ذریعے اپنا تعارف کروانے کے بعد اسے اطلاع دی تھی: "ان کا ہیڈکوارٹر گھیرے میں لینے کے لیے فوجی ٹرک تھوڑی ہی دیر میں روانہ ہونے والے ہیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" شیرو دھاڑا۔

آسیہ اس کی آواز سن کر ہی گھبرا کر باہر نکلی تھی۔ "کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"کچھ نہیں۔ تم اندر چلو۔" شیرو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی۔

"تم بھی تو میرے ساتھ۔" اس نے نووارد کو مخاطب کیا۔

پچھلے سات سال سے وہ "صاعقہ" کے لیے سرگرم عمل تھا۔

سات سال اس کی زندگی کے سات تنگ نہیں تھے اور سات سے اس کی زندگی کے ہر تنگ سیل پر بڑے گہرے نقش چھوڑے تھے۔ ہاتھ سے بندوق چھن جانے کے بعد بھی وہ پے در پے ہونے والی قیامتوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ سیدھا کمانڈو کیمپ گیا اور اس نے بلاکم و کاست ساری داستان نبی خان کو سنا ڈالی تھی۔ نبی خان نے اس کے زخمی دل و دماغ سے تمام جزئیات پر بحث کرنے کے بعد اس کے لیے کوئی حتمی رائے نہیں دی تھی۔

"شیرو اس سب کچھ کے باوجود بھی ہمت سے راستے کھلے ہیں۔ تم اگر چاہو تو پاکستان کے کسی بھی بڑے شہر کے ہجوم میں کھو سکتے ہو اور اگر پاکستان نہیں جانا چاہتے تو بھارت کے کسی بڑے شہر کی طرف نکل سکتے ہو۔"

"یہ سب فرار کے راستے ہیں نبی خان!" شیرو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کچھ بھی کہو' لیکن ایک بات سوچ لینا۔ سانپ گزرنے کے بعد لکیر پیٹنے والوں کے لیے اس دنیا میں سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ شیرو! صبح کا بھولا صرف شام تک ہی گھر لوٹ سکتا ہے۔ اس کے بعد لوگ اسے بھلا دیتے ہیں۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم کل اپنے کسی فیصلے پر پشیمانی کا اظہار کرو ـــــ ہم موت کی شاہراہ کے مسافر ہیں۔ ہماری منزل بالآخر ایک باوقار موت پر ختم ہوتی ہے۔

ـــــ یہ راستہ بہرحال پھولوں کا نہیں' صرف کانٹوں کا ہے اور انسان مصیبت برداشت کرنے کی تو اس جذبے سے کہ وہ کل کوئی لابھ حاصل کر سکے جب کہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں۔

ـــــ ہم تم سب ایک روز مر جائیں گے۔ خدا جانے ہماری زندگیوں میں کشمیر آزاد ہو گا بھی یا نہیں' یا ہم یہ لڑائی اپنے بچوں کو منتقل کر جائیں گے اور اگر کبھی ہمارے چیتے ہی ایسا ہو بھی گیا تو کون یاد رکھے گا کہ شیرو یا نبی خان کون تھے؟ ہماری کوئی پہچان نہیں۔ ہم کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں۔ ہمارا تو صرف ایک مصرف ہے کہ ہماری لاشوں پر آنے والی نسلیں اپنے اقتدار کے ایوان سجائیں ـــــ اب بھی وقت ہے شیرو! لوٹ جاؤ۔"

شیرو نے ایک لمحے کے لیے آنکھ بھر کر نبی خان کی طرف دیکھا۔ "نبی خان! کشمیر آزاد ہو گا یا ہم مر جائیں گے۔"

اس نے فیصلہ کن جواب دیا تھا ـــــ اور پھر

شیرو "صاعقہ" کا ہو کر رہ گیا۔

شیرو ڈکیت

نبی خان کو اس کی آسیہ سے ملاقات کا علم تھا۔ وہ شیرو کو بتائے بغیر ہی ایک روز وہاں چلا گیا۔ آسیہ کے بھائیوں نے شیرو کے چچا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور نبی خان وہاں کر کے واپس آیا تھا۔ اس کے بعد ہونے پر ہی شیرو آسیہ کے بھائیوں کو ملنے گیا تھا۔ جب اس کی آمد پر آسیہ کے بھائیوں نے گرم پانی سے اس کے پاؤں دھوئے تو کشمیری روایات کے مطابق انہوں نے اسے صرف عزت ہی نہیں دی تھی بلکہ اس سے ایک خاص نسبت طے کرنے پر بھی اپنی خواہشات کا اظہار کیا تھا۔

نبی خان نے جب اسے بتایا کہ آسیہ کے بھائی اسے رشتہ دینے کے لیے رضامند ہیں تو اس کا ردعمل بڑا عجیب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس اطلاع پر مسرت کا اظہار کرے یا ان کی پیش کش کو ٹھکرا دے۔

"نبی خان" اس نے جذبات سے قطعی عاری آواز میں اسے مخاطب کیا تھا۔ "میں تمہیں اپنا راہنما ہی نہیں بلکہ بزرگ بھی تسلیم کرتا ہوں اور میرے متعلق تمہارے جو جذبات ہیں' میں ان سے بھی آگاہ ہوں لیکن ہم لوگ جس راستے کے مسافر ہیں وہاں کسی کو اپنا ہمراہی بنانا اس کے ساتھ زیادتی نہ ہو گی؟"

"شیرو!" نبی خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اگر تم مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہو تو میرا فیصلہ بغیر کسی بحث کے قبول کر لو۔ میں جو کچھ سوچوں گا تمہاری بھلائی کے لیے ہی سوچوں گا۔"

شیرو نے صرف چند لمحے اس کے چہرے پر نظریں جمائیں' جہاں اس کے لیے شفقت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"ٹھیک ہے چاچا۔" اس نے گردن جھکا لی۔

☆○☆

آسیہ پڑھی لکھی لڑکی تھی جس نے ایک خاص سیاسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کی

تربیت ایک مخصوص نہج پر کی جا رہی تھی۔ اپنے والدین کی موت تک وہ کانگریسی خیالات رکھتی تھی' لیکن جو سلوک اس کے گھر والوں کے ساتھ کانگریسی ذہنیت نے کیا تھا' اس نے آسیہ کو یقین دلا دیا تھا کہ گاندھی یا شیخ عبداللہ لاکھ امن کے پرچارک بنیں' ہندو مسلم اتحاد کی باتیں کریں' ہندو کی مسلمان کتنا ہی غیر متعصب ہو' ہندو کے ذہنی کلای تو ممکن ہے' لیکن عملی طور پر نہیں۔ لے کیسے ہی نیک جذبات رکھے' لیکن اس کی فطرت میں چھپی مسلم نفرت ہمیشہ ہندو پر غالب رہے گی۔ اس حادثے نے آسیہ کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ اسے گاندھی اور شیخ عبداللہ کے نظریات کھوکھلے' بے بنیاد اور ناقابل عمل دکھائی دینے لگے تھے۔

جس روز وہ شیرو کی دلہن بن کر آئی' بہت خوش تھی کہ زندگی میں اسے کم از کم وہ خاوند تو ملا جس کی اس نے خواہش کی تھی۔ شیرو کو نبی خان اور آسیہ کے بھائیوں نے فروٹ کا کاروبار بھی کروا دیا تھا۔ اس کے آبائی باغ پونچھ میں موجود تھے جو اس نے موقع ملتے ہی اونے پونے داموں ایک مقامی مسلمان کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی کچھ پونجی بنا لی تھی۔

پہلے پہل تو اس نے آسیہ کو اپنی "نجی مصروفیات" کی خبر نہ ہونے دی' لیکن بہرحال وہ اس کی بیوی تھی اور شیرو نے اس کے اندر چھپی مسلمان اور کشمیری عورت کو بھی دیکھ لیا تھا اس سے پہلے تو وہ اپنے اکثر غائب ہو جانے کو "کاروباری مصروفیات" کا بہانہ بنا لیا کرتا تھا' لیکن ایک روز اسے آسیہ کو اعتماد میں لینا پڑا۔

آسیہ نے بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے اس کی باتیں سنیں اور اس کے ردعمل سے تو شیرو بھونچکا رہ گیا۔ آسیہ نے اسے بتایا کہ جو بات وہ اسے آج بتا رہا ہے' اس کا علم اسے پچھلے ڈیڑھ سال سے ہے۔ اس نے شیرو کو بتایا کہ اس کی غیر معمولی حرکات پر وہ تجسس صرف اسی لیے نہیں ظاہر کرتی تھی کہ مبادا کبھی شیرو شکوک و شبہات کا شکار ہو کر اپنے عظیم مشن کو سبوتاژ سے بچا نہ سکے۔

"میں خود کو آج سے پہلے تو اس لیے خوش قسمت جانتی تھی کہ میں ایک مجاہد کی بیوی بن کر اس کی خدمت کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔" آسیہ نے کہا۔ "لیکن آج میری خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں' آپ نے مجھے اس قابل جانا کہ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی اصلیت

[illegible]

[illegible] تیرے سامنے [illegible] نے انہیں ایک بیٹی دے دی تھی۔ عائشہ کی آمد نے بھی

شیرو کے معمولات میں کوئی فرق نہ ڈالا۔

"[illegible] ساتھ" کی سرگرمیاں اگرچہ سخت ترین خفیہ حفاظتی انتظامات اور خفیہ پولیس سے اپنی دل کی وجہ سے کچھ محدود ہو کر رہ گئی تھیں' لیکن سری نگر میں ان تنظیموں نے کبھی ہمت نہ ہارنا گوارہ نہ کیا۔ آئے دن وہ کوئی نہ کوئی چکھ نیا کچھ کرتے رہتے تھے۔ نبی خان کی کمر توڑ دی تھی لیکن اس نے تو جیسے ہار نہ ماننے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ شیرو دیکھ رہا تھا کہ کل کے دشمن آج کے دوست اور کل کے دوست آج کے دشمن بنتے جا رہے ہیں۔ بنیا ذہنیت نے مسلمانوں کی کمزوریاں ڈھونڈ کر ان کا استحصال کرنے کی جو پالیسی اپنا رکھی تھی' کانگریسی خیالات کے حامل لیڈروں کا جانبدارانہ اور متعصبانہ رویہ اس کی تائید کر رہا تھا۔ کشمیر کے بیشتر خاندان لکھ پتی بنتے جا رہے تھے۔ پاکستان نواز جماعتوں کی سرگرمیاں ماند پڑتی جا رہی تھیں اور شیرو کے اکثر ساتھی بددل ہو کر پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ ان کی تنظیم کے دو تین مرکز بھی اپنوں کی غداری کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

لیکن آج کی صورت حال نے تو واقعی اسے بوکھلا دیا تھا۔ ان کا ایک ساتھی جو خفیہ پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں ملازم تھا' خبر لایا تھا کہ چن زیب نے جو ان کا سب سے قابل اعتماد ساتھی تھا' لانچ میں آ کر ان کا ٹھکانہ بتا دیا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد پولیس اور فوج کی مشترکہ سرکوبی کے لیے یہاں پہنچنے والی ہے۔

☆○☆

[illegible] کو ساتھ لیے وہ دوسرے کمرے میں پہنچا جہاں نبی خان اور اس کے ساتھی صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ ان پر چن زیب کی غداری کی خبر بجلی بن کر گری۔

"اپنا اسلحہ سنبھالو اور یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔"

---نبی خان نے سنبھلتے ہوئے حکم دیا۔ پھر وہ شیرو سے مخاطب ہوا۔ "شیرو! میرے بیٹے۔ آج میری آخری بات مان لو۔ آسیہ اور اپنی بچی کے ساتھ پاکستان چلے جاؤ۔ یہ ظالم کی سیاہ رات ڈھلتی دکھائی نہیں دیتی۔ میرے بچے! ہمارا مقابلہ دشمن سے نہیں' اپنوں سے ہے اور ہمارا جوابی وار بھی اپنے اوپر ہی ہوتا ہے۔ ممکن ہے کبھی تقدیر کو ہم پر رحم آ جائے اور وہ ہمیں کم از کم اپنوں کے عتاب سے بچ نکلنے کی مہلت نصیب کر دے۔"

"چاچا!" شیرو کا گلا رندھ گیا۔ "چاچا کشمیر کا آخری حصار بھی ٹوٹ جائے گا۔" وہ تڑپ کر رو پڑا۔

"یہ خدائی فیصلہ ہے میرے بچے۔ اسے قبول کرنا ہی ہو گا۔ ہمارے اعمال نے ہمیں

دن دکھانے ہی تھے۔ یہ لو اسنین کن۔" اس نے ایک گن شیرو کی طرف بڑھائی اور دوسرے کمرے میں موجود آسیہ کو بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ ننھی عاکفہ آنے والی قیامت سے بے خبر اپنی ماں کے سینے سے چمٹی گہری نیند سو رہی تھی۔

"آسیہ میری بچی!" نبی خان نے جھک کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ وہ سامنے والے راستے کی طرف سے نکل کر گاؤں کے باہر والے مندر تک پہنچو۔ ہم تمہارے پیچھے آتے ہیں۔"

نبی خان نے آسیہ کو خفیہ راستے کی طرف روانہ ہونے کی ہدایت کی۔

——شیرو نے بے اختیار آگے بڑھ کر سوئی ہوئی عاکفہ کا منہ چوم لیا۔ "اللہ کے حوالے آسیہ۔ فی امان اللہ!!" اس میں آسیہ سے نظریں ملانے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔

"خدا حافظ——!" آسیہ کا گلا رندھ گیا۔

اس نے بچی کو چادر میں اچھی طرح لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹا لیا اور اس راستے پر گامزن ہو گئی جو کسی ہنگامی ضرورت کے وقت اسے اختیار کرنا تھا۔

نبی خان نے آنکھوں سے لگی دوربین سے وہ ٹرک دیکھ لیے تھے جنہوں نے گاؤں کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا تھا۔

"ادھر آؤ شیرو۔ ہم دوسری طرف سے نکلیں گے۔"

——اس نے آسیہ کی مخالف سمت میں بڑھتے ہوئے شیرو سے کہا۔

دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں اپنی اپنی گنیں سنبھالے چل رہے تھے' لیکن دونوں یہ بات بھول چکے تھے کہ چن زیب نے سب سے پہلے دشمن کو فرار کے خفیہ راستے ہی سے آگاہی دی ہو گی۔

اور دونوں بمشکل چند گز آگے بڑھے تھے جب ہوائی فائرنگ نے ان کے قدم تھام لیے۔

نبی خان نے ایک آڑ میں رکتے ہوئے دوبارہ دوربین آنکھوں سے لگائی تو جیسے اس کا وجود پتھر ہو گیا۔ وہ منظر ہی کچھ ایسا تھا۔ آسیہ کے فرار والے راستے کے عین سامنے سے اچانک نمودار ہونے والے فوجیوں نے اسے للکارنے یا "ہالٹ" کہنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی۔

بیک وقت تین چار گنوں کی سرخ زبانیں اس طرف لپکیں اور آسیہ کا جسم خون میں

نہا گیا۔

نبی خان نے کشمیر کی بیٹی کو لہو کا غسل لیتے ہوئے تیورا کر گرتے دیکھا۔ اس کی معصوم بچی ماں کی گود میں آواز ڈھالنے کی مہلت بھی شاید نصیب نہیں ہوئی تھی جب اسے اپنا وجود مٹی میں اترتا محسوس ہوا۔ آسیہ ڈگمگا کر پہلو کے بل گری تھی۔ اس کی کوشش تھی جب فرشتہ اجل نے اسے آ لیا۔ آسیہ ڈگمگا کر پہلو کے بل گری تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ آخر دم تک اس سے جدا نہ ہو سکے۔ اس کی کوشش اتنی سخت تھی کہ وہ آخر دم تک اس سے جدا نہ ہو سکی۔

ماں بیٹی کا خون ایک دوسرے کے خون میں مل کر ایک ہو گیا تھا۔

——ننھی عاکفہ ابھی تک اپنی ماں کے پہلو سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسموں سے بہنے والا لہو اب نبی خان کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ اس کے وقت ایک دوسرے سے اس طرح سختی سے جڑے ہوئے تھے کہ اس کے جوڑوں کی ہڈیاں باہر نکلی محسوس ہو رہی تھیں۔ حملہ آوروں نے رک کر ماں بیٹی کی موت کی تصدیق بھی نہیں کی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے اس پہاڑی کی طرف آ رہے تھے جہاں "صاعقہ" کے جانبازوں کی موجودگی نے ان کے تن بدن میں آگ لگائی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے چاچا——؟ کیا ہوا؟ مجھے دکھاؤ۔" شیرو نے جب گنگی باوے نبی خان کو اس سمت نظریں جمائے دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔

——اس نے نبی خان کے ہاتھ کو ذرا سا ہٹا دے کر دوربین اس کی آنکھوں سے ہٹا لی تھی اور—— پھر دوربین شیرو کی بے چین آنکھوں پر جم گئی۔

اس میں سامنے کا منظر دیکھنے کی تاب نہ رہی تھی۔

——بمشکل چند لمحے ہی دوربین اس کی آنکھوں پر رہی تھی' جب اسے اپنا وجود مٹی ہوتا محسوس ہوا۔ اسے یوں گمان گزرنے لگا جیسے وہ آہستہ آہستہ قطروں میں سرد رہا ہو—— دوربین اس کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر گر پڑی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح خود بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔

——اس کا بدن سرسام کے مریض کی طرح جھٹکوں سے کپکپا رہا تھا۔ اس کے سامنے کا منظر دھندلانے لگا تھا اور اس کی بیوی اور بچی کے مقدس اور معصوم خون کی چادر اس کی آنکھوں کے سامنے تن گئی تھی—— اسے اردگرد کے مناظر اور اپنے گردا گرد کھڑے ساتھی اسی لہو میں ڈوبتے' غرق ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس کی آنکھوں سے ٹپکتا لہو انگارے بن کر اس کے گالوں پر بہنے لگا' پھر جیسے اس کے لہو کا خمیر بدلنے لگا۔ اچانک ہی اسے یوں لگا جیسے کسی نے طاقتور انجکشن کے ذریعے اس کے لہو میں آگ بھر دی ہے۔ اس کے بدن میں انگارے تڑپنے لگے اور وہ جو اپنے بدن سے

تکی محسوس ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ واپس آنے لگی۔ کسی ان دیکھی طاقت نے اسے دشمن سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

"میں انتقام لوں گا۔" وہ بڑبڑایا۔ "انتقام ـــــ انتقام!"

اس نے گردن موڑی تو نبی خان کی انگارہ آنکھوں سے خارج ہوتی برقی لہریں اسے اپنے جسم میں دھنستی محسوس ہو رہی تھیں۔ بوڑھے نبی خان کی انگلیاں اس کے بازو کے گوشت میں اترنے کے بعد ہڈی کے گرد اپنا شکنجہ تنگ کر رہی تھیں۔

"شیرو!" نبی خان کی آواز کا تیر تھا کہ شیرو اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے صرف سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے ہی پر اکتفا کیا۔ "تو نے "صاعقہ" میں شمولیت کے وقت ایک حلف دیا تھا مجھے۔" نبی خان غرایا۔

"ہاں چاچا۔" شیرو کو بولنے کے لیے بڑا زور صرف کرنا پڑا۔

"میرے بیٹے! تو نے کبھی میری اطاعت سے منہ نہیں موڑا اور آج بھی میرا یہ آخری حکم تجھے ماننا ہو گا۔ جس طرح بھی ممکن ہو' چن زیب کو جان سے مار ڈالنا' پھر پاکستان پہنچ جانا۔ میں دشمن سے تمہاری بیوی اور بچی کا انتقام لوں گا اور تم سارے کشمیر کے بے گناہوں کے خون کا انتقام لینے کے لیے تیاری کے ساتھ واپس آنا۔ شیرو! اگر تو ہمارے پیچھے آیا! یہاں سے فوراً" نہ نکل گیا تو صف توڑنے پر میں روز قیامت تیرے گریبان پر ہاتھ ڈالوں گا۔ جا میرے بیٹے! نکل جا یہاں سے۔ تیرے سوا اور کوئی مجھے ایسا نظر نہیں آتا کہ جو میرے مشن کو جاری رکھ سکے۔"

شیرو کی حالت اس بپھرے اور تلملائے ہوئے شیر کی سی تھی جس کے سامنے سے اس کا شکار اچانک ہٹا لیا جائے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کچھ کر گزرے۔

ـــــ چاچا نبی خان نے قرآن مجید پر اٹھایا ہوا حلف یاد دلا کر اس کے ہاتھ پاؤں دیئے تھے۔

وہ یہاں سے زندہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ آسیہ اور اپنی بچی کی طرح ان لوگوں کی طرح جو اس کے سامنے مرنے جا رہے تھے' دشمن سے لڑتا ہوا مر جائے' لیکن نبی خان اس کے اور موت کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنا فیصلہ اٹل کر اسے سنا دیا تھا۔

"شیرو! چن زیب کو اس خنجر سے قتل کرنا۔ اس کی موت جتنی اذیت ناک ہو گی' اتنا ہی تیرے دل کو اطمینان و سکون ملے گا۔ جاؤ ـــــ جاؤ! خدا تمہارا نگہبان ہو۔ ادھر آزاد کشمیر

والوں کو ہمارا سلام پہنچا دینا۔ وہاں کے لوگوں کو بتانا کہ ہم نے کشمیر کو بھلایا نہیں ـــــ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھ ہے۔ یہاں آزادی کی جو شمع ہم نے ہوا میں نہیں' سری نگر کی گلیوں میں روشن کی تھی' ہم اپنے خون سے اس کی لو کو تیز کرتے رہیں گے۔ ہماری تاریخ لکھے گا ـــــ وہی ہمارا فیصلہ ہو گا۔ تو جا شیرو!"

نبی خان نے سماعت کمزور شیرو کے ایک ہاتھ میں خنجر تھما کر اور اس کے دونوں ہاتھوں میں لے کر شدت جذبات سے دبایا۔ اس کے ماتھے کو بوسہ دیا اور اسے ہلکی سی دھکا دے کر اس راستے کی طرف بڑھا دیا جو انہوں نے اس طرف سے حملہ کرنے والوں کی پسپائی کی تکمیل و حفاظت کے لیے منتخب کر رکھا تھا۔

☆○☆

شیرو دل پر پتھر رکھ کر پلٹا تھا۔

ـــــ اس نے اپنا سفر یہاں سے روانہ ہونے والے سربلندوں کی خاصی سست میں شروع کیا تھا۔ اس کی جیب میں کچھ کرنسی تھی۔ ایک خنجر کپڑوں کے نیچے بندھا ہوا تھا اور بیلٹ میں گولیوں کے علاوہ اس نے ہاتھوں میں اشین گن اور پہلو سے لٹکتے تھیلے میں بھری ہوئی کچھ میگزینیں اور گرنیڈ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔

روانگی کے وقت اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ عاکفہ اور آسیہ کے خون میں لتھڑے ہوئے جسم اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے۔ وہ بیک وقت زندہ بھی تھا اور مردہ بھی۔ اسے اپنی بیوی اور بچی کا آخری دیدار تک نصیب نہیں ہوا تھا۔

یہ تھا اس کی تمام تر جدوجہد کا نتیجہ۔ اس روز بد کو دیکھنے کے لیے اس نے اتنی قربانیاں دی تھیں کہ ان میں سے انہی کا کوئی ساتھی اٹھے اور چند لمحے اپنے ضمیر کی قیمت وصول کر کے ان سب کے کیے کرائے پر پانی پھیر دے؟ اس نے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھا اور کانوں سے سنا تھا جو کشمیر آزاد کروانے کے لیے اپنی جان سے گزر جانے کی قسمیں کھایا کرتے تھے' لیکن جو ٹکوں کے مول بک گئے۔ معمولی عہدوں اور سکوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کل تک جو لوگ بھارتی حکومت کا نام سننا گوارہ نہیں کرتے تھے وہ آج اس حکومت کے ستون بنے ہوئے تھے۔

شیخ عبداللہ کا حشر بھی ان لوگوں کو خواب غفلت سے نہیں جگا سکتا تھا۔

ـــــ ۱۹۵۲ء کے بعد سے جو حشر شیخ عبداللہ کا ہو رہا تھا' وہ سب کے سامنے تھا لیکن سب اقتدار کی کرسیوں سے چمٹے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی فکر میں تھے۔ کل تک کشمیر

تھا۔ "یہ سب بکواس ہے۔ کوئی انتخاب نہیں آئے گا یہاں۔ یہ لوگ محض چند نمونے ہیں۔ ہمارے
لیے سارے کشمیر کی عزت سے ہمیشہ کھیلتے رہیں گے۔ یہ سب چور ہیں، ڈاکو ہیں۔ الحاق سے
کمائیں گے اور خود اپنا کاروبار کھیلا ہے۔"

اچانک ہی زوردار دھماکوں نے اس کے قدم ڈگمگا دیئے۔ وہ سمجھ گیا کہ ——— دشمن اس
کے ساتھیوں کے نرغے میں پھنس چکا ہے اور انہوں نے ہینڈ گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے
ہیں۔

——— لیکن شیرو جانتا تھا کہ اب اس کے ساتھیوں کے بچ نکلنے کے امکانات بھی ختم ہو
رہے تھے۔

☆○☆

اس نے فرار کے لیے طویل پہاڑی راستہ منتخب کیا تھا کیونکہ نزدیک کے دو تین دیہات
میں فوج نے اپنے گھیرے میں لے رکھے تھے اور اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر مرنا اسے گوارا
نہیں تھا۔ رات کے دوسرے پہر وہ سری نگر شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ اپنے کسی اڈے کی
بجائے اس کا رخ سری نگر کی اس مضافاتی آبادی کی طرف تھا جو حال ہی میں آباد ہوئی تھی
جہاں چن زیب کو جو سرکاری افسر ہونے کے علاوہ ان کا ساتھی بھی تھا، ایک خوبصورت بنگلہ
الاٹ ہوا تھا۔

ان لوگوں نے چن زیب کے متعلق کبھی غداری کا تصور بھی نہیں کیا تھا کیونکہ وہ بے
[illegible] طرح سے مطمئن زندگی گزار رہا تھا اور یہاں بہرحال ایک بہتر مستقبل کے ساتھ
[illegible] تھا۔ لیکن وہ انہیں "ڈبل کراس" کر گیا۔ محض چند ہزار روپوں کے لالچ میں کیونکہ
[illegible] چن زیب اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر کر رکھا تھا۔
[illegible] انہیں گن کے ساتھ یہاں تک پہنچنا ناممکن نہیں تھا۔ اسے اپنی گن خود
[illegible] بہت ہوا تھا، لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا رہ گیا تھا۔
[illegible] بنگلہ کمرے اور اندھیرے کی چادر میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ کے اندر ایک
[illegible] کھڑی تھی جس کے پیچھے لگی تختی چن زیب کا عہدہ بڑھ جانے پر دلالت کرتی
تھی۔ پھاٹک کے وسط میں بنے کمرے سے نکلتی روشنی شیرو کو چوکنا کر رہی تھی کہ عمارت کے
[illegible] ابھی جاگ رہے ہیں۔ شیرو بخوبی اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ چن زیب ان لوگوں کی
[illegible] کسی ایسی کارروائی کے ڈر سے نہیں جاگ رہا تھا۔ اس کے "آقاؤں" نے

اسے یقین دلا دیا ہو گا کہ تمام "غدار" مارے گئے ہیں۔ خود اسے بھی یقین تھا کہ کوئی زندہ ہی
کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے فرار کے تمام راستوں کی نشان دہی کر دی تھی۔
پھاٹک کی چھوٹی سی اونچائی والی دیوار پھاند کر جب وہ اندر داخل ہوا تو ان لوگوں کی اس
قدر بے پروائی پر وہ متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ باہر کوئی ذی روح نہیں تھا تو موجود بھی نہیں تھا۔
——— اور اس احساس نے کہ وہ اپنی جان اور معصوم بچی کے قتل کے گھر میں آ گیا
ہے، اس کے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ وہ کسی بھی لمحے خونخوار چیتے کی طرح چن
زیب پر جھپٹ کر اسے چیر پھاڑ دینا چاہتا تھا۔ اس کا سارا دکھ قہر میں ڈھل رہا تھا اور وہ کسی
بھی لمحے ابل کر اس پر ٹوٹنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

کسی بھی ممکنہ مدافعت کا بندوبست اس نے وہیں برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں
رک کر کر لیا تھا۔ وہ بلی کی طرح دبے قدموں اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا
تھا۔ کمرے سے شراب کے نشے میں دھت آوازیں اب اسے بخوبی سنائی دینے لگی تھیں۔
کبھی کبھی مردانہ قہقہوں کے ساتھ نسوانی چیخ نما ہنسی بھی ابھر رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا
کہ غدار اندر داد عیش دے رہا ہے۔

ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے کچھ سوچا پھر خنجر کو جو اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا
دوبارہ اپنی لمبی گرم جراب میں اڑس لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ریوالور کو ہاتھوں میں تول رہا
تھا۔ اچانک آسمان پر بادل زور سے دھاڑے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ جوش
انتقام سے اس کے سانسوں کی ترتیب بگڑنے لگی تھی۔ اس نے منہ کے ذریعے دو تین لمبے
لمبے سانس باہر پھینک کر خود کو نارمل کیا۔

دروازے پر اس نے اتنی زوردار لات ماری کہ اسے کھولا تھا کہ اس کی چٹخنی ٹوٹ گئی۔
اندر چن زیب اور ایک فوجی صوفے کے سامنے میز پر ——— شراب کی بوتل رکھے بیٹھے تھے
جو تقریباً" خالی ہو رہی تھی۔ ایک آبرو باختہ لڑکی ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی جس کی
آنکھیں شیرو کو دیکھتے ہی خوف سے پھٹ چلی تھیں اور چیخ اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی
تھی۔

چن زیب کا نشہ شیرو پر نظر پڑتے ہی ہرن ہو گیا جس کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کی
نالی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"تت..... تت..... تم۔" اس پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

"کک..... کک..... کون ہو تم؟" فوجی افسر خوف سے منجمد ہو چکا تھا۔

کے جو وفادار تھے' آن بان چھوڑ کر غاصبوں کی وفاداری کے گن گا رہے تھے۔ شیرو سوچتا رہا تھا "یہ سب بکاؤ ہے۔ کوئی انقلاب نہیں آئے گا یہاں۔ یہ لوگ محض چند ٹکڑوں کے لیے سارے کشمیر کی عزت سے ہمیشہ کھیلتے رہیں گے۔ یہ سب چور ہیں' ڈاکو ہیں۔ انہوں نے کمات لگا کر خود اپنا شکار کھیلا ہے۔"

اچانک ہی زوردار دھماکوں نے اس کے قدم ڈگمگا دیئے۔ وہ سمجھ گیا کہ ـــــ دشمن اس کے ساتھیوں کے نرغے میں پھنس چکا ہے اور انہوں نے ہینڈ گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے ہیں۔

ـــــ لیکن شیرو جانتا تھا کہ اب اس کے ساتھیوں کے بچ نکلنے کے امکانات بھی ختم ہو رہے تھے۔

☆○☆

اس نے فرار کے لیے طویل پہاڑی راستہ منتخب کیا تھا کیونکہ نزدیک کے دو تین دیہات بھی فوج نے اپنے گھیرے میں لے رکھے تھے اور اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر مرنا اسے گوارہ نہیں تھا۔ رات کے دوسرے پہر وہ سری نگر شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ اپنے کسی اڈے کی بجائے اس کا رخ سری نگر کی اس مضافاتی آبادی کی طرف تھا جو حال ہی میں آباد ہوئی تھی جہاں چن زیب کو جو سرکاری افسر ہونے کے علاوہ ان کا ساتھی بھی تھا' ایک خوبصورت بنگلہ الاٹ ہوا تھا۔

ان لوگوں نے چن زیب کے متعلق کبھی غداری کا تصور بھی نہیں کیا تھا کیونکہ وہ بے نیاز اور ہر طرح سے مطمئن زندگی گزار رہا تھا اور یہاں بہرحال ایک بہتر مستقبل کے ساتھ قیام پذیر تھا' لیکن وہ انہیں "ڈبل کراس" کر گیا۔ محض چند ہزار روپوں کے لالچ میں کیونکہ سرکار نے نبی خان اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر کر رکھا تھا۔

شیرو کے لیے اسٹین گن کے ساتھ یہاں تک پہنچنا ناممکن نہیں تھا۔ اسے اپنی گن خود سے جدا کرتے ہوئے دکھ تو بہت ہوا تھا' لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا رہ گیا تھا۔

مضافاتی آبادی کا یہ بنگلہ گہرے اور اندھیرے کی چادر میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ کے اندر ایک سرکاری جیپ کھڑی تھی جس کے پیچھے لگی تختی چن زیب کا عہدہ بڑھ جانے پر دلالت کرتی تھی۔ بنگلے کے وسط میں بنے کمرے سے نکلتی روشنی شیرو کو چوکنا کر رہی تھی کہ عمارت کے مکین ابھی جاگ رہے ہیں۔ شیرو بخوبی اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ چن زیب ان لوگوں کی طرف سے کسی انتقامی کارروائی کے خوف سے نہیں جاگ رہا کیونکہ اس کے "آقاؤں" نے

اسے یقین دلایا ہوگا کہ تمام تر ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ہے۔ وہ اسے بھی چین سے سونے دیں گے جاگنا تو اسے اس لیے تھا کہ اس نے فرار کے تمام راستوں کا نشان دہی کرنی تھی۔

پچھلے کی پھسلواں سی لوہے والی دیوار پھلانگ کر جب وہ اندر داخل ہوا تو اس کی قدرے پرواہ نہ کی۔ جب وہ سنبھلا تو ـــــ اور اس نے محسوس کیا کہ وہ ـــــ اور اس کے تن بدن میں گھٹنے بجھا دیئے تھے۔ وہ کسی بھی لمحے طوفان چھپنے کی طرح بھی اجل بن کر اس پر ٹوٹنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

کسی بھی ممکنہ مداخلت کا بندوبست اس نے وہیں برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں رک کر کر لیا تھا۔ وہ بلی کی طرح دبے قدموں اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کمرے سے شراب کے نشے میں مست آوازیں اب اسے جوالی سنائی دینے لگی تھیں۔ کبھی کبھی مردانہ قہقہوں کے ساتھ نسوانی چیخ نما ہنسی بھی ابھر رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ غدار اندر داد عیش دے رہا ہے۔

ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے کچھ سوچا پھر خنجر کو جو اس نے ہاتھ میں تیار رکھا تھا دوبارہ اپنی لمبی گرم جراب میں اڑس لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ریوالور کو ہاتھوں میں تول رہا تھا۔ اچانک آسمان پر بادل زور سے دھاڑے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ جوش انتقام سے اس کے سانسوں کی ترتیب بگڑنے لگی تھی۔ اس نے منہ کے ذریعے دو تین لمبے لمبے سانس باہر پھینک کر خود کو نارمل کیا۔

دروازے پر اس نے اتنی زوردار لات مار کر اسے کھولا تھا کہ اس کی چٹخنی ٹوٹ گئی۔ اندر چن زیب اور ایک فوجی صوفے کے سامنے میز پر ـــــ شراب کی بوتل رکھے بیٹھے تھے جو قریباً خالی ہو رہی تھی۔ ایک آدھ باختہ لڑکی ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی جس کی آنکھیں شیرو کو دیکھتے ہی خوف سے پھٹ چلی تھیں اور چیخ اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی تھی۔

چن زیب کا نشہ شیرو پر نظر پڑتے ہی ہرن ہو گیا جس کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کی نالی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"تت..... تت..... تم۔" اس پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

"کک..... کک..... کون ہو تم؟" فوجی افسر خوف سے منجمد ہو چلا تھا۔

"کوئی آواز منہ سے نہ نکالنا۔" شیرو پھنکارا۔ اس کی لہو بھری آنکھیں چن زیب کو اپنے سینے میں دھنستی محسوس ہو رہی تھیں۔

تینوں لرز کر رہ گئے۔

"تم۔" اس نے لڑکی کی طرف ریوالور کی نال سے اشارہ کیا۔ "اٹھو اور اپنے کپڑے پہن کر سامنے دیوار سے لگ کر کھڑی ہو جاؤ۔"

لڑکی ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کپڑوں تک پہنچی۔ کپڑے پہنتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔ اس نے جیسے تیسے کپڑے پہنے اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے حلق کو تر کرنے کے لیے اسے بار بار تھوک نگلنا پڑتا تھا۔

"تم میجر خدن ہو؟" شیرو نے کمرے میں ایک کھونٹی سے لٹکی فوجی جرسی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے فوجی کو مخاطب کیا۔

"شیرو ـــــ دیکھو....." میجر کی بجائے چن زیب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

"بکو مت۔" شیرو دھاڑا۔ وہ چن زیب کو آواز نکالنے کی مہلت بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔

چن زیب سہم کر خاموش ہو گیا۔

"بیوقوف مت بنو جوان۔" اس کا مخاطب بہرحال آرمی انٹیلی جنس کا میجر تھا۔ جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا دے لیا۔ "تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔ میں....."

"میں جہاں سے بچ کر آ گیا ہوں' وہاں تم نے اس غدار کی مخبری پر بہت فوج بھیجی تھی مجھے مارنے کے لیے۔" شیرو اس کی بات کاٹ کر غرایا۔ "میجر تم کو بہرحال مرنا تھا جلد یا بدیر۔ کیونکہ تمہارے ہاتھ بہت سے بے گناہوں کے خون سے رنگے ہیں۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔" میجر کو واقعی غصہ آ گیا۔

"ہاں اور میرے پاگل پن کا شکار تم چن زیب سے بھی پہلے بنو گے۔ میں تم دونوں کو مار ڈالوں گا میجر خدن۔ صرف یہ فاحشہ تمہاری کہانی سنانے کے لیے زندہ رہے گی۔" وہ غصے سے بری طرح کھول رہا تھا۔

پھر اتنی زور سے دھاڑا کہ شیرو کے ریوالور سے نکلنے والی گولی کی آواز بھی اس میں ب ... رہ گئی۔ میجر خدن نے اپنے سامنے رکھی میز کو پاؤں مارنے کی کوشش کی تھی۔ وہ شیرو کی آنکھوں کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔

گولی ... ے ... ے وسط میں دونوں آنکھوں کے بالکل درمیان لگی تھی۔ شیرو کے

نشانے کے متعلق چن زیب کو کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ میجر نے شاید اسے کوئی اہم سا بدمعاش ہی سمجھا تھا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ خون کی ایک کیر اس کے ماتھے سے پھسلی اور وہ آگے کو جھک کر میز پر گر پڑا۔ پھر ایسے جیسے اس نے بچے کھچے حوصلے سمیٹنے کے لیے اپنا سر میز پر ٹکا دیا ہو۔ ڈکرائے ہوئے کمرے کی طرف اس نے ایک سرسراتی نظر ڈالی تھی لیکن دوبارہ اسے اپنی گردن موڑنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ اس مرتبہ شیرو نے اس کا سر شانے کی ہی باہر نکال دیا تھا۔ لڑکی کے لیے یہ منظر اتنا دہشت ناک تھا کہ وہ دھڑام سے گری اور بے ہوش ہو گئی۔ شیرو نے اس کی طرف مڑ کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ وہ اب براہ راست چن زیب کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا جس کا چہرہ خوف سے نیلا پڑ چکا تھا اور خون کی ایک رمق بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"م..... مجھے..... مجھے معاف کر دو۔" وہ گھگھیایا۔

"شٹ اپ!" شیرو اتنی زور سے دھاڑا کہ ہال کی گرج میں بھی اس کی آواز گونجی تھی۔ "تم ناقابل معافی ہو۔ تمہیں خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔ ذلیل ـــــ حرام زادے" میں تمہیں اذیت ناک موت ماروں گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔" اس نے پستول اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال کر نبی خان کا دیا ہوا خنجر نکال لیا تھا۔ خنجر شیرو کے ہاتھ میں دیکھ کر خوف اور دہشت سے چن زیب کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

"اٹھو ـــــ اس طرف آؤ۔" اس نے چن زیب کو کمرے کی خالی سمت اشارہ کیا اور وہ خوف سے تھرتھراتا اس کے حکم کی پابندی کرنے لگا۔ ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے جب اچانک شیرو اپنی جگہ سے اسپرنگ کی طرح اچھل کر اس کے پہلو میں آ گیا اور اس سے پہلے کہ چن زیب کوئی مدافعت کرے' اس کے خنجر کے بھرپور وار نے چن زیب کی انتڑیاں باہر نکال دیں۔ اس کے بعد تو جیسے اس پر جنون طاری ہو گیا۔ اسے یاد بھی نہ رہا کہ اس نے چن زیب کو کتنے گھاؤ لگائے تھے۔ چن زیب کی چیخوں نے آہستہ آہستہ دم توڑنا شروع کر دیا تھا۔ لڑکی کو ہوش آ چکا تھا' لیکن سامنے کا منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں تھی۔ اس کے حلق سے بڑی بے ہنگم اور ڈراؤنی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر منہ زانوں میں چھپا لیا تھا۔

شیرو جب چن زیب سے الگ ہوا تو اس کی لاش ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ شیرو کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ اس کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ اس نے غصے سے ہانپتے ہوئے بھی چن زیب کی لاش کو ٹھوکر ماری اور اس پر تھوک کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

میجر ابھی تک مضبوطی سے اس کے ہاتھ میں تھا۔ شیرو نے ایک نظر میجر کے سینے پر بنے "شاہین" پر ڈالی۔ یہ "صاعقہ" کا امتیازی نشان تھا اور اسے چن زیب کی لاش پر پڑا ہوا دیکھ کر اس کے ہاتھ سے میجر کا جسم چھوٹ گیا۔

اب اسے آہستہ آہستہ قرار آنے لگا تھا۔ چن زیب کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے اسے ایک عجیب سا روحانی سکون محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنے اوپر پڑا منوں بوجھ اتار کر پھینک دیا ہو۔ وہ ایک آگ سی جو شام سے اب تک اس کے اندر مسلسل دہک رہی تھی چن زیب کے خون کے چھینٹوں نے اس پر شبنم کا کام کیا تھا۔

اچانک ہی آسیہ اور اس کی بچی کے خون میں نہائے ہوئے لاشے اس کے سامنے سوال بن کر آن کھڑے ہوئے اور اس کی دہکتی آنکھوں سے گرم آنسوؤں کے دھارے نکل کر اس کے چہرے پر پھیلنے لگے۔ جلد ہی وہ نارمل ہو گیا۔

اس نے لڑکی کو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونے کو کہا اور باتھ روم کے کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اپنا پستول اور گولیاں ایک طرف رکھ کر اس نے اپنے کپڑے چند لمحوں میں اتار دیئے تھے۔ بمشکل دو منٹ بعد وہ اپنا منہ ہاتھ دھونے سے فارغ ہو گیا تھا بظاہر اب اس کے جسم پر خون کا کوئی دھبہ نہیں رہا تھا۔ الماری سے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر اس نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور باہر نکل آیا۔ لڑکی کو اس نے باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔

کمرے میں رک کر اس نے کپڑوں کے اوپر میجر کا ویسٹ کوٹ پہنا۔ ٹوپی سر پر جمائی اور اس کے کپڑوں کی تلاشی لینے سے جو چابیوں کا گچھا برآمد ہوا تھا' اسے ہاتھ میں تولتا باہر نکل آیا۔ دوسرے ہی لمحے باہر کھڑی میجر شنڈن کی جیپ میں وہ اڑا چلا جا رہا تھا۔ ہری پربت اور بڈام وادی سے گزرتا وہ اس سڑک پر آ گیا تھا جو سری نگر کو سورہ سے ملاتی تھی۔ جھیل کے کنارے جیپ روک کر اس نے چند لمحے کچھ سوچا' پھر جیپ کو پہلے گیئر میں ڈال کر پہاڑی سلسلے پر اوپر ہی اوپر چڑھنے لگا۔ ایک جگہ رک جیپ روک کر وہ باہر نکل آیا۔

انجن اسٹارٹ تھا جب اس نے گیئر دبا دیا۔ جیپ کو جھٹکا لگا اور وہ لڑھکنیاں کھاتی سینکڑوں فٹ نیچے جا گری۔

"من نے اپنا خونیں چہرہ چٹانوں کی لوٹ سے باہر نکالنا شروع کر دیا تھا جب وہ پہاڑوں سے [illegible] میں بنے گھروں میں مل کے ایک دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ درمیانی [illegible] نے کھولا تھا۔ شیرو پر نظر پڑتے ہی وہ چونکا' پھر سنبھل گیا۔

"اندر آ جاؤ ——!" اس نے شیرو کو اشارہ کیا۔ وہ اس کا ساتھی جمال تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے دوبارہ کنڈی لگا کر دروازہ بند کر دیا۔ شیرو اس دوران ایک چارپائی پر دھیرے سے بیٹھ گیا تھا۔

جمال نے صرف ایک ہی نظر اس کی طرف دیکھا تھا اور آنکھیں جھکا لیں۔

"مجھے تمام حالات کا علم ہو گیا تھا شیرو۔" اس نے اپنی عادت کے مطابق دھیرے سے کہا تھا۔ "افسوس ہم بالآخر انہوں ہی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے۔ مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے شیرو۔ میں ہی جانتا ہوں یا پھر خدا کی ذات کہ جب اسی طرح ظالموں نے میرے بیٹے اور اس کی ماں کو مار ڈالا تھا' لیکن میرے دوست آزادی کے لیے ——"

"چپ ہو جاؤ جمال۔" شیرو نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔ "کس آزادی کی بات کرتے ہو جو کبھی ہمارے مقدر میں نہیں تھی جمال۔ جب اپنے اپنوں کو کھانے لگیں' جب گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے پر تلا ہو محض چند ٹکوں اور اقتدار کے لیے' جب ہم خود ہی اپنی غیرت کو بیچنے لگیں تو آزادی کیسی؟ یہاں کس کی حکومت ہے؟ کون حکمران ہے ہمارا؟ کس نے ہاتھ مضبوط کر رکھے ہیں برہمنوں کے؟ نہیں جمال نہیں۔ یہ سب فراڈ ہے —— سب لٹیرے ہیں۔"

"میں تمہارے لیے ناشتے کا بندوبست کروں۔" جمال کے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

قہوے کی پیالیاں دونوں کے آگے رکھی ہوئی تھیں' شیرو نے جمال کو اپنی ساری کہانی سنا دی تھی۔

"میں پاکستان جا رہا ہوں۔" اس نے سگریٹ کا کش لگا کر جمال کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مجھے علم ہے اب تم یہاں ایک پل رکنا گوارہ نہیں کرو گے۔" جمال بولا۔ "شیرو! کوئی طاقت مجھے بار بار اس بات کا یقین دلاتی تھی کہ تم زندہ ہو' میں کل ہی چلا جاتا لیکن میں شاید لاشعوری طور پر تمہاری ہی آمد کا منتظر تھا۔ میں نے آج سے دو سال پہلے نبی خان کو کہہ دیا تھا کہ یہ زمین اب غیرت مندوں پر تنگ ہونے لگی ہے' لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا نام بزدلوں یا بھاگ جانے والوں کی فہرست میں آئے۔ میرا اب یہاں ہے ہی کیا؟ بیٹا تھا۔ بیوی —— اب تو دونوں ہی نہ رہے ——" وہ ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو رہا۔

دونوں دوست کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دونوں نے شام ڈھلنے پر یہاں سے نکلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ منصوبے کے مطابق جمال کو بارہ مولا کے راستے سرحد عبور کرنا تھی اور

شیرو نے جموں کی طرف نکلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ آزاد کشمیر کے بجائے پنجاب کو اپنا مسکن بنانا چاہتا تھا۔ شام ڈھلے وہ دونوں اس گھر سے چھپتے چھپاتے باہر نکل آئے۔

"شیرو! تم سے بحث کرنا فضول ہے کیونکہ تم نے زندگی بھر کسی کو اپنے فیصلوں میں شریک نہیں کیا' لیکن بہتر ہوتا اگر ہم اکٹھے سفر کرتے۔" جمال نے ایک جگہ رکتے ہوئے کہا۔

"نہیں جمال!" شیرو نے کہا۔ "یہ امر خطرے کا باعث ہو گا۔ وہ لوگ سورہ تک جیپ کے تعاقب میں آئیں گے اور یہاں کی سیکورٹی بھی جلدی ہوشیار ہو جائے گی۔ تم ابھی ان بھیڑیوں کی نظر میں نہیں آئے جب کہ میری بات اور ہے۔ میں ان کو اپنے پیچھے لگا کر سری نگر تک واپس لے جاؤں گا۔ اس کے بعد میں فرار کے لیے شاید کوئی اور بارڈر منتخب کروں گا۔"

گاؤں کے باہر ایک پہاڑی کے دامن میں جہاں سے دو راستے متضاد سمتوں کو پھوٹتے تھے' وہ رک گئے۔

"جمال! میری بڑی خواہش تھی کہ یہ جنگ کسی کے ہاتھوں میں ختم کر کے یہاں سے رخصت سفر باندھتا۔ میں جانتا تھا کہ میری زندگی میں ممکن ہے' کشمیر آزاد نہ ہو لیکن اگلی نسل کو ہم آزاد زندگی اور محفوظ مستقبل دے کر جائیں گے....." شیرو اپنی بات مکمل نہ کر پایا۔ اس کا گلا رندھ گیا۔

"خدا حافظ میرے دوست! الوداع۔ میں خدا سے دعا گو ہوں کہ پاکستان میں تمہاری دوستی مجھے نصیب رہے۔" جمال کے لیے یہاں مزید ایک پل رکنا بھی ناممکن تھا۔

"فی امان اللہ!" شیرو کے ہونٹ کپکپائے اور وہ آگے بڑھ گیا۔

کافی دور جا کر اس نے پلٹ کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا دوست بارہ مولا کی طرف جا رہا تھا۔ "خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے!" اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی منزل کی طرف ہو لیا۔

☆○☆

سری نگر چھوڑنے سے پہلے شیرو نے آسیہ کے بھائیوں سے ملاقات کر لی تھی۔ وہ لوگ اس کے دکھ درد بانٹنے کی آرزو رکھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ شیرو بھارت کے کسی دوسرے صوبے میں رہائش اختیار کر لے۔ وہ اسے مکمل تحفظ کے ساتھ کاروبار کروانا چاہتے تھے' لیکن جب شیرو نے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو ایک لفظ بھی اس کی مخالفت میں

کہنے سے نہ چوکے۔ یہ ان لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ آسیہ کی چتا کی راکھ ہی
والے نہیں کر سکتے تھے ورنہ اب تک وہ زندہ درگور ہو چکے ہوتے۔

"شیرو بھائی" آسیہ کے بڑے بھائی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
"ہم تمہارے فیصلے پر اس لیے تو خوش ہیں کہ تم کم از کم ان درندوں سے محفوظ رہو گے لیکن جب تمہاری جدائی کا تصور کرتے ہیں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ آخر یہ
ایک تم ہی تو ہو۔ آسیہ اور عائشہ کو تو....." وہ سسک پڑا۔
شیرو نے اسے گلے سے لگا کر تسلی دی۔

"شیرو!" جلد یا بدیر بالآخر ہمیں بھی پاکستان جانا پڑے گا۔ خدا کرے ہم کو اکٹھے ہی
جائیں۔" اس نے دم رخصت شیرو سے کہا اور اس کے اصرار کے باوجود زبردستی ایک خطیر
رقم اس کے حوالے کر دی۔

"یہ آسیہ کا حصہ تھا۔ ہم پر حرام ہے۔" آسیہ کے بھائی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

سری نگر سے جموں تک کا سفر اس نے برہمن کے روپ میں کیا تھا اور راستے میں اپنے اکثر ساتھیوں سے ملتا آیا تھا۔ کسی نے اس کے فیصلے کو سراہا اور کسی نے خاموشی اختیار کرنی لیکن اس کے فیصلے پر تنقید کسی نے بھی نہ کی۔ وہ سب شیرو کے قسم سے بخوبی آگاہ تھے۔ اب بھی ان میں زیادہ تعداد انہی افراد کی تھی جنہوں نے اپنی زندگیاں مشن و ملت کے لیے وقف کر رکھی تھیں اور وہ جیتے جی کشمیر سے لاتعلق گوارہ نہیں کرتے تھے۔

شیرو نے کسی سے بحث نہ کی' کسی کو اپنے حق میں دلائل نہ دیئے۔ بس ایک دیرینہ رفیق کار کی حیثیت سے اس نے ان سب سے آخری مرتبہ ملنا مناسب سمجھا۔ اب جانے زندگی میں دوبارہ ان سربلندوں سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔

☆○☆

اسے سری نگر سے چلے ایک ماہ ہونے کو آیا تھا اور آج وہ جموں کے ایک ہوٹل میں بیٹھا اس بات پر مغز کھپا رہا تھا کہ سرحد کہاں سے عبور کی جائے۔ یہ ہوٹل جموں شہر کے لاری اڈے کے نزدیک ہی بنا ہوا تھا اور زیادہ تر اس راستے پر سفر کرنے والے مسافر ہی یہاں قیام کیا کرتے تھے۔

ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد وہ کھانے کا بل ادا کر کے باہر نکل رہا تھا کہ ایک چہرے پر نظریں پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے سے آنے والے نے بھی یہی عمل دہرایا تھا۔ شیرو سے بمشکل پانچ سات قدم آگے نکل کر وہ رک گیا۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی مڑ کر

گاؤں پہنچتے ہی وہ گہری نیند سو گیا اور سہ پہر کو اس کی آنکھ گاؤں کی مسجد سے بلند ہونے والی اذان کی آواز سے کھلی۔

دن ہفتوں' مہینوں اور سالوں میں بدلتے چلے گئے۔ وہ شیر محمد سدھن سے اب "شیرو ڈکیت" بن چکا تھا۔ دولت اس کے گھر کی باندی تھی۔ وہ ملک کے کونے کونے میں گھوما' لیکن کبھی اس نے جہلم کے پانیوں کی پرلی طرف نہ جھانکا۔ اس کے ساتھی حیران تھے کہ اس نے مقامی کمینوں والی کوئی بھی "بد عادت" نہیں اپنائی تھی۔

شوکت کئی مرتبہ بضد ہوا کہ وہ شادی کر لے' لیکن اس نے شادی نہ کی۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب شوکت سرحدی پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا اور اب وہ اکیلا اس ڈیرے کا مالک تھا۔ شوکے کی موت نے اسے ایک مرتبہ پھر دکھی کر دیا' لیکن اب تو جیسے اسے جینے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔

اس کے معمول میں صرف ایک تبدیلی آئی تھی۔ اب وہ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ہی خود سرحد عبور کرتا تھا۔ اس کا سارا کام اس کے کارندوں نے سنبھال رکھا تھا۔

کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ آزاد کشمیر جائے اور شرفو اور زہراں کو دیکھے' لیکن اس سوچ کے ساتھ ہی بے نام سے خوف کی پرچھائیاں اس کے ذہن پر لرزنے لگتیں۔ دو تین مرتبہ تو وہ منگلا تک جا کر واپس آیا تھا۔ اسے ایک ہی خدشہ وہاں جانے سے روکے ہوئے تھا۔ وہ سوچتا: "خدانخواستہ اس کی اچانک آمد کہیں دونوں کو پشیمانی میں مبتلا نہ کر دے؟" وہ نہیں چاہتا تھا کہ شرفو اور زہراں کی زندگیوں پر اس کی وجہ سے ایک لمحے کو بھی یاسیت طاری ہو۔

——اس دوران اسے دو تین واقف کاروں سے دونوں کی خیریت کی اطلاع ملتی رہی تھی۔ اس نے سن لیا تھا کہ شرفو پاکستانی فوج کا کیپٹن بن چکا ہے اور زہراں دو بیٹیوں کی ماں۔

☆○☆

ایف آئی یو کے کیپٹن اشرف خان کے سامنے شیرو کی تصویر رکھی تھی جس کے ساتھ مقامی صوبے دار کی رپورٹ موجود تھی کہ اس علاقے میں کام کا آدمی صرف شیرو ڈکیت ہے اور شرفو دیوانوں کی طرح ٹکٹکی لگائے تصویر کو گھور رہا تھا۔

"شیرو! تم زندہ تھے۔ تم نے کتنا ظلم کیا شیرو۔" آہستہ سے تصویر کو گھورتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

جب اس کا اردلی صاحب کے لیے چائے لے کر اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس

کے صاحب کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ حیران رہ گیا۔ کیپٹن صاحب [illegible]

لیکن دوبارہ وہ اپنے صاحب کے چہرے کو دیکھنے کی ہمت نہ کر [illegible]

آیا۔

اگلے روز شام تک اس کے پاس شیرو کی "تمام [illegible]

گئے تک وہ کروٹیں بدلنے کے بعد ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے [illegible]

کروا دی تھی کہ وہ شیرو کو ضرور کام کے لیے تیار کرے گا۔

"یہ ملک کے لیے بہت بڑی خدمت ہو گی کیپٹن۔" [illegible] صاحب نے [illegible]

ابھر کر روانگی کے وقت اسے کہا تھا۔

اور آج ۱۵ مئی ۱۹۶۵ء کو وہ یہی مشن لے کر اپنے دوست سے ملنے آیا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانی سنا رہے تھے اور [illegible] کیپٹن اشرف خان [illegible]

ختم ہونے پر حیران تھا کہ وہ شخص جس نے اسے اور اس جیسے کتنے اور نوجوانوں کو آزادی کی راہ دکھائی تھی۔

——جس کا خاندان پچھلی تین نسلوں سے کشمیر کے لیے اپنا خون بہا رہا تھا [illegible]

وہی شیر محمد سدھن اس کے سامنے شیرو ڈکیت بن کر بیٹھا ہوا ہے۔

اس کی کہانی میں کئی ایسے موڑ آئے تھے کہ شرفو کا دل بھر بھر آیا' لیکن اس نے بطور فوجی شیرو کے سامنے آنسو بہانا بزدلی سمجھا۔ وہ جان چکا تھا کہ ایسے حالات جن سے گزرتے وقت نے اس کے دوست کو ٹکرایا تھا کسی کو بھی پاگل کر دینے کے لیے کافی تھے—— اس کا دوست مجاہد سے ڈاکو یونہی نہیں بن گیا تھا۔ وہ تو اپنے اندر بہتے لاوے کو نہیں کی رلو دکھا رہا تھا جو آگ اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی' وہ اسی کو نہیں' سارے کشمیر کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی۔

"مجھے کہنا تو نہیں چاہیے شیرو بھائی۔" کیپٹن اشرف نے لمحہ بھر کی آہ بھری۔ "میں تو کبھی تم سے بحث نہیں کیا کرتا تھا۔ یوں بھی تم نے زندگی میں اپنی ہر بات مجھ سے منوائی ہے' لیکن شیرو بھائی میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تم نے ہمارے ساتھ بہت ظلم کیا—— بہت ظلم کیا تم نے ہمارے ساتھ۔ میں کیا جواب دوں گا زہراں کو—— کیا بتاؤں گا اسے؟"

"شرفو! حالات نے موم کی گڑیا کی طرح میری ہاں جس طرف چاہی گھما دی۔ میں تو ہمیشہ سے وقت کی ٹھوکروں میں رہا ہوں اور آج بھی گردش حالات نے مجھے [illegible] تمہارے سامنے پھینک دیا ہے۔ میں واقعی تمہارا گنہگار ہوں لیکن خدا میرا گواہ ہے کہ میں [illegible]

اللہ کا سپاہی

جس تپش کو محسوس کرتے ہوئے چار سو (صوبہ سرحد) کے اس سادہ لوح جوان جنرل طارق نے ساحل کشمیر پر قدم رکھا تھا۔

——اس حرارت کو برسراقتدار طبقہ سمجھنے سے یکسر قاصر تھا۔

وہ کوتاہ اندیش محض اقتدار کی جنگ لڑنا جانتے تھے—— اپنی کرسی کی حفاظت کے لیے تو وہ ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔

جب سینڈ ہرسٹ ملٹری اکیڈمی (انگلستان) کے اس گریجویٹ نے مڑ کر دیکھا تو وہ تنہا تھا—— بالکل اکیلا!

اور—— وقت اس کی تنہائیوں میں اضافہ ہی کرتا چلا گیا۔ اس کے ساتھی کٹتے گئے—— اور کسی نے اس کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش بھی نہ کی۔

کشمیر ہمیشہ ایک سلگتا ہوا سوال بن کر برصغیر کے ماتھے پر دھکتا رہا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد سے دونوں ملکوں کی حکومتیں یہی سمجھنے لگی تھیں کہ اب کشمیر کا مسئلہ شاید ختم ہو گیا ہے، لیکن وہ بھول رہے تھے کہ تاریخ اپنا عمل دہراتی ہے اور دبی چنگاریاں کبھی نہ کبھی بھڑک کر شعلوں کا رُوپ ضرور اختیار کرتی ہیں۔ قائداعظمؒ نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ کہا تھا۔ اس میں مبالغہ بھی نہیں کہ اگر یہ شہ رگ کٹ جاتی تو پاکستان کی شریانوں سے خون کا ایک ایک قطرہ نچڑ جاتا۔ کشمیر کی پہاڑیوں سے اترنے والے دریاؤں کے سوتے اگر پاکستان کے لیے خشک کر دیئے جاتے تو اس کی ہریالی کو موت آ جاتی۔

کشمیر پاکستان کے لیے ناگزیر تھا——!

اس حقیقت کو پاکستانیوں سے زیادہ کشمیری عوام نے محسوس کیا—— ان مظلوموں کو ہمیشہ یہی امید رہی کہ پاکستانی کبھی نہ کبھی ان کی مدد کو ضرور آئیں گے، لیکن وہ دن شاید ان کا پھر مقدر نہ بن سکا اور کشمیر میں حالت تنگ آمد بجنگ آمد پر پہنچ گئی۔

جلد ہی خبریں ملنے لگیں کہ کشمیر میں کفن بردوش مجاہدین زیر زمین روبہ عمل ہیں۔

☆○☆

محسوس کیا جانے لگا کہ وہاں "ڈرٹی زمین" پہلے سے

۱۹۹۴ کے آخری مہینوں میں یہ معروف عمل تحریکوں نے اب مکمل کر سامنے آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ خصوصاً "حزب
بل" کے جنگجوؤں نے ایسی خطرناک صورت اختیار کی کہ مقبوضہ کشمیر کے چپے چپے سے
آزادی کے نعرے گونجنے لگے اور انہی نعروں کی گونج میں پاکستان میں ایک منصوبہ
"آپریشن جبرالٹر" ترتیب دیا گیا۔

اس منصوبے کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی تھی کہ جیسے ہی پاکستانی کمانڈوز جنہیں
مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو کر گوریلا نوعیت کی کارروائیاں پہلے سے معروف عمل مجاہدین کے
ساتھ مل کر انجام دینی تھیں، کو چند کامیابیاں نصیب ہو گئیں تو عام کشمیری بھی اس "بغاوت" میں عملاً شامل ہو جائیں گے۔

——اور اس سلسلے میں اس وقت کے وزیر خارجہ کی یہ یقین دہانی موجود تھی کہ امریکہ
بہادر نے ضمانت دی ہے کہ اگر بین الاقوامی سرحدوں (سوائے حد متارکہ جنگ کشمیر) پر کوئی
ہنگامہ پاکستان نہ کرے تو بھارت کبھی پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔

——ابتدا ہی میں جب اس منصوبے کے لیے کارفرما نفری کا جائزہ لیا گیا تو دو نئے
ڈویژن کھڑے کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، لیکن ایک سازش کے تحت وزارت خزانہ نے
اس مد میں فنڈ فراہم کرنے سے معذرت کر دی۔

نامکمل اسباب کے باوجود بہرحال اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کیا گیا اور ان
تین مرحلوں میں آپریشن جبرالٹر ترتیب پایا۔

۱۔ Deep Penetration Force. اس "فورس" کو یہ فرض سونپا گیا کہ کمانڈوز
چوری چھپے "سویلین راہبروں" کی راہنمائی میں مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو جائیں۔ ہر ٹولی
اپنے تین تین چار چار "آرمز" اور ایمونیشن بھی لے کر جائے گی جو سری نگر پہنچ کر انہوں
نے میرواعظ کشمیر (جن کے دعوؤں پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ سارا منصوبہ ترتیب دیا گیا تھا۔)
اور ان کے پہلے سے معروف عمل ساتھیوں کو پہنچانا تھا۔

اس "فورس" میں موجود کمانڈوز کو سری نگر میں موجود حریت پسند کشمیری مجاہدین کے
ساتھ مل کر ان کے لیے "منصوبہ بندی کے مرکز" اور "راہنمائی کرنے والوں" کا کردار ادا
کرنا تھا۔

۲۔ دوسری "فورس" کو Medium Penetration Force. کا نام دیا گیا۔ اس

"فورس" کو "پہلی فورس" اور اپنے درمیان رابطے اور ہنگامی ضروریات کے لیے سامان کی
فراہم کرنا تھا۔ اس "فورس" نے بھی کشمیر کے اندر تک گھس کر کام کرنا اور دونوں
کرنا اور دونوں روپ عمل فورسز کے لیے ایک طرح سے "ہیڈ کوارٹر" کی حیثیت اختیار کرنا

۳۔ "تیسری فورس" نے بھی بھارتی لائن کے پیچھے عمل اندر داخل ہو کر اپنا مرکز قائم
کرنا تھی۔

☆○☆

جنوری ۱۹۹۵ء میں آپریشن پر عمل شروع ہوا اور دوسرے مرحلے کے لیے منتخب
یونٹ مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے "فورس نمبر ۲" کے جہاز لڑاکوں کی مدد
میں مقبوضہ کشمیر میں کافی اندر تک گھس چکے تھے۔ ان کے ساتھ "معمولی گڑبڑ" پیدا کر
ان میں سے کچھ ٹولیوں کا "بھاری جنگی سامان" نظروں میں آ گیا۔ یوں بھی اس سامان کا
پوشیدہ رہنا ناممکن تھا۔

اس سامان کی اطلاع "مقامی مخبروں" نے انڈین انٹیلی جنس کو کر دی اور ان کی توقعات
کے بالکل برعکس ابتداء ہی میں انہیں بھارتی فوج نے گھیرے میں لے لیا۔

آفرین ہے ان جیالوں پر کہ وہ کسی بھی مشکل کو خاطر میں نہ لائے اور لڑتے بھڑتے کسی
نہ کسی طرح اپنی منزل یعنی سری نگر پہنچ گئے جہاں کشمیر کی تحریک کا سب سے سنگین مذاق
ان کا مقدر بنا۔ جب انہوں نے میرواعظ کشمیر سے رابطہ پیدا کیا تو اس نے نہ صرف خود
اسلحہ وصول کرنے اور پہنچانے سے انکار کر دیا بلکہ انہیں کسی بھی قسم کا تحفظ بہم پہنچانے سے
بھی معذوری ظاہر کر دی۔

لیکن کچھ غیرت مند ابھی باقی تھے۔ انہوں نے بڑا جرات مندانہ قدم اٹھایا اور اپنی اور
اپنے خاندانوں کی زندگی داؤ پر لگا کر پاکستانی کمانڈوز کی امداد پر تل گئے۔ اس سلسلے میں سری
نگر کے "بٹ مالو ایریا" (Butmalo Area) کے مجاہدین کو تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے
گی۔

——انہوں نے ان کمانڈوز کو اپنے گھروں میں پناہ دی اور چھپا لیا۔

کچھ ایسی ہی صورت حال کا سامنا "دوسری فورس" کو بھی کرنا پڑا، لیکن وہ ہر طرح کا
خطرہ مول لے کر "مقررہ علاقوں" تک بالآخر پہنچ گئے اور یوں مقبوضہ کشمیر کے اندر پاکستانی
کمانڈوز اور بھارتی فوج میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔

بھارتی وزیراعظم نے اس مرحلے پر بیان بازی کا ایک سلسلہ شروع کر دیا اور بالآخر اسے

تو دھمکی بھی دینا پڑی کہ اگر پاکستانی کمانڈوز مقبوضہ کشمیر سے باہر نہ نکلے تو وہ اپنی مرضی کا محاذ کھول دے گا۔

——اس دھمکی کا واضح مطلب یہی تھا کہ ——— اب بھارت رن کچھ اور کشمیر کا بدلہ لینے کے لیے مغربی محاذ پر حملہ کرے گا۔

——اور اس کے ساتھ ہی اس کی فوج نے بڑی تیزی سے مغربی سرحدوں کا رخ کر لیا۔

☆○☆

مسئلہ پاکستانی کابینہ میں زیر بحث آیا تو ایک مرتبہ پھر وزیر خارجہ نے یقین دہانی کروائی کہ ——— اگر پاکستان مغربی سرحدوں پر بھارت کے لیے اشتعال پیدا نہ کرے تو امریکہ اس بات کی ضمانت دے رہا ہے کہ بھارت مغربی سرحدوں پر حملہ آور نہیں ہو گا اور امریکہ اسے کسی بھی صورت میں بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کرنے دے گا۔

اب اس مسئلے پر "سیاسی سیانے" سر جوڑ کر بیٹھے کہ بھارت کو کس طرح یقین دلایا جائے کہ پاکستانی فوج "مغربی سرحدوں" پر اشتعال انگیزی نہیں کرے گی۔

پھر یہ "سیانے" خود ہی ایک فیصلے پر بھی پہنچ گئے اور مسلح افواج نے رن کچھ اور مقبوضہ کشمیر کی صورت حال کے پیش نظر جو دفاعی اقدامات مغربی محاذ پر کیے ہوئے تھے انہیں ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حکم جاری ہوا کہ سرحدوں کے ساتھ ساتھ (خصوصاً" لاہور فرنٹ پر) بنائی گئی تمام Forward Posts کو پیچھے ہٹا لیا جائے اور "متوقع حملے" کے علاقے میں جو بارودی سرنگیں (مائنز) دشمن کی پیش قدمی روکنے کے لیے دبائی گئی ہیں' انہیں صاف کر دیا جائے۔

"———فارورڈ ایریا" کے کمانڈنگ آفیسر جو دشمن سے دو بدو جنگ کی آرزو نہ جانے کب سے اپنے سینوں میں پروان چڑھا رہے تھے اور جنہیں گردش حالات نے بہ مشکل دل کے ارمان نکالنے کا موقع بہم پہنچایا تھا' اس وقت سٹپٹا کر رہ گئے جب جنرل ہیڈکوارٹر سے انہیں اس قسم کے سگنل موصول ہونے لگے:

"خبردار! کوئی ایسی حرکت نہ ہو جسے "اشتعال انگیز" قرار دیا جا سکے۔"

"حیران ہوتے تھے کہ آخر اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر کوئی دفاعی منصوبہ ——— سے دوسرے ملک کی فوجوں کو اشتعال کیسے آ سکتا ہے؟ بہرکیف ہائی کمان کی ——— سے بھارتی فوج کے لیے لاہور اور سیالکوٹ پر چڑھ آنے کے لیے میدان خود بخود

ہموار ہو گیا۔"

☆○☆

اگست کے اوائل ہی میں فورس نمبر۲ نے جنرل اختر ملک کی کمان میں "کپرپشن" شروع کیا اور کشمیر پر پہلا بھرپور وار پھمب کے ہائی پوائنٹ سے ہوا۔

——پاکستانی فوج نے بھارت کی "بے اینڈ کے" ۸ راشنز کو دشمن فوج کو رگیدتے ہوئے پاکستانی حدود دیوا' پھمب' کھوڑا' کھوڑی اور ہاجرہ میں گھیر لیا اور مقصود Red Hill تک بغیر کسی قابل ذکر نقصان کے پہنچ گئے۔ یہ فورس دریائے توی کے کنارے کے ساتھ ساتھ پھیل گئی۔

۵ تا ۱۵ اگست کے درمیان یہ سارا علاقہ قبضے میں آ گیا۔ بھارت نے گورکھا بریگیڈ کے ساتھ جوابی حملہ کیا' لیکن منہ کی کھا کر اپنے زخم چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ پاکستانی فوج کی اچانک اور تیز یلغار نے بھارتی جوانوں کا مورال تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کا مورال بلند کرنے کے لیے ہی بھارت کے مایہ ناز مونٹین ڈویژن کو کشمیر کی سرحد پر ڈپلائے کر دیا گیا——— بھارتی سورما جانتے تھے کہ پاکستان کے پاس کوئی "مونٹین بریگیڈ" نہیں ہے۔

۲۵ اگست کی رات بھارتی توپ خانہ حرکت میں آیا اور اس نے درہ حاجی پیر' بھارت کلی (ٹیٹوال سیکٹر) پر صرف بارہ گھنٹوں میں ۲۰ ہزار گولے داغ دیئے۔ اس اثناء میں پاکستانی فوج "قلیل نفری" کا شکار ہونے لگی تھی اور مفتوحہ علاقوں پر کنٹرول برقرار رکھنے کے لیے مزید نفری میسر نہیں آتی تھی۔ ٹیٹوال سیکٹر میں بھی صرف تین سو جوانوں کی ایک کمپنی باقی بچی جس کے پاس اس شدید اور تباہ کن گولہ باری کا کوئی "عملی جواب" نہیں تھا۔

۲۶ اگست کو دشمن نے پورے بریگیڈ کے ساتھ انفنٹری کا ایڈوانس کر دیا۔ ہراول میں پیرا بٹالین تھی۔ دشمن اس رات بے پناہ جانی نقصان اٹھا کر قریباً" پچاس ساٹھ گز ایڈوانس کر گیا۔ ۲۷ اگست کی رات سکیم بدل کر دشمن نے رات ایک بجے حملہ کیا۔ اس مرتبہ دشمن کے بریگیڈ کو پورے ڈویژن کے توپ خانے کی مدد حاصل تھی۔

آٹھ دن تک دشمن آتش و آہن کی مسلسل اور موسلا دھار بارش کرنے کے بعد بالآخر درہ حاجی پیر اور بیڈوری کی چوکیوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لومڑ حالت یہ تھی کہ پاکستانی پلاٹون میں سے جس کی نفری ۲۵ تھی' ۲۲ جوان شہید ہو چکے تھے۔

۳۰ اگست کی رات پونچھ کے شمالی پہاڑیوں سے دشمن کا توپ خانہ آگ برسانے لگا۔ اس نے "چاند تیکری" کو اپنی زد میں لے رکھا تھا۔ اس کا پاپن پونچھ کے شمالی حصے سے

HBC

[illegible] کر [illegible] پر قبضہ کرنا تھا۔ لیکن، جس کا اس سے کی جو لیست اگلے روز جاری کرنی پڑی، اس
[illegible] کا شور کیا اس نے بھی نہیں کیا تھا
[illegible] کی خبر کی تھی جس پر پوری پاکستان ہوا میں کے قدموں تلے سے سرک رہی تھی۔ بھارتی
[illegible] کو پیلور نے دوسرے دن کی مسلسل کامیابیوں سے تنگ آ کر بھارت نے اقوام
متحدہ کشمیر میں پاکستانی "جارحیت" کا تذکرہ ہوتے ہی ——— پاکستانی ہائی کمان نے حملوں کا سلسلہ
[illegible] کا روک دیا اور یہ حکم جاری کیا کہ بھارتی ہوائوں کو ہر قیمت پر قبضہ مستحکم کریں اور لیڈ والس
روک دیں۔ اس کے فوراً بعد ہی ہم پر یہ واضح ہو گیا کہ متنازعہ علاقہ اسی طرح خاموشی سے خالی
کر دیا جائے جس طرح خاموشی سے اس پر قبضہ کیا گیا تھا۔ بادل نخواستہ اس عجیب و غریب
جنگ کی پسپائی میں ۲۸ اگست تک واپس اپنی سرحد پر پہنچ گئے۔

☆○☆

ابھی دو تین روز ہی گزرے تھے کہ ایک مرتبہ پھر ہماری گرمی میں ابال آیا اور یکم ستمبر کو
ہم پر واضح ہوا کہ پہلے سے خالی کیے گئے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا جائے۔ اس مرتبہ "مکمل
[illegible] کرنے کی" تازگی بھی میسر تھی۔

اس عجیب و غریب صورت حال نے جوانوں کو پریشان کر دیا۔ چوہے بلی کا جو کھیل ہائی
کمان کے ساتھ کھیل رہی تھی، اس نے فیلڈ ایریا میں موجود افسران کو چکرا کر رکھ دیا۔
انہوں نے دوبارہ حملہ کو گو کے عالم میں کیا، لیکن دشمن بھی اب لنگوٹ کس کر میدان
میں آ چکا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے اپنی مورچہ بندیاں نئے سرے سے بہت مضبوطی کے
ساتھ ترتیب دی تھیں۔

پہلے سے خالی کردہ علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کیا حکمت عملی کارفرما تھی؟

———اس کی سمجھ کسی کو نہیں آ رہی تھی۔

———اگر دشمن کو ٹھنڈا رکھنا مقصود تھا تو پسپا ہونے کی صورت میں اس نے طیش
کھا کر کب مغربی سرحدوں پر حملہ کر دیا تھا؟ اور پھر——— اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ
پاکستانی فوج کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد اب اس کی مغربی سرحدوں پر حملہ نہیں کرے گا؟

ان سوالات کا جواب نہ تب کسی کے پاس تھا نہ اب ہے۔ ہوشیار اور تازہ دم دشمن پر
حملہ آور ہونا بچوں کا کھیل نہیں ہوتا لیکن آفرین ہے ان جانبازوں پر کہ جو جان توڑ کر لڑے۔
دشمن کے چوکنا ہونے کے باوجود اس کی مورچہ بندیوں کے زخم کو اپنے قدموں تلے روندتے

[illegible] کی لائن پر آگے بڑھتے چلے گئے اور [illegible] کو [illegible]
[illegible] تک جا پہنچے۔

☆○☆

اس دوران ایک اور قیامت ان پر ٹوٹی جب "فلائی کلف" کے [illegible]
لیڈ والس کرتے ہوئے جوانوں کے لیے [illegible] کو [illegible]
[illegible] رہے کہ اس علاقے میں کیا ٹینک بھی استعمال ہوئے ہیں؟

———اور جھانکتا ہوا دشمن اس موقع سے [illegible]
بندیاں مضبوط کرنے لگا۔

ان حالات میں کہ حملہ ہو چکا ہے اور کمانڈر کسی ایک "نکتہ" کو ہاتھ سے نکلنے [illegible]
متنازع کر دیں (جبکہ ایک ایک انچ قیمتی ہو) ایسی کامیابیاں نصیب ہو بھی جائیں تو
نہیں تو اور کیا تھا؟

چوبیس گھنٹوں کے بعد ہائی کمان اس نتیجے پر پہنچی کہ ٹینک یہاں استعمال ہو سکتے ہیں،
حالانکہ مقامی کمانڈروں نے پہلے ہی روز اس بات کی تصدیق کر دی تھی۔

———چنانچہ ٹینک میدان کارزار میں لائے گئے، لیکن اب [illegible] کو حاصل کرنا [illegible]
ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ ۲۴ گھنٹوں میں جو نقصان ہم نے اٹھایا تھا اب [illegible]
رہا۔

اور یہ سب کچھ کون اور کیوں سرانجام دے رہا تھا———؟ شاید تاریخ کے اوراق کسی
اس راز کو اگل سکیں۔ فی الحال ہر کوئی خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ البتہ یہ بات ہم ضرور
بتانا چاہیں گے کہ اس پر ہی بس نہ کیا گیا بلکہ ہر سطح پر افواج کا مورال تباہ کرنے کی ایک اور
سازش بھی کی گئی، وہ یہ کہ——— آپریشن کمانڈر جنرل اختر حسین ملک سے کمان واپس لے
لی گئی اور جنرل یحییٰ اس کی بجائے نئے کمانڈر بن گئے۔

موصوف نے آتے ہی مزید ایک دن "ٹھنڈ کی حکمت عملی" کو بھینٹ چڑھا دیا اور
ان کے اس فیصلے نے میدان کارزار میں لڑتی افواج پر نہایت منفی اثرات مرتب کیے اور
حملے میں سست روی آ گئی۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود کچھ مقامی کمانڈروں کی انفرادی مہارت اور جوانوں کا جذبہ۔
حریت رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ وہ دشمن کو کاٹتے ہوئے ۵ ستمبر کو اکھنور کے بہت نزدیک تک
جا پہنچے اور پھر ۶ ستمبر کا دن اکھنور پر حملے کے لیے مقرر ہوا۔

پلان یہ تھا کہ اکھنور کی سڑک پر قبضہ کر کے دشمن کی سپلائی منقطع کر دی جائے اور اس کا رابطہ جموں کشمیر (مقبوضہ) سے بالکل کاٹ دیا جائے۔

لیکن یہ خواب ادھورا ہی رہا۔

بھارت کے لیے سوائے اس کے اب کوئی اور چارہ نہ رہا تھا کہ وہ مقبوضہ کشمیر پر پاکستانی فوج کی یلغار روکنے کے لیے مغربی محاذ پر حملہ آور ہو جائے ـــــ اور اس نے ایسا ہی کیا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی علی الصبح بھارت نے لاہور پر ۳ ڈویژن فوج سے سہ طرفی حملہ کر دیا۔ برکی پر بھارت کے نمبر ۱۷ انفنٹری ڈویژن نے اور بھیکی ونڈ باٹا پور پر نمبر ۵ انفنٹری ڈویژن نے حملہ کیا۔ اس سہ طرفی حملے کو کمک دینے کے لیے نمبر ۲۳ ماؤنٹین ڈویژن ان کے ساتھ تھا اور امرتسر کے باہر ایک اور تازہ دم ڈویژن ریزرو میں تیار کھڑا تھا۔

ان سب ڈویژنوں کے ساتھ ایک ایک اضافی ٹینک رجمنٹ اور عقب میں کور کا توپ خانہ تیار کھڑا تھا۔

۶ ستمبر ہی کی صبح بیدیاں بیذور کس کی طرف سے قصور کے راستے لاہور تک پہنچنے کے لیے بھارت کے نمبر ۴ ماؤنٹین ڈویژن' نمبر ۴۱ ماؤنٹین بریگیڈ اور نمبر ۲ انڈی پنڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ گروپ نے حملہ کر دیا۔

اس حملے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی دستوں کی پیش قدمی روک کر دفاعی پوزیشنیں اختیار کر لی گئیں اور وہاں سے فوراً" بریگیڈ نکال کر لاہور کی طرف روانہ کیے گئے جہاں بلوچ رجمنٹ کی چند کمپنیاں دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر اس کے حملے کا ڈٹ کا مقابلہ کر رہی تھیں۔

اس حملے کے بمشکل ۲۷ گھنٹے بعد ایئر ہائی کمان نے اپنے پلان کے مطابق ۸ ستمبر کی صبح سیالکوٹ سیکٹر میں زبردست حملہ کر دیا۔ اس حملے میں بھارت کے نمبر ۱ بکتر بند ٹینک ڈویژن (جس میں دو ٹینک رجمنٹیں' ۳۳ کیولری اور ۲ رائل لانسرز اضافی تھیں) نمبر ۲۶ انفنٹری ڈویژن اور نمبر ۶ ماؤنٹین ڈویژن نے ایک لڑاکا موٹرائزڈ بریگیڈ اور توپ خانے کی کم و بیش پانچ سو توپوں کی مدد سے جنرل ڈن کی کمانڈ میں حصہ لیا تھا۔

بلاشبہ یہ دنیائے حرب کی تاریخ کا بہت بڑا بکتر بند حملہ تھا۔ اس حملے نے کشمیر محاذ پر آگے بڑھنے کے امکانات بالکل ہی ختم کر کے رکھ دیئے تھے اور پاکستانی ہائی کمان نے اپنی ساری توجہ لاہور اور سیالکوٹ کو دشمن سے بچائے رکھنے پر مرکوز کر دی۔

جب دشمن نے للکارا

اور آخر ـــــ وہ ساعت بھی آ گئی جس کا ایک مدت سے خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا۔

ـــــ بھارت نے پاکستان کے خلاف اپنی مرضی کا محاذ کھول دیا۔ برصغیر میں کفر اور اسلام کی جنگ شروع ہو گئی ـــــ ایک طرف سے لات و ہبل کے بے پناہ نعرے فضاؤں میں گونجنے لگے دوسری طرف سے اللہ اکبر کے نعرے فضاؤں میں گونجنے لگے۔

ـــــ اور انہی نعروں کی گونج میں اللہ کے سپاہی اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر پیٹھ پر برس پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے۔ ان کی نظریں اس مقام پر آ کر ٹھہر گئی تھیں جہاں بدر کے میدان پر اللہ کے آخری رسول ﷺ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہیتے سے کرن کے تحفظ کی دعا مانگ رہے تھے۔

"اے خدا! اپنی امداد کے وعدے کو نہ بھولنا۔ اے خدا! اگر ـــــ یہ چھوٹا سا گروہ فنا ہو گیا تو تیری حقیقی عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔"

ـــــ سر سے پاؤں تک اسلحے میں لیس کفار کہ مسلمانوں کو اپنے ہتھ رفتار گھوڑوں تلے کچلنے پر تلے ہوئے تھے اور آج بھی وہی کفار اپنے ٹینکوں پر سوار ہو کر اسی سرکار مدینہ کے غلاموں کو نیست و نابود کرنے کے لیے پاکستان کی سرحدیں عبور کر رہے تھے۔

دراصل شمع اسلام کی وہ ننھی کرنیں جو قرون اولیٰ کے مسلمان اس برصغیر پر روشن کر گئے تھے ـــــ وہ ہمیشہ ان کی آنکھوں میں کھٹکتی رہتی تھیں۔

ـــــ اور آج وہ اسی روشنی کو معدوم کرنے کے لیے پاکستان کے در و دیوار کو مسمار کر دینا چاہتے تھے۔

کتنی مشابہت تھی اس وقت اور ـــــ اس دور میں! اس وقت بھی مسلمانوں کو اللہ پر بھروسہ تھا اور آج بھی ان کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

لاہور پر دشمن کے بے پناہ لشکر کو روکنے کی سعادت جنرل سرفراز خان کے حصہ میں آئی جن کے پاس صرف ایک ڈویژن فوج تھی۔ اس کا تناسب کچھ اس طرح بنتا تھا۔ ہر ایک

ایک جنرل کا مقابلہ بھارت کے تین جنرلوں سے تھا۔ دشمن کے تو بریگیڈیئر ہمارے تین اور اس کی قریباً چار سو توپوں کے مقابلے میں صرف سو توپیں تھیں۔

جنگ کے دو ہی روز بعد دشمن نے اپنا بیرانوے بریگیڈ نمبر ۵۰ بھی وا ہگہ کے میدان میں اتار دیا۔ اب اس کی نفری ۳۵ ہزار تک پہنچ گئی تھی جس کا مقابلہ ہمارے پانچ ہزار سرفروشوں نے کرنا تھا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو لاہور بارڈر کے ایریا کمانڈر نے "آرڈر آف دی ڈے" جاری کیا۔

"پاکستانی فوج کے جوانو! آخری سپاہی ـــــ آخری گولی تک لڑو' سنگینوں سے' خالی ہاتھوں سے' ناخنوں سے لڑو اور دشمن کو نیست و نابود کر ڈالو۔ اپنے وطن کی زمین کا ایک انچ بھی دشمن کے ناپاک قدموں تلے نہ جانے دینا۔"

اس حکم نے جوانوں کے خون میں انگارے دوڑا دیئے۔ وہ جنونی کیفیت میں دشمن پر ٹوٹ پڑے اور واقعی تاریخ حریت کا وہ باب اپنے خون سے لکھ گئے جس کی سرخی اور عظمت ہمیشہ بڑھتی رہے گی۔

جنرل چوہدری نے اپنی نفری اور اسلحے کے زعم میں کہہ دیا تھا کہ وہ ۶ ستمبر کی صبح ۹ بجے لاہور جم خانہ میں شراب کی پارٹی اڑائے گا' لیکن وہ بھول گیا تھا کہ اس کا مقابلہ کس قوم سے ہے۔

بھارتی ٹڈی دل کا پہلا ٹکراؤ سرحدی محافظوں سے ہوا جو اپنی تھری ناٹ تھری گنوں کے ساتھ دشمن کے آرمرڈ ڈویژنوں کے سامنے ڈٹ گئے اور اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہلے جب تک کہ آہن پوش لشکری ان کے جسموں کو روندتے ہوئے نہ گزر گئے۔

اس دوران جنرل نے کچھ کمپنیاں نہر کے پار پہنچا دی تھیں جو سیسہ پلائی دیوار کی طرح غنیم کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔ ان خدا کے پراسرار بندوں نے دشمن کو پہلے ہی باقاعدہ نہر کے میں احساس دلا دیا کہ وہ ناقابل تسخیر ہیں۔ ایک ایک کر کے وہ کٹتے گئے۔ اپنے خون سے عظمت کردار کی گواہی دیتے ہوئے یہ شیر دل صف شکن جیالے دشمن کے حملے کا زور توڑ کر ڈوگرائی تک آ گئے۔

جنرل جانتا تھا کہ یہ لوگ مر جائیں گے لیکن اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے۔ اس نے تختی سے جوانوں کو ڈوگرائی تک پسپائی اختیار کروائی۔ اس کے ساتھ ہی پاکستانی توپ خانہ حرکت میں آ گیا۔ کرنل امداد علی کا نعرۂ مستانہ گونجا اور توپچیوں کے "اللہ اکبر" کے فلک شگاف نعروں نے فضاؤں کا کلیجہ چھلنی کر دیا ـــــ ان کا سارا غضب ان کے گولوں میں سمٹ

آیا اور اینڈوالس کرتے دشمن کے پیادہ دستے گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ سورج نکلتے ہی فضائیہ کی امداد آ گئی۔ شاہینوں کی پہلی تکبیر "اللہ اکبر" فضا میں بلند ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کو طلسم ہوش ربا کی طرح خراب ہو کر لگ کر پہنچا دی گئی تھیں۔

"اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! مومنین کو جہاد کی ترغیب دو۔ اگر تم میں سے بیس ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور تم میں سے سو آدمی ہوں گے تو ایک ہزار کفار پر غالب آئیں گے۔ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دین کو) نہیں سمجھتے۔

اب اللہ نے تم پر تخفیف کر دی اور معلوم کر لیا کہ تم میں ہمت کی کمی ہے۔ سو اگر تم میں سے سو آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔"
(انفال ۶۵/۶۶)

لاہور کی فضاؤں میں پہنچتے ہی اس فارمیشن نے اپنے لیڈر کی کمان میں "سرخ بیرئر" کراس کیا اور لاہور کی مقدس فضاؤں کو سلامتی کا مژدہ سناتے آگے نکل گئے۔

غیظ و غضب کے عالم میں فضائیہ کے یہ شاہین آہن پوش لشکریوں سے گھرا ہوا دیکھ کر زمین سے بمشکل سو ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر رہ کر دیوانگی کی سی کیفیت میں دشمن پر اپنا گنوں سے آگ اگل رہے تھے۔

ڈوگرائی سے اٹاری اور راوی سائفن سے ہڈیارہ تک انہوں نے نبی بھر کے شکار کیا اور دشمن کو سمجھا دیا کہ لاہور اس کا مرگھٹ تو بن سکتا ہے ـــــ مسکن نہیں۔ سرحدی شہروں کے وہ لٹیرے جو بسیں بھر بھر کر لاہور کی طرف اڑے چلے آ رہے تھے کہ یہاں قتل عام اور لوٹ مار کی تاریخ دہرائیں گے' اب ان کی لاشوں کے گرد گدھ منڈلانے لگے تھے۔

پاکستان کی آرٹلری' انفنٹری اور فضائیہ نے دشمن کو احساس دلا دیا تھا کہ اسے لاہور تک پہنچنے کے لیے یہ تین ڈویژن کتے کی موت مروانے پڑیں گے۔

باٹا پور کا پل دشمن کے لیے پل صراط بن گیا تھا ـــــ!

۷ ستمبر کی صبح اس پل کو اڑا کر پاکستانی جیالوں نے بھارتی ہرلوں کی بدبختی پر آخری مہر ثبت کر دی اور ۶ ستمبر کی صبح نو بجے لاہور جم خانہ میں جشن فتح منانے والوں کے لیے ۷ ستمبر کی صبح اپنی لاشیں سمیٹنا ایک مسئلہ بن چکا تھا۔ دشمن کے بڑے حملے کا زور ٹوٹ چکا تھا اور وہ

محض کمسانی بلی کمبانوپنے کے صدقے نئی نفری روانے کے لیے میدان میں اتار رہا تھا۔

☆○☆

میں ان لمحات میں جنرل سرفراز نے تاریخ حرب کا انتہائی خطرناک فیصلہ کیا اور بریگیڈیئر قیوم شیر کی کمان میں Stick Force (ریزرو فوج) کو دشمن پر جوابی حملے کا حکم دے دیا۔ یہ بڑا سنگین فیصلہ تھا کیونکہ محفوظ فوج کی نفری خطرناک حد تک کم تھی۔

۸ ستمبر کی صبح حملہ آور فوج کے جیالے سرپار کر گئے۔ انجینئرز نے بنگاہی پل بنا کر کچھ ٹینک بھی پار اتار دیئے تھے۔ بریگیڈیئر قیوم شیر نے بھینی کی طرف سے واہگہ پر اور بریگیڈیئر آفتاب نے شمال سے ملوطی، رانی اور شمشیر پوسٹوں پر سرفروشانہ یلغار کی۔

یہ یلغار اتنی تیز اور زوردار تھی کہ دشمن کے پندرھویں ڈویژن کا کمانڈر جنرل نرنجن پرشاد اپنے ہیڈکوارٹر کی چار جیپیں جن میں اس کی ذاتی جیپ بھی شامل تھی مع جنگی دستاویزات ۔ میسن کے قریب چھوڑ کر بھاگ گیا اور ہماری محفوظ فوج نے بی آر بی کے پار مورچے قائم کر لیے۔ ڈوگرائی پر قبضہ کر کے ڈیڑھ میل آگے اپنا مورچہ بنا لیا۔ فائر بندی تک دشمن نے اس مورچے پر چھبیس حملے کیے اور اپنی کئی پلٹنیں اور ٹینک اس ناقابل تسخیر مورچے کی فتح کے لیے واصل جہنم کروا لیے، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ہڈیارہ میں بھارتی سورے کھونڈی اور ہڈیارہ کے دیہاتوں کا قتل عام کر کے اپنی بدبختی کا رونا رو رہے تھے۔ جب بریگیڈیئر اصغر نے دو بٹالین فوج کے ساتھ دشمن کے پورے ڈویژن کو للکارا۔

میجر شفقت بلوچ نے ہڈیارہ نالے پر دشمن کو روک لیا اور کرنل نواز کا توپخانہ دشمن پر آگ برسانے لگا۔ ہمارے او-پی نے دشمن کے عین درمیان گھس کر ایمونیشن سے بھرے ٹرکوں کو نشانہ بنوا دیا۔ یہ ٹرک ہڈیارہ نالے کے پل پر سے گزر رہے تھے جب ان پر قیامت ٹوٹی جس سے پل بند ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی بچ جانے والے پلوں کی حفاظت کے لیے فرنٹیئر فورس کی آر آر جیپیں اور مشین گنیں پوزیشن میں چلی گئیں ـــــ اور میجر شفقت بلوچ کو سرپار کر آنے کا حکم مل گیا۔ دشمن کے سامنے ہڈیارہ سے برکی تک کا سارا علاقہ پڑا تھا، لیکن جہاں کہیں اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی، مستعد اور بیدار او-پی پوسٹوں نے اسے توپ خانے کی مدد سے پسپا کر دیا۔

۱۰ ستمبر کو برکی پر دشمن کا حملہ اب تک کے بھرپور حملوں میں سے ایک تھا۔ دشمن کے

ٹینک اور انفنٹری برکی کے اندر گھس آئی۔ [illegible] نے ایک چوبارے پر آبزرویشن پوسٹ قائم کر کے [illegible] ٹینک رجمنٹ کا کمانڈنگ افسر بھی مارا گیا اور برکی کی گلیاں اس کے [illegible] اٹ گئیں۔ بے شمار جلتے ہوئے ٹینکوں اور ٹرکوں سے [illegible] ہیں جنگ ستمبر کا پہلا نشان حیدر میجر عزیز بھٹی کا مقدر بنا۔

یہ پاکستانی فوج کے صف شکنوں کا جنون تھا کہ وہ [illegible] انہیں ہرا نہ سکی۔ وہ رات اپنے دامن میں انسانی عظمت و کردار اور جان نثاری کی بیشمار داستانیں لیے وقت کی گرد میں کھو گئی۔

اس معرکے کے بعد دشمن نے لاشعوری طور پر اپنی ذہنی شکست کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ بزدلوں کی طرح مورچوں میں بیٹھ کر گولہ باری [illegible] ایڈوانس کی جرات نہ کر سکا۔

اپریشن نیپال

بھارتی سورما اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ ۷۲ گھنٹے کے اندر پاکستانی فوج کو مکمل مفلوج کر کے رکھ دیں گے۔ اس لیے سیالکوٹ پر حملہ اڑتالیس گھنٹے بعد کیا گیا۔ جو آپریشن آرڈر انہیں جاری ہوئے تھے ان کی رو سے حملہ آور فوج کو سیالکوٹ کا دفاع کچل کر گوجرانوالہ اور وزیر آباد کے درمیان جی ٹی روڈ کو کاٹ کر چناب تک کے علاقے پر قابض ہونا تھا۔

جنرل چوہدری اسی خوش فہمی کا شکار تھا کہ اول تو دو دن میں لاہور فرنٹ پر وہ پاکستانی فوج کی مدافعت مکمل ختم کر چکا ہو گا۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو سیالکوٹ کا حملہ آور ڈویژن ایک انفنٹری اور مونٹین ڈویژن کی مدد سے لاہور کے دفاع پر عقب سے حملہ آور ہو گا۔

بھارتی کمانڈر انچیف جنگی نقطہ نگاہ سے ایسی سوچ میں حق بجانب تھا۔ دنیا کا کوئی جنگی مبصر بھی اس کی جگہ یہی رائے قائم کرتا' لیکن وہ یہ بھول رہا تھا کہ اس کا مقابلہ گوشت پوست کے انسانوں سے نہیں' آہنی ارادوں کے مالک ان صف شکنوں سے ہے جو سرحدوں پر زندہ رہنے کی تمنا لے کر نہیں آئے تھے---- ورنہ اتنا زبردست حملہ اتنی قلیل تعداد اور نامکمل اسلحے کے ساتھ روک لینا کسی انسانی گروہ کے بس کی بات نہیں تھی۔

جنرل چوہدری نے سیالکوٹ پر تاخیر سے حملہ اس لیے کیا تھا کہ اپنی دانست میں وہ اس دوران پاکستانی ٹینک سکواڈرنوں کو لاہور' بیدیاں اور قصور کے دفاع پر بکھیر چکا ہو گا اور اس کے "آہنی ہاتھیوں" کے مقابلے میں پاکستان کی ایک آدھ ٹینک رجمنٹ کیا کرے گی؟ اس نے دوسری چال سے پہلے [illegible] کے میدان کو پھیلاتا چلا گیا اور سیالکوٹ کے شمال سے جسڑ تک لڑائی کو پھیلا دیا۔ [illegible] میدانی علاقہ یوں بھی ٹینکوں کی جنگ کے لیے بڑا موزوں تھا۔ سیالکوٹ کے محاذ [illegible] حصے میں خنجر گھونپنے کی سعادت جنرل ابرار حسین کے حصے میں آئی جن کی مدد [illegible] بریگیڈیئر عبدالعلی' بریگیڈیئر نیازی' بریگیڈیئر مظفر الدین اور نامکمل بریگیڈیئروں کے ساتھ انٹیلی جنس کی اطلاعات پر دشمن کے استقبال کو موجود تھے۔

۷ ستمبر کو اطلاع ملی کہ دشمن سلیمانکی کے علاقے میں اپنا بکتر بند ڈویژن جمع کر رہا ہے۔ بریگیڈیئر عبدالعلی نے "ٹرکی پزول" رات کو اس طرف روانہ کر دی جس نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر دشمن مورچوں سے گزرنے کے بعد واپس آکر اس بات کی تصدیق کر دی کہ انٹیلی جنس کی اطلاعات صحیح ہیں۔

فوراً پاک فضائیہ حرکت میں آئی اور دشمن کے سلیمانکی میں جمع ہونے والے بکتر بند ڈویژن کو وہیں دانوں کی طرح بھون کر رکھ دیا۔ یہ حملہ اتنا جارحانہ اور تیز تھا کہ دشمن بھونچکا رہ گیا اور شاہین اپنا کام کر کے واپس چلے آئے۔

اس دوران دشمن ظفروال کے علاقے میں "حملے کا دھوکہ" دیتا رہا' لیکن جنرل نیازی اس کی چال میں آنے کو تیار نہ ہوئے۔

دشمن کو اس کی اصلیت کا احساس دلانے کے لیے بریگیڈیئر مظفرالدین کے سربلند اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور اس کی قلعہ بندیاں روندتے ہوئے جسڑ پر حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے جسڑ کا پل اڑا کر چوہدری کے سورماؤں کی "دھوکے کی چال" کو بھارتی علاقے میں ہی دفن کر دیا۔

اس بکتر بند ڈویژن کو اپنے ارادوں سمیت وہیں موت کی نیند سلا کر بریگیڈیئر مظفر نے سیالکوٹ اور لاہور سیکٹر کو "دھوکے" کی زد سے محفوظ کر لیا۔ اس دوران چمب کی قلعہ بندیاں زمین بوس کرنے والے توپ خانے کا بڑا حصہ بریگیڈیئر امجد علی چوہدری کی کمان میں سیالکوٹ کی حفاظت کے لیے واپس آگیا۔

چھ سو ٹینکوں کے ساتھ جنرل راجندر سنگھ کو سیالکوٹ پر بھیجا گیا جس نے صحرائے العالمین (دوسری جنگ عظیم) میں جنرل رومیل کی جنگی چالوں کا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور خود کو ٹینکوں کی لڑائی کا چیمپئن سمجھتا تھا۔

یہ زعم جنرل بھول رہا تھا کہ اس کا مقابلہ جنرل ابرار حسین سے ہے جس کا ہیرو سعد بن ابی وقاص ایسا جرنیل تھا جس نے قادسیہ کے میدان میں ایسے ہی "اصحاب فیل کے لشکر" روندتے ہوئے تاریخ حریت کا وہ باب لکھا تھا جو آج حربی تاریخ میں سنہرا باب ہے۔

دشمن کا پہلا ٹکراؤ بریگیڈیئر عبدالعلی سے ہوا جنہیں انٹیلی جنس رپورٹ ملی تھی کہ دشمن سرحد کے پار چڑھ آیا ہے۔ بریگیڈیئر پچھلے تیس گھنٹوں سے مسلسل بیداری کی حالت میں تھے اور پچھلی ہی رات زبردست لڑائی سے ان کے اعصاب کھنچے ہوئے تھے۔ بریگیڈیئر عبدالعلی نے وائرلیس پر اپنے ٹینک کمانڈر کو چائے کی پیالی کا لمبا گھونٹ حلق میں انڈیلتے

ہوئے حکم دیا۔

"دشمن کا حملہ پسپا ہوا اسی طرف سے آرہا ہے۔ ہمیں ہر حالت میں اسے آگے بڑھنے سے روکنا ہے۔ دشمن کو برباد کر دو۔"

اس دوران بریگیڈیئر اور فرنٹیئر فورس کے جوان دشمن سے ٹکرانے کے لیے بے چین ہو رہے تھے' لیکن آہنی فولادوں کی مدد سے دشمن اس دیوار میں شگاف ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عبدالعلی نے انٹیلی جنس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ دشمن کی قوت کتنی ہے' انہوں نے دوسرا حکم کر دیا کہ وہ اپنی ٹینک رجمنٹ کے ساتھ پیچھے ہٹ کر زندہ تو مرحوم ہو لیں۔

یہ خودکشی کی حد تک دلیرانہ حکم تھا' لیکن سوا اس کے کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

۸ ستمبر کی صبح طلوع ہونے تک دشمن کے سیاہ ہاتھ مغرب سے ظلمت شب زمین پر حشرات الارض کی طرح پھیل چکے تھے۔ اس ندی بلی کا صفایا کرنے کے لیے بریگیڈیئر عبدالعلی نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور دنیائے حرب کا دلیرانہ حکم جاری کیا۔ توپخانے کے ساتھ انفنٹری کو بھی حکم جاری ہو گیا۔

"آگے بڑھو اور دشمن کو نیست و نابود کر دو۔"

۲۵ کیولری کے تین سکواڈرن بھارتی آرمرڈ ڈویژن کا سر کچلنے کے لیے اپنی کمین گاہوں سے نکلے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۴ بلوچ رجمنٹ کرنل شنواری کی کمان میں کفن بردوش میدان کارزار کی طرف روانہ ہو گئی۔

میجر محمد احمد کے سکواڈرن کو پھلوار کے قریب دشمن کے مست ہاتھیوں کی آنکھیں پھوڑنے کا حکم ملا اور جوش غضب میں وہ جنگی ترتیب کو بالائے طاق رکھ کر دشمن کے عین سامنے اس سے ٹکرا گیا۔ اس کے جان نثاروں نے اپنے سردار کے جذبہ شجاعت کی لاج رکھی اور دشمن کے سامنے آہن' لوہے اور خون کی دیوار تان کر کھڑے ہو گئے۔

اس کے ساتھ ہی شاہبازوں کی دھاڑیں گونجیں اور نیلے طیاروں کی پہلوؤں سے بھاگتی گنوں سے دشمن کے ٹینکوں پر راکٹ پھٹنے لگے۔

چونڈہ کے میدان کے سینے پر سرفروشوں کے خون سے دنیائے حرب و ضرب کی اہنت داستان رقم ہونے لگی۔ میجر احمد کا ٹینک ہٹ ہوا۔ وہ دوسرے میں پہنچ گئے —— پھر تیسرے میں!

ان کا جسم زخموں سے چور چور اور وردی خون میں رنگین ہو رہی تھی' لیکن بیچتے ہی سکواڈرن کمانڈر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ میجر احمد کو بیہوشی کی حالت میں زبردستی پیچھے لے جایا گیا اور کیپٹن فرخ خان نے ان کی جگہ سنبھالی۔

میجر آفندی کے نیک ذکری اور تمزہ سے دشمن پر نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے یلغار کر رہے تھے۔ انہوں نے دشمن کی عطا پوٹا ہارس کو وہ سبق سکھلایا کہ انہیں اپنی ٹریننگ بدلنے پر مجبور کر دیا اور اس جنگ کے بعد سے دشمن نے اپنے ٹینک رسالوں کے تربیتی نظام کا از سر نو جائزہ لے کر اس کی اصلاح کی تھی۔

تیسرا سکواڈرن میجر رضا خان کی کمان میں نعرۂ تکبیر بلند کرتا دونوں پہلوؤں سے معروف جنگ سکواڈرن کی مدد کو پہنچ گیا۔

اس کے ساتھ ہی مورچہ بند ۲ پنجاب رجمنٹ کے میجر محمد حسین نے جن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا' اپنے گوشت پوست کے جوانوں کو حکم دیا کہ وہ دشمن کی آہنی دیواروں میں راستہ بناتے ہوئے نکلیں اور اس کو بتا دیں کہ ہم بدر کے سپاہی ہیں اور تیرہ سو سال پرانی تاریخ دہراتے ہیں۔

اس حکم کو پاگل پن کی انتہا کہا گیا' لیکن خدائے وحدہ لاشریک کی قسم! اگر چونڈہ کے میدان میں ایسے پاگل موجود نہ ہوتے تو دشمن کے بھیڑیے معصوم پاکستانیوں کی رگوں سے خون نچوڑ لیتے۔

سیکنڈ پنجاب رجمنٹ کے جیالے جیپوں میں آر آر گنیں لگا کر دشمن کے ٹینکوں کے سامنے ڈٹ گئے۔ راکٹ لانچر کندھوں پر اٹھائے سربلند غازی میدان کارزار میں دشمن کے سامنے لیٹ گئے اور اسے للکارا کہ آؤ ہمارے جسموں کو روند کر آگے بڑھو۔

یہیں سے اس روایت نے جنم لیا کہ پاکستانی جوان ٹینکوں کے سامنے جسم سے بم باندھ کر لیٹ گئے تھے۔

اس منظر نے دشمن پر دہشت طاری کر دی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کا مقابلہ انسانوں سے نہیں' یہ تو کسی اور ہی عالم کی کوئی مخلوق ہیں۔ ملک و ملت کے لیے قربانی کا یہ عظیم الشان مظاہرہ انسانی فہم و ادراک سے بالاتر تھا۔

نیم کے لشکر میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے آہنی قلعے زمین بوس ہونے لگے۔ گوشت پوست کے انسان ہاتھوں میں گرنیڈ پکڑے' دشمن کے انتہائی نزدیک پہنچ کر اس کے ٹینکوں پر چڑھنے اور خود بھی واصل حق ہو جاتے۔

میجر حسین نے اس پر جس [illegible]
مشاورت کی اور یہ کیپٹن [illegible]
ایڈوانس کر رہی تھی اور میجر رضا کے ٹینک [illegible]
تھے۔

یہ معرکہ ہر گز لفظی نہیں تھا۔ اس لیے ان [illegible]
دشمن اضافہ مال تیار کرنے کے بعد اپنے [illegible]
وہ بھول رہا تھا کہ اس کا مقابلہ [illegible]
ایڈوانس کرتے تمزہ بلوچ کے نوجوان نے کہہ [illegible]
آج بے غیرت نہ ہو جانا۔"

ایک اور مورچے سے کوئی خدا کا شیر گرجا۔

"مسلمانو! جس نے آج پیٹھ دکھائی اس پر خدا کا غضب ہو گا۔ خدا کرے اپنے باپ کا بیٹا نہیں۔"

اس للکار نے سربلندوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ وہ بے ہمہ بیابانے کہاں تھے؟ کہاں سے آئے تھے جنہوں نے بدر و حنین کے مجاہدوں کا لہو لوٹا رکھا تھا۔ ہم نہیں جانتے ——— لیکن وہ ہماری تاریخ کا مان ہے۔ ایک شاعر نے ان کی سرفروشی کو نذر عقیدت کی۔

چونڈہ کے چپے چپے پر بکھرے خون کی ایک ایک بوند اپنے دامن میں ہزاروں شجاعت و حریت کی کہانیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ سیالکوٹ کے میدانوں کی بوٹی بوٹی کو ان خدا کے پراسرار بندوں نے اپنے خون سے سیرابی بخشی تھی۔

نعرۂ تکبیر بلند کرتے یہ دیوانے معرکے میں اپنے خون سے طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک وہ کہانی لکھ گئے جو تاریخ کے سینے پر ہمیشہ جگمگ جگمگ کرتی رہے گی۔ انہوں نے ابتدا ہی میں دشمن کی کمر توڑ دی اور دنیا بھر کے ماہرین حرب و ضرب نے اپنی زبان دانتوں تلے دبا لی کیونکہ وہ اس "معجزے" پر یقین نہیں کر سکتے تھے۔

جنگ کے آخری لمحات تک غازیان صف شکن شجاعت و ہمت کی ایسی داستانیں رقم کرتے رہے اور انہوں نے "آپریشن نیپال" کو دہلی کے ہی۔ ایچ۔ کیو کی فائلوں کی میں موت کی نیند سلا دیا۔

☆○☆

"سرحد کے محاذوں پر بھی دشمن کا یہی حشر ہوا۔

میم کرن، راجستان کا ہزاروں مربع میل علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور جس ان لمحے میں جب یہ جیالے دشمن کی کمر توڑنے کے بعد اس پر کاری ضرب لگانے کے لیے آگے بڑھنے والے تھے، پاکستانی سٹرائیک فورسز تیار کھڑی تھیں، سیاسی بازی گر میدان میں اتر آئے۔

ان سیاسی بندروں نے میدان کارزار میں جیتا ہوا معرکہ تاشقند کی میز پر ہار دیا اور وہ قربتیں اپنا مول چکانے سے محروم رہیں جو شہیدوں نے اپنی ملت، مذہب اور ملک کے لیے دی تھیں۔

آخری حصار

سری نگر کے چپے چپے سے شیرو کی پرانی آشنائی تھی۔

——یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ زندگی میں دوبارہ اس نگر کو کبھی کشمیر کی جنگ آزادی میں حصہ بھی لے گا کیونکہ اس نے اپنی دانست میں اپنے ہمدرد سوئے شیرو کو مار ڈالا تھا، لیکن آج جس طرح انگڑائی لے کر وہ دوبارہ بیدار ہوا—— یہ اس کے گمان میں نہیں آ سکتا تھا۔

کیپٹن اشرف خان اور اس کے پانچ ساتھیوں کی راہنمائی کے فرائض اسے سونپے گئے تھے۔

ان لوگوں نے بارہ مولا کے راستے سرحد عبور کی تھی اور سری نگر تک وہ بخیر کوئی خاطر کیے پہنچ چکے تھے۔ کیپٹن اشرف خان کو جس ٹھکانے پر پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی، وہ ٹھکانہ ان لوگوں کی آمد سے پہلے ہی دشمن کے ہتھے چڑھ چکا تھا اور اب اسے تہہ و تقدامات اپنی فراست کے ساتھ انجام دینے تھے۔ وہ لوگ یہاں سبوتاژ کارروائیوں کے لیے آئے تھے۔ سری نگر کا محلہ "بٹ ماڈ" ان کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔

یہاں آ کر شیرو کے زخم پھر ہرے ہو گئے تھے۔ اسے علم ہوا تھا کہ نبی خان اور اس کے بہت سے پیارے اس معرکے میں جام شہادت نوش کر گئے تھے۔ آسیہ کے بھائی سری نگر چھوڑ کر مہاراشٹر کی طرف نکل گئے تھے۔

وہ ان مقامات پر دیوانہ وار گھومتا رہا جو کبھی اس کی آماجگاہ رہے تھے۔ اس کی بے تاب نگاہوں نے اس زمین کے چپے چپے کو بوسہ دیا جہاں اس کی معصوم بچی اور بے گناہ بیوی کا خون بہایا گیا تھا۔

یہاں کی ہواؤں سے اسے اپنی بچی اور بیوی کے خون کی مہک آ رہی تھی، لیکن آج وہ مجبور اور بے کس نہ تھا۔ اس نے سوچا: "آج وہ اکیلا نہیں۔ وہ آج پاکستانی فوج کے ایک سپاہی کی حیثیت سے یہاں آیا ہے۔ اب وہ گن گن کر اپنے پیاروں کی موت کا بدلہ لے

گئے۔۔۔۔ اس نے سوچا: "آسیہ، عاکفہ اور اس کی ماں اور دوسرے شہید ساتھیوں کی روحیں کتنی خوش ہوں گی آج۔"

ہر روز شیرو کی رہنمائی میں پاکستانی کمانڈوز کی ٹولیاں رات ڈھلتے ہی اپنے مشن پر نکلتیں اور صبح ہونے سے پہلے کوئی نہ کوئی کارنامہ انجام دے کر واپس آ جاتیں۔ یہ کام وہ اکیلے ہی نہیں، وہاں موجود حریت پسندوں کے بہت سے گروپ کر رہے تھے۔ ان کے کارناموں سے ایک عالم باخبر تھا۔ پاکستان کے ٹی۔ایچ۔کیو میں ان کی جان نثاریوں کی رپورٹیں مرتب ہو رہی تھیں۔ ۵ ستمبر سے ۲۳ ستمبر تک انہوں نے دنیائے حریت کے وہ انمٹ باب نقش کر دیئے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔

اسی رات فائر بندی ہو گئی اور جیالوں کو جنہوں نے نتائج سے بے پروا ہو کر ہر قسم کی مدد سے بے نیاز انتہائی سنگین حالات اور منافقانہ ماحول میں جنگ جاری رکھی ہوئی تھی اور جنہوں نے اب اپنے قدم خاصے مضبوط کر لیے تھے، اچانک حکم ملا کہ اپنے مستقر پر واپس آ جائیں۔ انہوں نے یہ کامیابیاں یونہی حاصل نہیں کی تھیں۔ بمشکل گنتی کے چند خوش قسمت ہی زندہ لوٹے تھے۔ ان کے تین چوتھائی ساتھی شہید ہو چکے تھے۔ خود شیرو اور اس کے ساتھیوں کا یہ عالم تھا کہ کیپٹن اشرف خان اور ایک نائیک زندہ بچے تھے۔ یہ نائیک بھی زخمی تھا۔ گولی اس کے بازو سے گزر گئی تھی۔ باقی تمام ساتھی مختلف مہموں میں اپنی جانوں کا نذرانہ کشمیر کی آزادی کو پیش کر چکے تھے۔

مقبوضہ کشمیر سے جو لوگ اس جہاد آزادی میں حصہ لے رہے تھے، ان کے متعلق سب کو علم تھا کہ وہ تو زندہ درگور ہو کر رہ گئے تھے۔۔۔۔ پاکستانی انہیں دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جا رہے تھے اور دشمن ان کے ساتھ جو سلوک کرنے والا تھا، اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

☆○☆

جنگ بندی کے ساتھ ہی دشمن نے اپنی انتقامی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ سری نگر میں پاکستانی کمانڈوز کی جائے پناہ "بٹ مالو" شروع ہی سے ان کی نظروں میں کھٹک رہی تھی۔ ۲۳ ستمبر کی رات کو بھارت کی ۲ ہٹالین فوج نے اس سارے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے کر [illegible] لوگوں کو وارننگ دی کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر یہاں چھپے ہوئے تمام پاکستانی کمانڈوز [illegible] کے حوالے کر دیں ورنہ اس سارے علاقے کو تس [illegible] جائے گا۔

آفرین ہے خدا کے ان پراسرار بندوں پر کہ انہوں نے کسی بھی پاکستانی کمانڈو کو گرفتار کرنے سے انکار کر دیا اور پاکستانی کمانڈوز کی مدد سے ۔۔۔ گھنٹوں میں مورچے تعمیر کر لیے۔ مقررہ مدت گزر جانے پر بھارتی فوج حرکت میں آ گئی۔ اس نے اس علاقے پر گولہ باری شروع کر دی۔

محصور سرفروش کی جان سے گئے، لیکن یہاں بتائے بغیر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر بھارتی سورماؤں نے بٹ مالو کو اس کے ہزاروں باسیوں سمیت، جن میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی، راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ انہوں نے کسی ایک شہری کو بھی زندہ بچ کر نکل جانے کا موقع نہ دیا اور ہر طرف بھرکے خون کی ہولی کھیلنے کے بعد اس علاقے پر بلڈوزر چلا کر زمین ہموار کر دیا۔

بربریت کا یہ مظاہرہ دنیا بھر کے پریس نے دیکھا اور اسے تصویروں سمیت شائع کیا، لیکن عالمی ضمیر نہ جاگا۔ سوائے آہ و بکا کے بے بس آوازوں کے اور کوئی آواز ان کے حق میں بلند نہ ہوئی۔

شیرو اور اس کے ساتھیوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس رات "بٹ مالو" میں ۔۔۔ نہیں تھے۔

☆○☆

شیرو کو سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ وہ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے ہر معرکے میں ان کا ساتھی رہا تھا۔ اس مرتبہ جس تیزرفتاری کے ساتھ سارے کشمیر میں جنگ کا شعلہ بھڑکا تھا، اسے یقین ہونے لگا تھا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اس کے کشمیر کو غلام نہیں رکھ سکتی، لیکن اس مرتبہ اس کے خواب کی تعبیر اتنی بھیانک تھی کہ اس کے لوسان خطا ہونے لگے۔ وحشیوں اور دیوانوں کی طرح وہ اپنی بوٹیاں نوچ کر رہ گیا۔

۔۔۔۔ اس نے کئی بار شرفو کا گریبان پکڑ کر اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں اسے دوبارہ کشمیر لے کر آیا تھا؟

شرفو کے پاس اس کے ان جلتے ہوئے اور جلا دینے والے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ خود وہ دیوانوں کی طرح فضاؤں میں بے مقصد گھورتا رہتا اور شیرو کے بضد ہونے پر صرف ایک ہی بات کہہ دیتا۔ "شیرو! ہم سپاہی ہیں۔ ہمارا کام سوچنا نہیں، عمل کرنا ہے۔ جیسا حکم ہمیں ملے گا ویسی ہی تعمیل ہم کریں گے۔"

"لیکن میں تو انسان ہوں۔ میرے احساسات تو زندہ ہیں۔ پتھر کا بت نہیں ہوں میں۔"

HBC

[illegible] شروع [illegible]

[illegible] تھکاوٹوں، دہشتوں اور جان ہاروں کا [illegible] کمانڈوز کی [illegible]
وہ لوگ [illegible] کیسی بھیانک [illegible] کر رہے [illegible]
انسان [illegible] تھے۔ [illegible] تیسرا ساتھی [illegible] کہا تھا۔ شروع [illegible]
اکا تھا کہ [illegible] اس [illegible] کی [illegible] کرتا [illegible]
اس کی جان [illegible] کر [illegible] گا۔ اس [illegible] [illegible] کی [illegible] تک اگر [illegible] کپتان اشرف
خان۔

شروع کے [illegible] ہفتہ [illegible] پہلے [illegible] زہراں [illegible] نہیں [illegible] تھا۔ اس [illegible]
کام والوں کے لیے رکھا [illegible] تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زہراں کے سامنے
کیا منہ لے کر جائے گا اور کپتان اشرف خان یہ سننے سے قاصر تھا کہ آخر شیرو اس کی دیوی
سے ملنا کیوں نہیں چاہتا؟

وہ شیرو کی توجہ بٹانے کے لیے اکثر اس سے اپنے دونوں بیٹوں خالد اور طارق کی باتیں
کرنے لگتا۔ اس نے شیرو کو پوچھ سے چھڑنے سے اب تک کے ایک ایک لمحے کی کہانی سنا
دی تھی۔ اپنے اور زہراں کے متعلق ایک ایک بات اس نے شیرو کو بتا دی تھی۔ صرف شیرو
کے زندہ ہونے کی اطلاع پر زہراں کے ردِ عمل سے اس نے شیرو کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ
چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ شیرو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

☆○☆

بارہ مولا تک کا سفر عافیت سے طے ہو گیا۔ اب انہیں "پل صراط" عبور کرنا تھا۔
بھارتی سورما جانتے تھے کہ پاکستانی کمانڈوز کو اب واپس جانا ہے۔ انہوں نے تمام
سرحدی علاقے پر پھیل کر ان کے "استقبال" کی تیاریاں مکمل کر رکھی تھیں۔
سدھائے ہوئے کتوں کی زنجیریں ہاتھوں میں تھامے وہ ان "مکس بیمیوں" (کمانڈوز)
کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ حشرات الارض کی طرح پہاڑی نالوں کے پیچ پیچ پر
رینگ رہے تھے۔ خون آشام بھیڑیوں کی طرح اپنی سرخ اور لمبی زبانیں باہر لٹکائے ان
"بد قسمت نالیوں" کے منتظر تھے جو لاکھ کوشش کے باوجود "مرتبہ شہادت" سے سرفراز نہ
ہو سکے تھے۔

انہیں مسلسل سفر کرتے آج تیسرا دن تھا۔ شام کے وقت ایک سرحدی علاقے میں
ایک پہاڑی کی کھوہ میں چھپے ہوئے تھے۔

[illegible] ہوا [illegible] تھا [illegible] شروع نے [illegible] کا [illegible]
[illegible] اس کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

"[illegible]" [illegible] نے [illegible] فوجیوں کی طرح [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
اس [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[

HBC

شروع ہو گئی۔ انہوں نے اپنے لمبے کوٹ پہن لیے اور کہرہ کے منہ پر آن کھڑے ہوئے تھے۔

"چلنا چاہیے۔" شیرو نے زور دے کر یہ لفظ ادا کیے تھے۔ اس کے حلق میں کوئی پھانس سی اٹک گئی تھی اور اسے کئی مرتبہ اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

"جوانو! اگر دشمن سے مقابلہ ہوا تو میں تمہیں کور دوں گا۔ تم لوگ پیچھے نکل جانا۔ میرا انتظار پندرہ منٹ کرنا ہے۔ اس کے بعد خود سرحد پار کرنے کی کوشش کرنا۔ گرفتار ہو جاؤ تو دشمن کو اپنے نام اور رینک کے سوا اور کچھ نہ بتانا۔" کیپٹن اشرف فارمیشن میں آ گیا۔

شیرو اسٹین گن تھامے ان دونوں کے آگے چل رہا تھا۔ درمیان میں انہوں نے زخمی نائیک کو کور دیا ہوا تھا جس نے اپنا زخمی بازو گلے میں بندھے گن سلنگ میں لٹکا رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ اپنے پوچ کے بالکل اوپر رکھا ہوا تھا تاکہ کسی بھی لمحے وہ ہینڈ گرنیڈ نکال کر پھینک سکے۔

اپنی دانست میں شیرو انہیں بہت محفوظ راستے پر لے جا رہا تھا۔ رات گہری ہونے لگی تھی۔ بارش کا سلسلہ اب تھم چکا تھا۔ آسمان کی سیاہیوں میں سے ڈرتے ڈرتے کبھی کبھی چاند ان کی طرف جھانک لیتا' لیکن پھر اپنا منہ اندھیروں میں چھپا کر روپوش ہو جاتا۔ اچانک ہی جیسے اس اندھیرے میں سورج نکل آیا۔ یکدم آٹھ دس زبردست دھماکے ہوئے اور فضاؤں میں آگ لگ گئی—— دشمن نے اچانک روشنی راؤنڈ فائر کر کے ماحول کو ننگا کر دیا تھا۔

"کم آن—— دس وے۔" کیپٹن اشرف خان نے دونوں کو اپنے دائیں ہاتھ میں گن تھامے ہوئے بائیں ہاتھ سے ایک ٹیکری کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بندر کی سی پھرتی سے ایک دوسرے کے تعاقب میں اس کے پیچھے ہو گئے۔ "تم دونوں آہستہ آہستہ پیچھے نکلو۔" شرفو نے سرگوشی کی۔

"سر!" اس کے نائیک نے سسکاری لی۔

"مود!" اشرف خان کی سرگوشی میں تنبیہہ بھی موجود تھی۔

"شیرو!!" شیرو نے کچھ کہنا چاہا۔

"شیرو خدا کے لیے! وقت کم ہے..... بحث نہ کرنا۔"

"ہینڈز اپ! تم لوگ ہر طرف سے گھیرے میں آ چکے ہو۔" کسی نے ماؤتھ ا۔ پہلی فائر سے کہا۔

"نکلو۔" شرفو کے منہ سے بمشکل نکلا۔

دونوں پاس تھراست اس کی آڑ میں پیچھے ہوتے چلے گئے۔ اس سے [illegible]
سن چلنے کی آواز سنائی دی۔ گولیاں اس لکیری سے [illegible]
رہی تھیں۔

دونوں بگٹٹ بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ ایک قدرے محفوظ [illegible]
ٹیکری کے پیچھے وہ رک گئے تھے۔ اب فائرنگ کی آوازوں میں شرفو کی [illegible]
ف" بھی سنائی دینے لگی تھی۔ پھر کچھ وقفے کے بعد انہوں نے [illegible]
چند گرنیڈ پھینکے تھے۔

دونوں بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ پورے [illegible]

——دس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد انہیں ایک سایہ اپنی طرف زمین سے رینگ رینگ کر آتا دکھائی دیا۔ شیرو نے دیوانہ وار اپنی جگہ سے اٹھ کر اور سائے سے قریب جا کر۔

"شرفو..... خیریت تو ہے.....؟" اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"کچھ نہیں..... کچھ نہیں۔" کہتے ہوئے شرفو نے اٹھ کر کھڑے ہونا چاہا لیکن چند انچ اوپر اٹھنے کے بعد ہی وہ منہ کے بل آگے کو جا گرا۔ شیرو نے تتلی کی سی پھرتی سے جھک کر اسے اٹھایا اور قریباً گھسیٹتا ہوا اسے اسی ٹیکری کے پیچھے لے آیا۔

نائیک اپنے کیپٹن صاحب کی حالت پر تڑپ اٹھا۔ شرفو کو کوئی کاری زخم لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوبارہ فائرنگ شروع ہو گئی۔

"آؤ نکلیں یہاں سے۔" شیرو نے نائیک کو مخاطب کیا اور شرفو کے "نہ نہ" کرنے کے باوجود اسے اپنے کندھے پر ڈال کر جھاڑیوں اور جنگلی گھاس کے اس سلسلے میں جا گھسا جس کا اختتام سرحد پر ہوتا تھا۔

ایک قدرے محفوظ جگہ پہنچ کر اس نے شرفو کو زمین پر لٹا دیا۔ اس کے کوٹ کے بٹن کھولے تو سینے پر لہو کا دریا تیرتا دکھائی دیا۔

"سر——! سر——!" اس کا نائیک سسک پڑا۔

"فیلڈ پٹی نکالو۔" شیرو نے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے نائیک سے کہا۔

اس نے شرفو کی قمیص سامنے سے پھاڑ ڈالی۔ اس کے سینے پر ایک گہرا گھاؤ شیرو کا منہ چڑا رہا تھا۔ بڑے حوصلے سے کام لے کر اس نے شرفو اور نائیک دونوں کی فیلڈ پٹی اس کے

زخم پر رکھ کر باندھ دی۔ نائیک بے بسی' جوش' غصے اور دکھ کے عالم میں اپنا سر اب تک کئی مرتبہ جھٹک چکا تھا۔

شرفو نے ابھی تک منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے جگری یار کی طرف دیکھتا رہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ بولا۔ "شیرو بھائی! اس مرتبہ میں تمہیں نہیں بچنے دوں گا۔" اس نے رک رک کر کہا اور تھوڑا سا کھانسا—— "پانی.....!" اس کے منہ سے نکلا۔

نائیک نے اپنی بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ شرفو نے دو تین گھونٹ پی کر بوتل پرے ہٹانے کا اشارہ کر دیا۔ گولیاں ان کے گرداگرد انگاروں کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ شیرو نے دوبارہ اسے اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ بمشکل چند گز چلنے کے بعد ہی اس نے شرفو کی کراہ سنی۔

"مجھے ذرا لٹا دو۔" اس نے بڑی مشکل سے شیرو تک اپنی آواز پہنچائی۔

شیرو نے اسے ایک قدرے ہموار جگہ پر لٹا دیا۔ شیرو نے محسوس کیا کہ اس کا نائیک رونے لگا تھا۔ وہ ان سے ذرا پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"شیرو! میرے بھائی! تم نے..... ایک رون..... تین امانتیں مجھے سونپی تھیں..... افسوس میں تمہاری ماں اور چاچا کو نہ بچا سکا مگر..... آج میں..... تین امانتیں تمہیں سونپتا ہوں..... شیرو! پانی۔"

پتھر کے انسان نے بوتل کھول کر اس کے منہ میں دو گھونٹ ٹپکا دیئے۔

"شیرو——!" شرفو نے درد سے کراہتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "میں نے تم سے بہت باتیں کرنی تھیں۔ شاید ہماری قسمت میں اتنا ہی ملاپ لکھا تھا..... شیرو..... ۱۹۴۷ء میں ہم اکیلے تھے' منتشر ہو کر لڑ رہے تھے۔ تب ہماری کوئی پہچان نہیں تھی—— مگر آج ہماری ایک پہچان ہے۔ ہم پاکستانی فوج کے سپاہی ہیں—— ہمارا گھر پاکستان ہے—— یہی ہے وہ گھر جہاں ہمیں امن میسر آ سکتی ہے۔ شیرو میرے بھائی! کشمیر کی پہاڑیوں سے نکلنے والے تمام دریاؤں اور ندی نالوں نے بالآخر یہیں اکٹھے ہونا ہے—— میری سانسیں ٹوٹ رہی ہیں شیرو..... وقت مختصر ہوتا جا رہا ہے..... خدا کے لیے یہ کبھی نہ بھولنا۔ اگر یہ آخری حصار بھی ٹوٹ گیا تو روئے زمین پر ہمیں کوئی پناہ گاہ میسر نہیں آئے گی۔ شیرو! میری لاش کو اسی مقدس سرزمین پر پہنچانا جس کے لیے ہمارے اجداد اور ہم خون

بہانے آئے ہیں—— مجھے—— مجھے—— پاکستان چلا دو پاکستان—— شیرو——
اللہ..... پاکستان کو اپنی امان میں رکھنا.....!"
اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

اس کے بعد اس کے لب تو ہلتے رہے' مگر ان سے آواز نہ ابھری۔ شاید وہ قرآنی آیات پڑھ رہا تھا' پھر اس کے لب ساکت ہو گئے۔

نائیک بچوں کی طرح سسکیاں لیتا ہوا اس پر جھک گیا۔ شیرو نے ایک لمحے کے لیے اس کی ویران آنکھوں میں جھانکا' پھر کانپتی انگلیوں سے اس کے پپوٹے بند کر دیئے۔ شدت ضبط سے اس نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

فائرنگ اب اور تیز ہونے لگی تھی۔ اس نے سسکیاں لیتے نائیک کو کچھ کہنا چاہا لیکن اس کا گلا رندھ گیا۔ اپنی ساری توانائیاں سمیٹ کر اس نے شرفو کو دوبارہ اپنے کندھے پر لادا اور چل دیا۔

اسے اپنے گردا گرد والی فائرنگ کی آوازیں سنائی ہی نہیں دے رہی تھیں۔ بس وہ چپ چاپ چلتا رہا—— چلتا رہا۔ اس کے پیچھے ابھی تک نائیک کی کوئی نہ کوئی ہچکی ضرور سنائی دیتی تھی لیکن وہ ماحول سے بالکل بے نیاز چلتا رہا۔ کئی مرتبہ چلتے چلتے نائیک اس کے سامنے آ کر رک جاتا۔ "ہم کو بتاؤ جوان ہم ادھر کیا بولے کہ ہمارا صاحب بھی نہیں رہا۔ ہمارا کپتان صاحب بھی ہم سے روٹھ گیا۔ سب اپنا ڈیوٹی پورا کر گیا۔ ہم کو بولو جوان۔ ہمارا ڈیوٹی کب پورا ہو گا۔ ادھر اپنا کمپنی والوں کو کیا بولے گا—— کیا بتائے گا۔ ہم کو بتاؤ جوان۔" بٹ لو" کے شہیدوں کی روحیں ہمیں کب چین کا نیند سونے دیں گے۔ ہم کو بتاؤ جوان—— ہم کو بولو!"

اور—— جانے وہ کیا کیا کہتا رہا۔

شیرو ایک لمحے کے لیے رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتا' پھر کسی سحر زدہ معمول کی طرح چلنے لگتا۔ فائرنگ کی آوازیں اب کم ہوتے ہوتے دم توڑنے لگی تھیں' شاید انہوں نے "حساس علاقہ" پار کر لیا تھا۔

نائیک اب اس کی منتیں کر رہا تھا کہ وہ اپنا "کپتان صاحب" کی لاش خود اٹھا کر لے جائے گا' لیکن شیرو تو جیسے بہرہ ہو چکا تھا۔

سرحد سے بمشکل چند گز دور فائرنگ پھر اچانک تیز ہو گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر ان کی

آنکھیں پتا چوند ہو گئیں۔ "ہاٹ۔۔۔۔ ہاٹ!" کی للکاریں کو نہیں' لیکن ۔ ۔ ۔ وہ چلتا رہا'
کسی سحر زدہ معمول کی طرح۔۔۔۔ اپنی پناہ گاہ کی طرف بڑھتا رہا۔
اسے اپنے گرد و اگرد خائیں خائیں کرتی گولیوں کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی
تھیں۔ اس کے محسوسات کو تو شروع کی موت کے ساتھ ہی موت آ گئی تھی۔ بس اچانک ہی
اسے محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگ میں انگارہ سا دھنس گیا ہو۔
لیکن۔۔۔۔ وہ رکنے کو تیار نہ تھا۔
اس کے پیچھے چلنے والا نائیک پاگلوں کی طرح اپنے پانچ سے ونڈ کریز اکٹھا کر
پھینک رہا تھا۔ گرنیڈ پھٹنے سے زیادہ اونچی آواز میں اس کی دھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ
دشمن کو کبھی جنونیوں کی طرح گالیاں دینے لگتا' کبھی زور زور سے نعرے مارنے لگتا۔
شیرو کے لیے اب قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگ میں گھس آنے والی آگ اب
اس کے خون کی گردش کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی سارے جسم میں گھوم رہی تھی' پھر
اچانک اس کے سامنے سے فائرنگ ہونے لگی۔ شاید کسی پاکستانی او۔پی نے اسے گھیرے میں
دیکھ لیا تھا اور اب پاکستانی جوان اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے کورنگ فائر دے رہے تھے۔
۔۔۔۔ وہ اچانک ہی لڑکھڑایا اور پہلو کے بل گر پڑا لیکن گرتے گرتے بھی اس نے یہ
احتیاط برتی تھی کہ اس کے کیپٹن اشرف خان کی لاش کو کوئی گزند نہ پہنچے۔
اور پھر کچھ سائے پاکستانی سرحد سے اسے اپنی طرف بھاگتے نظر آئے۔ شاید وہ اپنے ان
ساتھیوں کو بچانے کے لیے جہنم میں کود گئے تھے۔
تمام احتیاطوں پر لعنت بھیج کر۔۔۔۔!
اس نے ایک سائے کو خود پر جھکتے دیکھا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔
اس کی سماعت سے آخری آواز اسی نائیک کی ٹکرائی تھی۔ "چھوڑ دو مجھے۔۔۔۔ میں
ان کافروں کو مار ڈالوں گا۔ میرے صاحب کو مار ڈالا۔ میرا سب سنگی ادھر سری نگر میں رہ
گیا۔۔۔۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔۔۔۔ چھوڑ دو مجھے۔۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔۔ یا علیؓ۔۔۔۔
اللہ اکبر۔۔۔۔ یا علیؓ۔" اس کے ساتھ ہی شیرو کی تمام حسیات کو موت آ گئی۔ پھر اسے
ہوش ایک فوجی ہسپتال میں آیا تھا۔
مظفر آباد کے اس قصبے میں جب شیرو نے ویگن سے نیچے قدم رکھا تو اس وقت شام اس
بستی میں اترنے لگی تھی۔ اسے ہسپتال سے تقریباً اک ماہ بعد صحت یابی پر رخصت ملی تھی۔

وہاں موجود ہر فوجی کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ کیپٹن اشرف خان شہید کا [illegible]
دوہرایا جا رہا تھا۔
ملک کی گراں قدر خدمات پر شیرو کے لیے وہ آنکھ میں احترام سے [illegible]
وہ لوگ اس کی ہر طرح خدمت کے لیے موجود تھے' لیکن شیرو نے [illegible]
کہا۔ بس کبھی کبھی کوئی بڑا افسر اس سے ہسپتال کا حال پوچھ لیتا۔ پھر [illegible]
پچھلے ایک ماہ کی فارروالی للچانے لگتا اور وہ سارا دن بستر پر لیٹا سوچتا رہتا۔ اسے
تمام پرانے رفقاء اس سے ملنے آ چکے تھے۔ فوجی ہسپتال سے [illegible]
لیے تیار کھڑی تھی' لیکن اس نے ان لوگوں کی پیش کش قبول نہ کی۔
ویگن سے اتر کر وہ پیدل ایک طرف چلنے لگا۔ سورج اس کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔
اس نے اب سرخ آگ کے گولے کا روپ دھار کر ماحول کو لہو رنگ بنا دیا تھا۔
سڑک کے دونوں کناروں پر لگے درختوں کی سرگوشیاں بڑی واضح اسے سنائی دے رہی تھیں۔
آہستہ آہستہ رینگنے والی ہوا نے موسم کی خنکی اور ٹھنڈک میں خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ گرم
چادر اس کے کندھے پر دھری تھی' لیکن اس نے اسے کندھے پر [illegible]
ٹھنڈی ہوا میں وہ خاصا سکون محسوس کر رہا تھا۔
آبادی کے ایک کونے میں بنے مکان کی دہلیز سے لگی زہراں اور یوزمے نورولی کی بیوی
نے اکٹھے ہی اس سمت دیکھا تھا۔ "یہ تو شیرو ہے۔۔۔۔ شیرو ہے زہراں۔۔۔۔ میں بچوں کو
بتاتی ہوں۔ کہہ کر وہ بچوں کو آوازیں دیتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ شیرو سے ہسپتال
میں مل چکی تھی۔
مکان کے دروازے کے باہر دو بچے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات لیے "اجنبی
چاچا" کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر شیرو رک گیا۔ اس نے زمین پر بیٹھتے
ہوئے اپنی دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ دونوں بچوں نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کی
طرف دیکھا۔ پہلے وہ جھجکے' لیکن پھر دونوں ایک ساتھ ہی دوڑتے ہوئے اس کی پھیلی ہوئی
بانہوں میں سمٹ گئے۔
باپ کی وفات کے بعد سے وہ لاشعوری طور پر جو ایک خلا سا محسوس کرنے لگے تھے'
ان بانہوں میں سمٹ کر انہیں اپنا ادھورا پن مکمل ہوتا محسوس ہوا۔ جیسے وہ کسی پناہ گاہ میں
پہنچ چکے ہوں۔ شیرو کی چھاتی سے چمٹے ہوئے دونوں بچے نہ دیکھ سکے تھے کہ اس کی آنکھیں

بھیگ چلی تھیں۔ بڑے نامحسوس طریقے سے اس نے دونوں ہاتھوں کو الٹا کر کے بچوں کو سینے سے چمٹائے اپنی آنکھیں صاف کر لیں۔

"تم بالآخر آ ہی گئے شیرو۔" دروازے پر کھڑی زہراں آہستہ سے بڑبڑائی اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار گرم گرم آنسوؤں کے قطرے اس کے گالوں پر بہنے لگے۔

ساتھ والے مکان میں چلتے ریڈیو کی آواز خاصی بلند تھی۔ بہت سے لوگ کورس کی شکل میں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رہے تھے۔

وطن ہمارا آزاد کشمیر..... وطن ہمارا آزاد کشمیر۔

ستمبر ۸۴' لاہور۔

کمانڈو
میں ایک جادوس تھا
وادی لہو رنگ
چناروں کے آنسو
کہساروں کی آگ
بھٹکا ہُوا راہی
وطن کی مٹی گواہ رہنا
لہو کا سفر